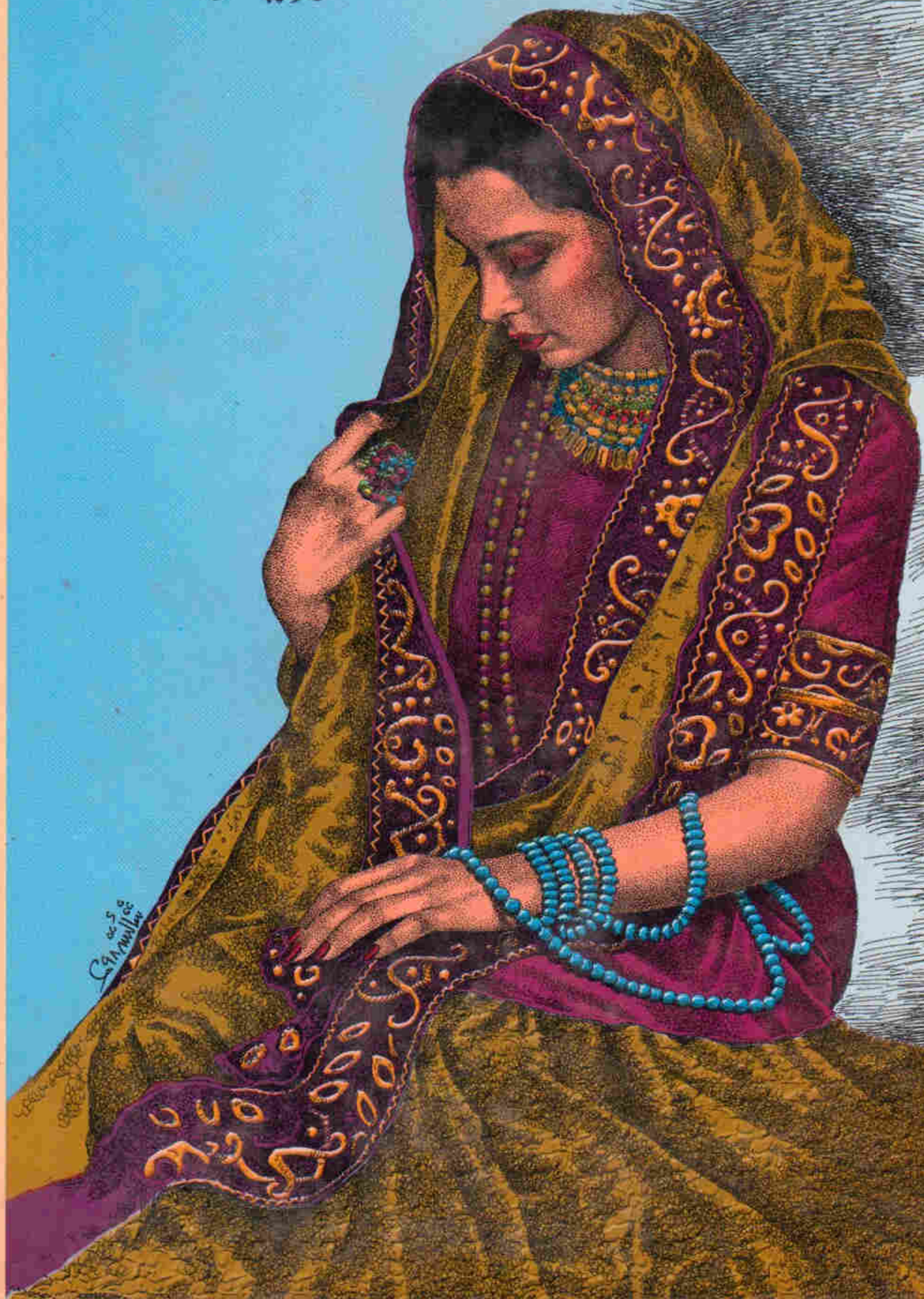
خواب دریچے

سعدیہ امل کاشف



جملہ حقوق محفوظ ہیں

بارِاوّل 2006ء

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... پرنٹ لائن

کمپوزنگ............ ایس ایم عامر

سول ایجنٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی

انتساب

جس کی آمد نے مجھے ہر شے کی عظمت سے آگہی دی......

جس کی آمد نے مجھ پر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا بھید کھولا......

جس کی آمد نے میرے قدموں میں جنت کا احساس- یا......

جس کی آمد کے بعد میں خودکو بہت اجلی بہت اچھی لگی۔

میرے ننھے عیسیٰ

محمد اریب اشعر

کے نام

''شہرِ وفا شعاراں''

توپھر یوں ہوا......
بستی بستی کوچہ کوچہ نگری نگری
تن تنہا جو پھری وفا
رسوائی کو اپنی ذات کا زخم بنایا
پتھر سی چوٹوں سے اس نے اپنا ہر انگ
اور دل جھلسایا
قسمت کو بنجر سا بنایا
تنہا آگ میں کود چکی تھی
ساری کشتیاں چھوڑ آئی تھی
اس کی خاطر اس دنیا میں
سر ڈھکنے کی جگہ نہیں تھی
ہر لہجے کو پتھر پایا۔ ہر چہرے کو حیراں پایا
تنہا رات تھی، طوفاں تھے اور دل میں آگ سی جھلس رہی تھی
پھر اک دن، اس کو اک شہر ملا
جسے وفا شعاروں کی بستی کہتے تھے
سب چہرے تھے اپنے اپنے، سب لہجے چارہ گر تھے
عیسیٰ نفس تھے، شبنم لمس تھے، چاندنی سے جادو گر تھے
وفا نے اس بستی کو اپنا مسکن ٹھہرایا
دنیا بھر کو ٹھکرایا
اسی شہر کے لوگوں کے کچھ قصے ہیں
پہلے میرے اپنے تھے
میری تنہائی کے ساتھی تھے
آج سبھی کی تنہائی کے حصے ہیں......!

فہرست



خواب دریچے

خبر تو لاتے رہے چاند کی ستاروں کی
مگر زمین پہ ہیں ہم سے بے خبر اب تک
پس حجاب ہے کیوں حسن معتبر اب تک
کسی کو ڈھونڈ رہی ہے مری نظر اب تک

وہ حویلی کے وسیع عریض علاقے میں داخل ہو چکا تھا دس کنال پر پھیلا ہوا حویلی کا یہ حصہ حویلی کے رہنے والوں یعنی مالکوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس کے علاوہ اس طرح کے کئی چھوٹے بڑے حصے تھے۔ نوکروں کی رہائش گاہیں، مہمان خانے، فارم ہاؤس، گاڑیوں کے کھڑے کرنے کی جگہیں۔ یہ تو فقط اس تمام حویلی کا اک حصہ تھا۔ ایک ضروری مگر مختصر حصہ لیکن ہو سکتا ہے یہ حصہ اتنا بھی مختصر نہ ہو جتنا نظر آ رہا ہے۔ اس طرح کی حویلیوں میں کئی منزلیں اور تہہ خانے ہوتے ہیں۔ دل ہی دل میں اس نے اپنے

اس خیال کی تصدیق کی اور اپنا بیگ تھامے آگے ہی آگے چلتا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا پالا کسی نہ کسی گارڈ سے پڑ جاتا۔ اس سے پوچھا جاتا کہ وہ کون ہے اور کیوں منہ اٹھائے اندر چلا جا رہا ہے اور وہ نئے سرے سے ہر گارڈ کی تسلی کے لئے دہراتا کہ وہ چھوٹے وڈیرے آفتاب شاہ کا دوست نقاش حسن ہے۔ گارڈ فون پر اندر کہیں رابطہ قائم کرتا اور اسے چھوڑ دیتا۔ دو تین گارڈ نے پوچھ گچھ کی پھر اسے آگے کسی نے نہیں روکا۔ شاید اس کی شناخت کر لی گئی تھی۔

وہ آفتاب شاہ کا کلاس فیلو اور روم میٹ تھا۔ یونیورسٹی میں وہ دونوں ساتھ ہی پڑھتے اور اکٹھے رہتے تھے۔ یونیورسٹی ختم ہونے کے بعد آفتاب اپنے والد کے کہنے پر حویلی آ گیا اور اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرنے لگا اور نقاش حسن نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور منیجر ایڈمن جاب کر لی تھی۔ لیکن چند ماہ جاب کر لینے کے بعد اس نے مزید پڑھنے کا سوچا۔ یوں بھی جاب اس نے محض تجربہ کے لئے کی تھی۔ پیسے کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کا باپ بزنس مین تھا اور اسے ہر ماہ اس کی ضرورت سے زیادہ پیسہ مہیا کرتا تھا لہٰذا اسے کسی نوکری کی شدید ضرورت نہیں تھی۔ ابھی آفتاب کی دعوت پر وہ جھنگ کے علاقے جھوک ضامن آیا تھا اور کچھ دن رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

حویلی کے صدر دروازے کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے آفتاب کو اپنا منتظر پایا جو محبت بھری آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ ویلکم کر رہا تھا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے تھے۔ پھر وہ اسے وسیع و عریض لاؤنج سے گزارتا ہوا اوپر اپنے کمرے کے ساتھ ہی بنے بیڈ روم میں لے آیا۔ یہ بیڈ روم گیسٹ روم تو نہ تھا لیکن فی الحال اسے گیسٹ روم بنا دیا تھا۔ ایک ڈبل بیڈ' اس کے اوپر لگی ایک خوبصورت پینٹنگ' ایک رائٹنگ ٹیبل' اس پر لگے شیلف میں رکھی کئی کتابیں۔ گلابی کارپٹ اور گلابی لائنوں والے پردے۔ پہلی نظر میں دیکھ کے نقاش کو یہی لگا کہ جیسے یہ کمرہ کسی لڑکی کا ہو۔ آفتاب نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لئے مہمان خانے کی جگہ یہاں گھر میں ٹھہرایا تھا تا کہ وہ اس کے پاس رہ سکے۔

''نقاش تم فریش ہو جاؤ۔ میں لنچ کا پتہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر آفتاب چلا گیا اور وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ سفید تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتا وہ باتھ روم سے باہر آیا تو اس کی نظر بیڈ کے اوپر لگی ایک پینٹنگ پر پڑی۔ گھنے اندھیرے جنگل کے لمبے درخت' خود رو جھاڑیاں اور ان میں پھنسی ہوئی ایک خوبصورت ہرنی۔ وہ کتنی دیر محویت سے اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس میں کچھ تو ایسا تھا جو قابل غور تھا۔

کچھ دیر بعد آفتاب اندر آ گیا اور اسے کھانے کے لئے نیچے ڈائننگ روم میں لے آیا جہاں آفتاب کے والد سکندر شاہ بھی ہمراہ تھے۔ انتہائی روایتی انداز میں لنچ ہوا اور پھر آرام کے لئے اوپر چلا آیا۔

آرام دہ لباس زیب تن کیا اور باقی بیگ میں بند کپڑے نکالنے لگا۔ دیوار کے ساتھ کونے میں بیڈ کی ہم رنگ الماری تھی۔ وہ اپنے کپڑے اٹھا کے اس کی جانب بڑھا۔ اس کا پٹ کھولا۔ سامنے کئی خالی ہینگر

لٹکے تھے اور ایک ہینگر میں ایک سات رنگوں میں رنگی ہوئی چنری جھول رہی تھیں۔ نیچے کے خانوں میں ڈھیر ساری کتابیں تھیں۔ اس کے دل میں تجسس جاگا۔ وہ کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ تمام کتابیں میڈیکل سے متعلق تھیں اور پورے تین سال کا کورس تھا۔ ہر کتاب کے اوپر ضحیٰ فاطمہ کا نام درج تھا۔ ان کتابوں کو کافی حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ انہی کتابوں کے بیچ میں سے ایک سرخ جلد والی ڈائری اس کی جھولی میں آ کے گری۔ اس نے وہ ڈائری اٹھائی۔ کچھ دیر سوچا اور پھر اسے اٹھا کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یہ ڈائری بھی یقیناً ضحیٰ فاطمہ کی ہی تھی جہاں کئی صفحات چھوڑ کر تحریر درج تھی۔ اس نے تحریر پڑھنا شروع کی۔

''میرے دل میں' آنکھوں میں' زندگی میں خوابوں کے سر اٹھانے کی کوئی جگہ نہیں۔ میری عمر کی تمام لڑکیاں بے شک خواب دیکھتی ہوں مگر مجھے چاہ کر یا نہ چاہ کر بھی اپنے آپ کو ان سے دور رکھنا ہے۔ مجھے اس حویلی میں رہ کے' اس حویلی کے ہر ہر اصول کو نبھانا ہے چاہے اس کے لئے مجھے اپنے ہر خواب کی آنکھیں نوچنی پڑیں۔ اپنی ہر تمنا کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹنا پڑے۔ یہ حویلی میری زندگی کی شروعات بھی تھی اور یہی میرا اختتام ہے۔ میں اس کی سفاک چہار دیواری اور اس کے اندر بسنے والے بے رحم لوگوں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ کہیں بھی نہیں۔''

اس تحریر کے بعد کئی اوراق خالی تھے اور پھر ایک شعر اپنے ادھورے وجود پہ آنسو بہا رہا تھا۔

اس کی تنہائی ہی سہیلی تھی
ایک لڑکی تھی' اک حویلی تھی

''میں ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ آج کسی سے منسوب ہو گئی ہوں۔

آج کسی کی بیٹی سے کسی کی بیوی ہو گئی۔ چاہے زبردستی چاہے منظور ہو کے لیکن اس حقیقت کو کوئی بھی ٹھکرا نہیں سکتا۔ میرے بابا نے آج اس نمک کا بدلہ وڈیرے سکندر شاہ کو ادا کر دیا جو پچھلے تیئس سال سے ان کی حویلی میں کھاتے آئے ہیں۔ میری اعلیٰ تعلیم اور ڈاکٹر بننے کا خواب ضرور میرے بابا کا تھا لیکن اس کی تعبیر صرف سکندر شاہ کے ہاتھ میں تھی جسے اس نے پورا کر دکھایا اور پھر اس تکمیل کے بعد بدلے کی باری آئی اور آج بابا نے بدلہ اتار دیا۔ اپنی ڈاکٹر بیٹی کو ایک ان پڑھ' پاگل شخص کی بیوی بنا کر۔ میں نے آج اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا ہے کہ میں ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ اب کبھی پریکٹس نہیں کروں گی۔ اپنی تعلیم' اپنے شعور کو اسی حویلی کے کسی کونے میں تا عمر دبائے رکھوں گی۔ فقط اس حویلی کی بہو کہلاؤں گی۔''

اس تحریر کے بعد ایک خلا تھا۔ ایک تشنگی تھی۔ ایک بھید تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے الجھتا جا رہا تھا۔ اپنے بستر سے اٹھا' کرسٹل کے گلاس میں ٹھنڈا پانی انڈیلا۔ اسے اٹھائے کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کا پردہ اٹھایا۔ باہر تنہا آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ وہ اس عجیب لڑکی کی عجیب تحریر میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ وہ کون تھی' کس کی

بہو' کس کی بیٹی تھی' کہاں تھی' تھی بھی یا نہیں' وہ بے قرار سا ہو اٹھا تھا۔

★

آج حویلی کی بہو کو حکم ملا کہ وہ سرونٹ کوارٹر چھوڑ کر حویلی کے اندرونی حصے کی مکین بن جائے۔ آنسوؤں کے ساتھ ہنسی بھی آئی۔ یہ لڑکی حویلی کی بہو تو آج بنی ہے۔ اس سے قبل تو وہ کریم بخش جو سکندر شاہ کا خاص بندہ ہے یا پھر خاص نوکر۔ اس کریم بخش کی بیٹی تھی جس نے جنم بھی اسی سرونٹ کوارٹر میں پایا۔ یہیں بڑی ہوئی۔ چند سالوں کے لئے شہر پڑھنے ضرور گئی تھی مگر اپنی اوقات نہ بھولی تھی اور آج حویلی کی بہورانی بننے کے بعد یک لخت اتنی مہنگی ہوگئی کہ خود کریم بخش اسے عزت اور اتنی وقعت سے دیکھتا ہے تبھی تو کہہ رہا تھا۔

''بڑے سائیں کا کہنا ہے کہ نکاح کے بعد ضحیٰ حویلی کی بہو ہے اور یہ اس کے شایان شان نہیں کہ وہ سرونٹ کوارٹر سے رخصت ہو۔''

حویلی کی بہو کے اندر سے ایک بیٹی بولی۔ ''بابا! بیٹیاں باپ کے دروازے کو پار کر کے جاتی ہیں اپنے گھر اور تیرا گھر تو یہی سرونٹ کوارٹر ہے ناں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''بڑے سائیں کا حکم ہے بیٹی۔'' نمک پھر ابلنے لگے۔ جوش میں آ گیا۔ ''وہ مالک ہیں میری بچی!''

''نہیں بابا! وہ مالک نہیں' مالک کوئی اور ہے۔'' بیٹی کے جملے کے بعد کریم بخش کی آنکھوں میں وہ تاثرات ابھرے کہ بیٹی سے دیکھے نہ گئے اور چپ چاپ حویلی کی دہلیز پھلانگ آئی اور چکنے فرش پر چلتی ہوئی اپنے نئے نویلے کمرے میں آ گئی جس چکنے فرش پر بچپن میں اس کا بیٹھنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

''اس اجنبی کمرے میں ڈائری لکھتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی ہوں جو کہ فروسٹڈ گلاس کی کھڑکی میں اٹکا ہوا حیران کن آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہا ہے اور مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ آج تک اس نے مجھے سرونٹ کوارٹر کی اس بوسیدہ کھڑکی سے ہی دیکھا ہے۔''

کتنی پرسوز تھی وہ تحریر۔ اگر ان لفظوں میں اتنا درد تھا تو کتنا درد نہ ہوگا اس لڑکی کے دل میں۔ وہ پرنم آنکھوں سے اوراق پلٹتا گیا۔

''آج کریم بخش کی بیٹی کی رخصتی ہوگئی اور وہ حویلی کی بہورانی بن گئی۔ انتہائی قیمتی لباس میں انتہائی بے وقعت وجود تھا۔ چم چم کرتے سنہرے زیورات کے پنجرے میں ایک معمولی وجود قید تھا۔ زندگی نے کیسی کروٹ کھائی۔ کتنے سوال تھے جو ابھی بھی مٹھیوں میں بھنچے ہوئے ہیں۔

''بابا! اگر تم نے مجھے یہی سزا دینی تھی تو مجھے تعلیم دینے کا' مجھ میں شعور پیدا کرنے کا ظلم کیوں کیا؟ اگر میں ان پڑھ ہوتی تو شاید خوش ہوتی اتنے زیور ملنے پر' اتنی بڑی حویلی کی مالکن بننے پر مگر اب ایسا نہیں۔

سجی سنوری ضحیٰ فاطمہ اب ضحیٰ افتخار بن گئی ہے۔ افتخار کے کمرے میں بیٹھی ہے جسے یہ علم تک نہیں کہ شادی کیا ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو میری بربادی میں اس بے چارے کا بھی تو کوئی قصور نہیں۔ وہ پولیو کا مریض ہے۔ ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ سے معذور ہے۔ اس کی ذہنی سطح اب بھی پانچ چھ سال کے بچے کی طرح ہے مگر جو بھی ہے وہ میرا شوہر ہے۔ مجازی خدا' ایک بیوی' ایک انسان اور ایک ڈاکٹر کے ناتے اس کی خدمت کرنا' اس کی دیکھ بھال کرنا میرے فرض ہے۔ فرض اولین جسے آج سے مجھے نبھانا ہے۔ روز روز کی تنخواہوں والی نرسوں کی جگہ سکندر شاہ نے افتخار سکندر کے لئے ایک مستقل مفت نرس رکھ لی ہے۔ پڑھی لکھی' خوبرو اور باشعور۔''

ان لفظوں کو پڑھ کے نقاش حسن عجیب تکلیف سے گزر رہا تھا۔ کس درد کے عالم میں یہ لفظ لکھے گئے تھے۔ ایک نئی دنیا آباد تھی ان لفظوں میں جسے بوسیدہ کتابوں کے ڈھیر میں دفنا دیا گیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اسے کب نیند آ گئی تھی وہ جان ہی نہ پایا۔

★

وہ دن کا کوئی پہر تھا آفتاب شاہ دروازے پر دستک دیے جا رہا تھا۔ اس نے آنکھ کھولی۔ سورج کی شفاف روشنی کمرے کی کھڑکی سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ اٹھا۔ دبیز قالین پر پاؤں رکھے تو ایک نرمی کا احساس ہوا۔ دروازہ کھولا تو آفتاب شاہ سامنے کھڑا تھا۔

''یار تم تو بھی گدھے فروخت کر کے سوئے ہو۔''

''دیکھ لو! تمہارے آرام دہ بستر نے اٹھنے ہی نہیں دیا۔'' نقاش نے مسکرا کر کہا۔

اچھا چلو ناشتا کر لیں۔ میں تمہیں گھر کے کچھ خاص لوگوں سے ملواتا ہوں۔ بابا سائیں تو زمینوں پہ چلے گئے ہیں اس لئے گھر کے سبھی لوگ زیادہ ایزی ہیں۔''

آفتاب نے آنکھ دبا کے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

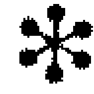
فریش ہو کر وہ آفتاب کے ہمراہ نیچے آ گیا جہاں ڈائننگ ٹیبل پر دو لڑکیاں اور دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ''ڈیر تو یہ ہیں ہمارے دوست نقاش حسن فرام لاہور اور نقاش! یہ ہیں میری دو بہنیں شاہین اور سجل اور یہ دو چھوٹے بھائی علی اور انوار۔ علی نے لندن میں شادی کی ہے۔ ان کی مسز لندن ہی میں ہیں۔ یہ چھٹیوں میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔'' آفتاب نے ان سبھی کا تعارف کروایا۔

''آفی بھائی! آپ کے دوست تو بہت ہینڈسم ہیں۔''

آفتاب کی بہن سجل نے انتہائی شوخ لہجے میں کہا۔ نقاش کو حیرت ہوئی۔ وہ ترشے ہوئے بالوں اور میک اپ زدہ آنکھوں والی اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''آپ کی شادی وادی تو نہیں ہوئی ناں۔'' یہ دوسری شاہین تھی۔ نقاش حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا جو تین بڑے بھائیوں کے سامنے

ایسی باتیں کر رہی تھیں۔
''برا مت ماننا یار ان دونوں کو مذاق کرنے کی عادت ہے۔'' آفتاب نے اسے سمجھایا۔
''جی! اور آپ سب کو ہماری بات مذاق سمجھنے کی عادت ہے۔'' شاہین نے کہا اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ہلکے پھلکے ماحول میں پر تکلف ناشتا ہوتا رہا۔ وہ ابھی متلاشی تھا حویلی کے اس فرد کا جو یہاں کا فرد نہیں قیدی تھا یعنی صحیٰ فاطمہ کا لیکن اس طرح کی کوئی شخصیت ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ آفتاب سے باتوں ہی باتوں میں پوچھ بیٹھا۔
''اور کون کون ہیں حویلی میں۔ میرا مطلب تمہاری مدر وغیرہ۔''
''یار امی جان کی تو کئی سال پہلے دل کے عارضے کے سبب ڈیتھ ہو گئی۔ پانچ سال قبل بڑے بھائی بھی روڈ ایکسیڈنٹ میں مارے گئے۔ ایک پھوپھو ہیں جو ان دنوں علاج کے لئے لندن میں ہیں۔ بس یہی ہیں ہم سارے لوگ۔'' آفتاب سلائس پر چکن اسپریڈ لگاتے ہوئے بولا اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔
''ہاں البتہ نوکروں کی فوج ظفر موج ہے۔ کئی کی تو شکلیں بھی یاد نہیں رہتیں۔ وردیوں میں سبھی ایک سے لگتے ہیں۔'' آفتاب نے فخریہ لہجے میں کہا وہ تکلفاً مسکرا دیا۔
''آج میں تمہیں اپنی زمینیں دکھاؤں گا اور کل ہم یہاں سے دور فارم ہاؤس پر چلیں گے جہاں پر گھڑ سواری بھی کریں گے۔'' آفتاب نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔
جب سبھی لوگ اپنے کاموں سے چلے گئے تو آفتاب اسے لے کر اپنی زمینوں کی سیر کے لئے نکلنے لگا۔ سفید کلف لگے کپڑوں میں آفتاب وڈیرہ لگ رہا تھا۔ نقاش نے اس کی خوب تعریف کی۔
''نقاش حسن! میری مانو تو تم بھی یہ جینز پینٹ تبدیل کر لو ورنہ تم زمینوں پر آنے والے ٹورسٹ کی طرح لگو گے۔'' آفتاب نے اسے مشورہ دیا۔
''مائی ڈیئر! میری ڈیل ڈول ایسی ہے کہ اگر میں اس طرح تیار ہوا تو تمہارے گاؤں کے لوگ تمہیں نہیں مجھے وڈیرہ سمجھیں گے۔'' نقاش نے کہا اور دونوں ہنس دیئے۔
''آؤ! میں تمہیں ایک خاص ہستی سے ملواؤں۔'' وہ اسے ساتھ لئے گھر کے کچن کی جانب آیا۔ نقاش کو حیرت ہوئی کہ وہ کچن میں اسے کسے ملوانے لے آیا ہے۔
''بھابی!'' اس نے کسی کو پکارا اور ایک عورت نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ ہلکے آف وائٹ پلین سوٹ میں ملبوس ایک سادہ سا سنجیدہ چہرہ' سنہری چشمے کے پیچھے چمکتی دو ذہین آنکھیں!
وہ دونوں چلتے ہوئے اس تک آئے۔
''نقاش! یہ میری بھابی ہیں۔ میرے مرحوم بھائی کی بیوہ اور بھابی! یہ ہیں میرے بیسٹ فرینڈ نقاش

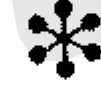
حسن' جس کی باتیں میں آپ سے کرتا آیا ہوں۔''
''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔ آفی بھائی آپ کی بہت باتیں کرتے ہیں۔'' ایک سنجیدہ مسکراہٹ اس چہرے پر ابھری۔
وہ دونوں پھر باہر آ گئے۔ ''گھر کی ہر امور کی ذمہ داری بھابی خوب نبھاتی ہیں۔ کچن انٹیریئر' مہمان سبھی کچھ وہ سنبھالتی ہیں مگر وہ بہت تنہا ہیں' بہت اکیلی' بھائی کی ڈیتھ کے بعد ان کی زندگی کا مقصد حویلی کی خدمت کرنا ہی رہ گیا ہے۔'' آفتاب اسے بتاتا رہا۔ ''جب سے میں یونیورسٹی سے آیا ہوں ان سے خوب دوستی ہو گئی ہے مگر پتہ نہیں وہ کیوں گریز کرتی ہیں۔ ایک بار بابا سائیں نے مجھ سے بات کی تھی کہ وہ بھابی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتے ہیں مگر میں نے منع کر دیا۔ بس پھر یہ بات نہیں چھیڑی۔'' نقاش اس کی باتیں سنتا رہا اور ذہن صحیٰ فاطمہ کو تلاش کرتا رہا۔ پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں کہ وہ ڈائری چھ سال پرانی ہے جسے وہ اپنے سامان کا حصہ بنا کے آیا تھا اور ابھی جس کے بہت سے راز' بہت سے بھید اس کے منتظر تھے۔



''افتخار صاحب کی دیکھ بھال اور ذمے داری کے ساتھ ساتھ حویلی کے کئی امور کی دیکھ بھال شروع کر دی ہے جیسا کہ مالی' ڈرائیور' صفائی والوں اور ککس کی نگرانی۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے کے مصداق اب ادھر ادھر کے کاموں میں خود کو بہلا کے زندگی کو مصروف کر لینا چاہتی ہوں تاکہ کوئی باغی خیال دل کے کواڑ نہ کھٹکھٹائے تاکہ خوابوں کا کوئی آزاد پنچھی اس قید خانے تک پہنچ نہ پائے اور حویلی کی بہورانی کے اندر سے صحیٰ فاطمہ کا وجود زندہ نہ ہو جائے۔''
ایک اور دل کو اداس کر دینے والا ورق تھا۔ کیا اتنا غم' اتنی تکلیف چند اوراق میں بند کی جا سکتی ہے۔ کیا چند کاغذ اتنا بوجھ ڈھو سکتے ہیں جتنا اس چھوٹی سے سرخ جلد والی ڈائری نے ڈھویا تھا۔ حویلی وہ تو یہاں گھومنے پھرنے' ریلیکس کرنے آیا تھا لیکن اس ڈائری نے تو اسے ایک عجیب کشمکش میں ڈال دیا تھا۔
سوچتے سوچتے اس نے ایک اور ورق پلٹا۔
''آج سکندر شاہ کی بھانجی نورین کی رسم مایوں تھی۔ پوری حویلی نور سے روشن تھی۔ کوئی کونا ایسا نہیں تھا جہاں پر قہقہے روشن نہ ہوں۔ حویلی کی پرانی رسوم کے مطابق رسم مایوں میں شرکت کرنے والیاں فقط سہاگنیں ہی ہوتی ہیں۔ کنواریوں اور بیواؤں کا اس رسم میں شریک ہونا منع ہوتا ہے سوئی سہاگن ہونے کے ناتے مجھے بھی بلایا گیا لیکن سوچتی ہوں پتہ نہیں میں سہاگن ہوں کہ نہیں۔ میرا سہاگ ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے۔ کسی بھی نئی نویلی سہاگن کی طرح نہ گجروں کے پھول مجھے چھیڑتے ہیں اور نہ صبح بستر پر کانچ کی چوڑیاں بکھری ہوئی ملتی ہیں اور نہ سیج کی مسحور رعنائیاں میرے حصے میں آئی ہیں۔ سہاگنیں تو وہ ہوتی ہیں جن کی پہلی مانگ میں افشاں ہوتی ہے اور پھر گودیں ہری لیکن شاید میری قسمت میں کوئی رنگ نہیں' نہ

مانگ کی افشاں کا اور نہ گود کی شادابی کا۔

دلہن کو ابٹن اور تیل لگانے کے لیے سات سہاگنوں میں مجھے بھی شامل کیا گیا لیکن کاش کہ میری مانگ کا سایہ کسی نئی سہاگن پر نہ پڑے۔ میری بے رنگی کسی کو بھی بے رنگ نہ کرے۔'' تحریر کے اختتام پر نقاش حسن کا دل بے حد ملول ہو گیا تھا۔



''یار آفتاب! تمہاری حویلی کی کوئی لڑکی ڈاکٹر بھی ہے کیا؟'' نقاش کے اس اچانک سوال پر آفتاب بوکھلا سا گیا تھا۔

''کیوں' کیوں پوچھ رہے ہو تم؟''

''کچھ نہیں۔ ویسے ہی' اوپر میرے کمرے کی الماری میں میڈیکل کے کورس کی کتابیں کافی تعداد میں پڑی ہیں اس لئے۔'' نقاش بولا۔

''ارے ہاں! وہ میری بہن ہے نا شاہین اس کی کسی دوست کی ہیں۔ وہ پڑھ کے فارغ کرتی گئی اور شاہین گھر لیتی آئی۔ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا لیکن میرٹ نہ بننے کی وجہ سے پیچھے رہ گئی۔'' آفتاب نے لنگڑا سا بہانہ بنایا۔

''تو یار! تم لوگ سیلف فنانس پر بھی اسے ڈاکٹر بنا سکتے ہو۔ اگر اس کی اتنی ہی چاہت تھی تو۔'' نقاش نے کریدا۔

''چھوڑو یار! یہ باتیں بابا سائیں کے ڈپارٹمنٹ کی ہیں سو وہی سوچتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے یہاں لڑکیوں کی تعلیم سے زیادہ ان کے گھر بسانے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پتہ ہے آج شام حویلی میں فنکشن ہے۔'' آفتاب نے بات کا رخ بدلا۔

''فنکشن! کیسا فنکشن؟''

بابا کی پولیٹیکل پارٹی کے کچھ ارکان ایم این اے بن گئے ہیں۔ اسی خوشی میں بابا نے آج شاندار دعوت دی ہے۔ حویلی کے مکینوں کے علاوہ باہر کے بھی کئی لوگ شریک ہوں گے اور میرے دوست ہونے کے ناتے تمہیں بھی آنا ہوگا۔''

''میرا آنا ضروری ہے؟'' نقاش نے ٹالنا چاہا۔

''بالکل ضروری ہے۔ کم از کم آج کی دعوت تو دیکھ لو۔ کل پرسوں تک یہ جشن جاری رہے گا لیکن شرفاء کے لئے لازم ہے کہ وہ آج ہی آجائیں۔'' آفتاب نے آنکھ دبا کر کہا۔

''ارے یار آج فیملی پارٹی ہے۔ کل سے رقص و سرور کی محفل ہوگی۔ تمہیں پتہ ہے کہ ہمارے ملک کے سیاستدان کیسے شوق رکھتے ہیں۔'' آفتاب نے عام سے لہجے میں کہا اور وہ اس کی بات سن کر چپ ہو گیا۔

وہ اس امید پر اس دعوت میں شریک ہوا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی ملاقات ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ سے ہو جائے۔ آخر وہ حویلی کی بہو ہے لیکن حویلی کی بہت ساری بہوئیں ہیں۔ سکندر شاہ کے چار بھائی اور ان کے بہت سارے بچے اور ان سب کی بیویاں۔ پتہ نہیں ضحیٰ فاطمہ کس کی بہو اور کس کی بیٹی ہے۔ سکندر شاہ کے تینوں بیٹوں کو وہ جانتا ہے اور ایک مرحوم بھائی کی بیوہ سے وہ مل چکا ہے۔ ضحیٰ فاطمہ کے آسیبی چھلاوہ وجود نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

وہ بھری محفل میں موجود ہر لڑکی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور ضحیٰ فاطمہ کو ڈھونڈ رہا تھا مگر کوئی بھی چہرہ اسے اس شخصیت' اس چہرے سے مشابہ نظر نہیں آیا۔ بیکری کی پیسٹریوں کی طرح سجائی عورتیں' بات بے بات کھوکھلے قہقہے لگاتی لڑکیاں۔ قیمتی ملبوسات اور زیورات کے اندر چھپی دوغلی ہستیاں۔

''نہیں' نہیں! ان میں سے کوئی بھی ضحیٰ نہیں''۔ اس کے دل کے اندر سے ایک آواز اسے مطلع کرتی۔ ضحیٰ اس طرح کی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس کی باتیں' اس کی تحریریں' اس کے لفظ بناوٹ سے پاک ہیں وہ خود بھی اسی طرح کی ہوگی۔ وہ کھوکھلے قہقہے نہیں لگاتی ہوگی۔ اس کے ملبوسات میں یہ نمائشی پن نہیں ہوتا ہوگا۔ نہیں یہ جگہ ضحیٰ کے وجود کے قابل ہی نہیں۔'' وہ پل میں فیصلہ کرنے لگا۔

یہ نقاش حسن کو کیا ہو گیا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ کیوں اتنا بدل گیا تھا۔ ہر وقت ان دیکھے وجود کی تلاش میں' اس کے خیالوں میں رہتا۔ اپنی زندگی کے بجائے اس کی زندگی میں جی رہا تھا۔ اس کے درد سے' اس کے لفظوں سے' اس کی باتوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا یا شاید اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں کھڑے کھڑے ایک خیال آسمانی بجلی کی مانند کوندا تھا۔ وہ شیشے کا مشروب بھرا گلاس ہاتھ میں تھامے لرز اٹھا تھا۔ محبت..... محبت...... محبت......

''محبت کیا ایسے بھی ہو جاتی ہے۔ بنا دیکھے بنا جانے' بنا مانگے۔ کیا محبت میں محبوب کا چہرہ' اس کے خدوخال بھی کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس کا محبت کرنا نہ کرنا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کا آنکھوں کے سامنے ہونا نہ ہونا بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا' نہیں ہوتا' بالکل نہیں ہوتا۔ محبت میں محبوب کا چہرہ' اس کے خدوخال' اس کا رنگ و روپ' اس کا سراپا' اس کی قامت بالکل بھی ضروری نہیں ہوتیں۔ اس کا سامنے ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معنی رکھتی ہے تو فقط ایک چیز کہ دل اسے مانگتا ہے' اسے چاہتا ہے' آنکھیں اس چہرے کو اپنے اندر اتار لینا چاہتی ہیں۔ ہونٹ اس کے لمس کو پانا چاہتے ہیں۔ ہاتھ اس کے ہاتھوں کو تھامنا چاہتے ہیں اور بس!'' دل کے اندر سے کسی ہمزاد کی آواز آئی۔

وہ پھر سراپا سوال ہو گیا۔ ''تو کیا مجھے بھی محبت ہے ضحیٰ فاطمہ کے ان دیکھے وجود سے؟''

ہمزاد پھر بول اٹھا۔ محفل کے شور میں بھی اس ہمزاد کی آواز کتنی نزدیک تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے بس وہاں وہ دونوں ہوں۔ وہ اور اس کا ہمزاد۔

''صحیح اندازہ لگایا ہے تم نے دوست! تمہیں محبت ہوگئی ہے ضحیٰ فاطمہ سے ان دیکھی' ان جانی' نا آشنا ضحیٰ فاطمہ سے ورنہ تم اسے ڈھونڈتے کیوں۔ اس کا چہرہ ہر چہرے میں تلاش کیوں' اسے مانگتے کیوں؟''

''مگر مگر میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے دکھ درد دور کر کے اس سفاک حویلی کی سنگلاخ دیواروں سے نکال کر لے جانا چاہتا ہوں۔ اس کے خواب پورے کرنا چاہتا ہوں۔'' نقاش حسن کا دل پھر بولا اور ہمزاد مسکرا دیا تھا۔

''تو پھر ڈھونڈو اسے۔ وہ خود تمہارے سامنے تھوڑی آئے گی۔ وہ تو ایک ایسی شہزادی ہے جس کے جسم میں سوئیاں گڑی ہیں۔ ان سوئیوں کو نکالنے اور شہزادی کو آزاد کرنے کے لئے تمہیں ہی مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کے کیل کانٹے ہٹانے جانا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے' میں اس کو ڈھونڈوں گا۔ اسے اس حصار سے آزاد کرواؤں گا۔ اس کے تمام خواب پورے کروں گا۔'' وہ دل میں عہد باندھ کے محفل چھوڑ آیا تھا۔ اب اسے سب سے پہلے کریم بخش کو تلاش کرنا تھا سو وہ رات کے اندھیرے میں سرونٹ کوارٹرز کی جانب نکل آیا۔ راستے میں جگہ جگہ چوکیدار اور گارڈ تھے مگر اب اسے بھی آفتاب شاہ کے دوست کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ اسے سرونٹ کوارٹر تک پہنچنے میں میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں آیا۔ وہ چلتا ہوا اس جگہ تک آ گیا جہاں دو چوکیدار آگ جلائے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے اسے پہچان لیا تھا۔

''سرکار آپ یہاں' آپ تو چھوٹے سرکار کے دوست ہیں نا جو شہر سے آئے ہیں۔'' وہ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر بولا۔

''ہاں میں وہی ہوں۔ تم کون ہو؟'' نقاش حسن اس کی جانب بڑھا تھا۔

''میرا نام ولی محمد ہے سرکار! میں مالی ہوں اور یہ میرا بھائی رحمو ہے۔ چوکیداری کرتا ہے۔ کھانا کھانے یہاں آیا تھا۔'' ولی محمد نے اپنا تعارف کروایا۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ شخص نقاش کو موزوں محسوس ہوا سو وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''ولی محمد! کیا میں تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں سرکار! بیٹھیں بیٹھیں۔ کہیں تو کھانا لا دوں۔'' ولی محمد نے مہمان نوازی سے جذبے سے کہا۔

''نہیں میں نے پارٹی میں کھانا کھا لیا ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔

''تو پھر چائے' بیڑی' قہوہ کچھ تو لیں سرکار۔'' ولی محمد کے بھائی نے کہا۔

''ہاں ایک کپ گرم چائے پلا دو۔

باہر تو کافی ٹھنڈ ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ رگڑ کر گرمی پیدا کی۔ ولی محمد کا بھائی اٹھ کر چلا گیا۔ ولی محمد

نے اسے اپنی چادر اوڑھنے کے لئے دے دی۔ یہ دوستی اور اپنے پن کا خلوص بھرا اظہار تھا۔ نقاش پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر مقصد کی بات کی طرف آیا۔

''ولی محمد! کریم بخش جو وڈیرے سکندر شاہ کا خاص بندہ ہے وہ کہاں ہوتا ہے؟''

''کریم بخش' سرکار آپ اس کا کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' ولی محمد نے پوچھا۔

''ویسے ہی یار! یونیورسٹی کے زمانے میں آفتاب اس کی اتنی باتیں کرتا تھا کہ اس کو دیکھنے کا شوق ہو گیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرتا یہاں چلا آیا تو سوچا کہ چاچا کریم بخش کو بھی دیکھتا چلوں۔'' نقاش نے ہلکے پھلکے لہجے میں عذر تراشا۔

ولی محمد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''سرکار! مجھے حویلی میں کام کرتے ہوئے فقط ڈیڑھ سال ہوا ہے۔ تمام دن باغ کے پودوں' سبزیوں' کھیتوں اور فارم ہاؤس میں کام کرتے کرتے رات کو اتنا تھک جاتا ہوں کہ کسی کا حال جاننے کی خبر نہیں ہوتی لیکن یہ جو میرا بھائی ہے دین محمد یہ بتاتا ہے کہ کریم بخش وڈیرے سائیں کا قابل بھروسہ بندہ تھا۔ زمینوں کے حساب کتاب سے لے کر گھر کے امور تک سبھی کچھ کریم بخش کرتا تھا۔ انتہائی وفادار تھا۔ کوئی پانچ ساڑھے پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ وڈیرے سائیں کے خاندان کے چند لوگ جن میں ایک بیٹا' ایک بھانجا اور دو بھانجیاں تھیں' کے ہمراہ شہر جاتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ ایکسیڈنٹ اتنا خطرناک تھا کہ وڈیرہ سائیں کا بیٹا' بھانجیاں' بھانجا' ڈرائیور' کریم بخش سبھی مر گئے۔ بس میں یہی جانتا ہوں کریم بخش کے بارے میں۔'' ولی محمد چائے کی چسکیاں لیتا ہوا انتہائی افسوس سے بولا تو نقاش حسن کی حیرت اور افسوس کی انتہا نہ رہی۔ ضحیٰ فاطمہ کی تلاش جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں آ کر رک گئی تھی۔

''بڑا افسوس ہوا کریم بخش کی موت کا سن کر۔''

''اب تو بات بڑی پرانی ہو چکی ہے۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ یہ ایکسیڈنٹ وڈیرہ سائیں کی مخالف سیاسی پارٹی نے جان بوجھ کر کروایا ہے تاکہ وڈیرہ سائیں کی کمر توڑ سکیں لیکن ہمارے وڈیرہ سائیں کو ماں کی دعائیں ہیں۔ ان کی کمر کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔'' ولی محمد فخریہ لہجے میں بولا۔

''لیکن ولی محمد! کریم بخش کی کوئی اولاد' گھر والے کوئی تو ہو گا یہاں۔'' نقاش نے کریدنا چاہا۔

''او جی رب سوہنے نے اس بے چارے کو ایک ہی بیٹی دی تھی۔ پتہ نہیں کہاں ہو گی مجھے زیادہ علم نہیں۔'' ولی محمد نے بے خبری ظاہر کی۔ پتہ نہیں وہ واقعی لاعلم تھا یا ڈھونگ رچا رہا تھا۔ بہر حال نقاش حسن مایوس ہو کر وہاں سے رخصت ہوا اور حویلی کے رہائشی حصے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ضحیٰ فاطمہ ابھی تک ایک راز تھی' ایک بھید تھی۔

اگلے روز ایک اور جشن تھا۔ بقول آفتاب کے رقص و سرور کی محفل تھی۔ پچھلی رات بھی محفل میں پینا

پلانا معیوب نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ عام تھا۔ ہر کوئی جام اٹھائے اپنی بیویوں کے سلیولیس بلاؤز والے شانے پر ہاتھ رکھے اپنے اسٹیٹس کا جھنڈا بلند کئے کھڑا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ان سب میں بہت ان فٹ محسوس کر رہا تھا لہٰذا آج اس نے جانے سے معذرت کر لی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنائے بستر میں گھسا رہا۔ آفتاب اور باقی گھر والوں کا جانا شاید ضروری تھا سو وہ چلے گئے۔ وہ بستر پر لیٹا ضحیٰ فاطمہ کو پڑھتا رہا۔

''آج بابا مجھ سے ملنے آئے تھے مگر جب سے میں حویلی کی بہورانی بنی ہوں میرے بابا مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔ ناشناسا کی طرح ملتے ہیں۔ کھل کر بات نہیں کرتے۔ مالک اور نوکر کا فاصلہ بنائے رکھتے ہیں اور میں بھی اس فاصلے کو پھلانگ نہیں سکتی۔ شاید ابھی تک ان سے ناراض ہوں۔ پورا ایک سال گزرنے کے باوجود بھی۔

حویلی میں ہر طرف چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ بڑی بہورانی ابھی تک ماں کیوں نہیں بنی۔ کیا وجہ ہے؟ شاید بانجھ ہوگی اور اب تو میں نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ میں بانجھ ہوں اور تاعمر بانجھ ہی رہوں گی۔ بابا کہہ رہے تھے کہ وہ شہر جا رہے ہیں۔ نورین کی ڈلیوری ہے۔ اسے اس کی بہن اور بھائی کے ساتھ لاہور لے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاتے آئیں گے تو میں نے شرم کا ہر پردہ ہٹا کر کہہ دیا کہ پہلے افتخار کے دماغ کا علاج کرائیں اور پھر انہیں شوہر کے منصب پر فائز کریں۔ بیمار میں نہیں افتخار ہیں اور شاید سکندر شاہ نے افتخار کو بھی کل لاہور کسی نئے ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

اس کے بعد اگلے ہی صفحے پر دلدوز تحریر تھی۔

''بابا چل بسے۔ اب نہیں رہے۔ پوری گاڑی الٹ گئی۔ سبھی مر گئے۔ ضحیٰ فاطمہ آج یتیم ہوگئی اور بیوہ بھی۔''

ابھی وہ اس مختصر سی دو لائنوں کی تحریر کو پوری طرح پڑھ بھی نہ پایا تھا کہ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ اندھیرا ہونے سے خنک ماحول میں ایک خاموشی پھیل گئی تھی۔ وہ بستر سے اٹھا۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا صوفے پر رکھے اپنے سفری بیگ کی جانب آیا اور سائیڈ پاکٹ سے اپنی ٹارچ نکال لی جو اسی طرح کے ہنگامی حالات کے لئے وہ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ کمرے میں روشنی کا ایک دائرہ سا پھیل گیا۔ وہ چلتا ہوا دروازے تک آیا اور ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلتے ہی قریب سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

''خادم حسین! کیا ہوگیا؟''

''کچھ نہیں بی بی جی! حویلی کے اس پورشن کا فیوز اڑ گیا ہے۔ کچھ دیر میں جنریٹر آن کرتا ہوں۔'' نیچے کہیں سے آواز آئی۔ اس کمرے سے تھوڑی دور باہر ٹیرس تھا۔ وہ اسی جانب جانے لگا۔ ٹارچ اس نے

بند کی ہوئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ گھر کے سبھی افراد محفل میں ہیں تو پھر یہ خاتون کون ہیں۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا ٹیرس کی جانب بڑھنے لگا پیچھے کسی کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی یعنی کوئی ابھی نیچے کی جانب گیا تھا۔ وہ ٹیرس میں پہنچا تو سردی کی ایک شدید لہر کا احساس ہوا۔ اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ سردی کی شروعات تھی مگر میدانی اور کھیتوں والے علاقے ابھی سے ٹھنڈے تھے۔ حویلی کے مہمان خانے سے موسیقی، طبلے اور گھنگھروؤں کی آوازیں آ رہی تھیں یعنی وہاں روشنی اور زندگی باقی تھی اور حویلی کا یہ پورشن اندھیرے اور خاموشی کا مسکن تھا اور ان دونوں حصوں کے درمیان آسمان پر ایک تنہا ابھرا چاند چمک رہا تھا۔ روشن بھی مگر خاموش بھی، زندہ بھی اور مردہ بھی۔ وہ چاند دیکھتے ہوئے آگے بڑھا تو پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گئے چیز اس کے پاؤں پر آ گری۔ اس نے ٹارچ کا بٹن دبایا۔ چمکیلی روشنی کا دائرہ ایک میرون قلم پر پڑا جو کرسی سے گرا تھا اور نقاش کا پاؤں اسی کرسی سے ٹکرایا تھا۔ اس نے وہ قلم اٹھا کر کرسی پر رکھنا چاہا تو کرسی پر ایک ڈائری کو بھی الٹا رکھا پایا یعنی ابھی کچھ دیر پہلے یہیں بیٹھا کوئی ڈائری لکھ رہا تھا تجسس کے مارے نقاش نے وہ الٹی پڑی ڈائری اٹھا لی اور ٹارچ کی چمکیلی روشنی میں ایک تحریر اسے نظر آئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ سراسر وہی تحریر تھی۔

''سامنے والی حویلی کی منزل میں موسیقی کی آواز آ رہی ہے۔ طبلے، ڈھول، ہارمونیم اور ستار کی لے پر کوئی گنگنا گا رہی ہوگی تو کوئی جمنا بائی ناچ رہی ہوگی اور سبھی کے سبھی اہل سادات اس سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ سوچتی ہوں ان سید زادوں کو ہر عورت کو کٹھ پتلی کی طرح اپنی ہتھیلی پر نچانا خوب آتا ہے۔ ضحیٰ فاطمہ بھی تو انہی میں سے ایک کٹھ پتلی ہے جو پچھلے چھ سال سے محو رقص ہے۔

یہ سراسر وہی تحریر تھی یعنی ابھی ابھی یہاں سے جو نسوانی آواز ابھری تھی، جو انجانا وجود گزرا تھا وہ ضحیٰ فاطمہ تھی۔ نقاش حسن کی ان دیکھی محبت، اس کی تلاش، اس کی تشنگی۔ وہ ڈائری کرسی پر رکھ کر ٹارچ کی روشنی میں دوڑا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترنا لگا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کے ہاتھ، اس کی آنکھیں، بےقراری بڑھتی جا رہی تھی۔ فاصلہ گھٹتا چلا جا رہا تھا۔

اس حویلی کے نیچے والے پورشن کا کوریڈور لمبا تھا۔ گھپ اندھیرے میں لپٹا ہوا اور اس گھپ اندھیرے میں ایک موہوم ہی کرن پھوٹی تھی۔ قریب ہی کہیں موم بتی جلائی گئی تھی۔ اس نے اپنی ٹارچ بند کر لی اور اس ہستی کا دیدار کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

ہاتھ میں موم بتی تھامے ایک لڑکی اسی جانب آ رہی تھی۔ چہرہ، خدوخال زیادہ واضح نہ تھے۔ فقط لہراتے دوپٹے کا اودا رنگ ہی واضح تھا۔ وہ اس سے پہلے پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ بےآواز قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی جانب بڑھا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں لڑکھڑا گیا اور پھسل کر سیڑھیوں سے لڑھکا تھا۔ نیچے ایک گلدان تھا جس سے اس کا سر بری طرح ٹکرایا تھا اور بہت زور کی آواز آئی تھی۔ خاموشی

ٹوٹ کر بکھری تھی۔ پیتل کے قد آدم کے گملے کی آواز فرش پر گونج رہی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

''کون ہے؟'' اور موم بتی کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اس کی اپنی شکل ابھی بھی صاف نہ تھی۔

''ارے آپ! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔'' اس نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور قریب ہی رکھے صوفے تک لے آئی اور پھر نجانے کہاں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد پورا گھر روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔ بجلی آ گئی تھی اور ساتھ میں وہ بھی۔

اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا مشکل تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے آفتاب کی بھابی ضحیٰ فاطمہ کے روپ میں کھڑی تھی۔ تو کیا یہی ہے ضحیٰ؟ میری محبت' میری تلاش' میری تشنگی!

وہ فرسٹ ایڈ بکس اٹھائے اس کے قریب آ گئی۔

''میں تو سچ مچ بھول گئی۔ آفتاب بتا کر گئے تھے کہ آپ یہیں ہیں مگر مجھے خیال نہیں رہا۔ آئی ایم سوری! بجلی چلی گئی اور آپ نے خود کو اتنی چوٹ لگالی۔''

وہ کاٹن سے اس کا زخم صاف کر کے اس پر بینڈ ایج لگاتی رہی اور وہ اپنی محبت کے بنائے پیچ وخم میں مزید الجھتا گیا۔

☆

'یار! تم تو ٹھیک ہو جانے کے بجائے مزید بیمار پڑ گئے۔ بھابی بتا رہی تھیں کہ کل اندھیرے میں تم سیڑھیوں سے گرے تھے۔'' صبح ہی صبح آفتاب شاہ اس کے کمرے میں حاضر تھا۔ وہ خاموش ہونٹوں سے مسکرا دیا تھا۔

''میں نے تو سوچا تھا کہ تمہیں اپنے فارم ہاؤس دکھاؤں مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور ہے۔''

''کیا مطلب! میں سمجھا نہیں۔'' نقاش حسن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مطلب یہ کہ ادھر تم بیمار پڑ گئے اور ادھر بابا سائیں نے حکم دیا ہے کہ ہمیں یعنی ان کے تینوں بیٹوں کو ان کے ساتھ کراچی جانا ہے۔ کوئی پراپرٹی وغیرہ کے کیس کا چکر ہے۔ کورٹ میں ہم تینوں کے سائن اور پیشی کی ضرورت ہے۔'' آفتاب شاہ نے کہا۔

''اوہ! کتنے دن لگیں گے تمہیں وہاں؟'' نقاش حسن بولا۔

''بابا تو کہہ رہے تھے کہ ہفتہ لگے گا لیکن زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔ ہفتے بعد علی کی لندن روانگی ہے۔ اس کو سی آف کر کے ہی آئیں گے لیکن مجھے تمہاری فکر ہے۔''

''میری فکر' وہ کیوں؟'' نقاش مسکرا دیا تھا۔

''یہی کہ تمہیں انوائٹ بھی خود میں نے کیا تھا اور جب تم آئے ہو تو میں جا رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم

ہمارے ساتھ ہی کراچی چلو۔'' آفتاب نے پیشکش کی۔

''ارے میری فکر مت کرو۔ تم آرام سے جا کر اپنے کام نمٹاؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آرام کروں گا۔ زیادہ بور ہوا تو تمہارے نوکروں کی فوج ظفر موج سے گپ لگا لوں گا۔'' اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ آفتاب بھی ایزی ہو گیا تھا۔

پھر آفتاب اس سے رخصت ہو کر بمع اپنے والد اور بھائیوں کے کراچی روانہ ہو گیا تھا اور نقاش حسن نے شکر کیا تھا کہ کم از کم اس کے پاس ایک ہفتہ ہے ضحیٰ فاطمہ سے بات کرنے کے لئے۔ اس نے ضحیٰ سے ملنے کا ارادہ کیا اور کپڑے چینج کرنے باتھ روم چلا گیا۔

باہر آیا تو حیران رہ گیا کہ جس چاند کو چھونے کی خاطر کتنی بلندیاں طے کرنی تھیں وہ چاند بذات خود چل کر دریچے میں آ بیٹھا تھا۔ وہ جو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ ضحیٰ فاطمہ کو کہاں ڈھونڈے گا لیکن ضحیٰ فاطمہ بنفس نفیس ناشتے کی ٹرالی اور فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ کمرے میں موجود تھی۔

''آپ' یہاں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''کیوں کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ویسے میں آپ کی طبیعت پوچھنے اور آپ کا بینڈ ایج تبدیل کرنے آئی ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی تھی۔ نقاش حسن نے اپنی پیشانی پر زخم کی پٹی پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہ تو اس زخم کو بھول گیا تھا۔

''اپنی ڈاکٹری سے مجبور ہو کر ہار مان ہی گئیں ناں۔'' اس کے لہجے میں محبت بھرا طنز تھا۔ وہ چونکی تھی جیسے بہت بڑی چوری پکڑی گئی ہو۔ بھید کھل گیا ہو۔

''ڈاکٹر' کون ڈاکٹر؟'' وہ گھبرا کر بولی تھی۔

''مجھے سب پتہ ہے ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ! مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ پر اعتماد تھا۔

''آپ کو آفتاب بھائی نے بتایا ہوگا۔'' وہ اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

''مجھے آپ کے لمس نے بتایا۔ کل جس مہارت سے آپ نے میرے زخم کے خون کو روکا' پٹی باندھی' درد دور کرنے کی دوا دی' کوئی بھی عام گھریلو عورت ایسا نہیں کر سکتی۔'' اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''اچھا' اگر ایسا ہے تو واقعی آپ کے مشاہدے کی تعریف کرنی پڑے گی۔ اب چلیں آئیں' پٹی تبدیل کروائیں۔'' وہ بھی مسکرائی تھی۔

وہ کسی فرمانبردار بچے کی طرح آیا اور اس کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پٹی کھولی' زخم کا معائنہ کیا۔

''ہوں! زخم پہلے سے کافی بہتر ہے لیکن مکمل طور پر مندمل نہیں ہوا۔ ابھی ایک دو بینڈ ایج اور کرنی پڑے گی۔ آپ کو بھلا کیا ضرورت تھی اندھیرے میں سیڑھیاں اترنے کی بلکہ سپرمین کی طرح اڑنے

کی۔ اس سفاک گملے کے ساتھ ٹکرانے کے بعد آپ کو تو ٹیٹنس کا انجکشن لگنا چاہیے تھا۔'' وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح دیکھتی ہوئی کہنے لگی اور وہ اس کی ہر ہر ادا کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''مجھے تو اس حویلی کی ہر چیز میں سفاکیت نظر آتی ہے۔ پتہ نہیں آپ کیسے رہ لیتی ہیں ضحیٰ!'' وہ بولا تھا۔ وہ کھوسی گئی تھی۔

''بہتر ہوگا کہ آپ بھی مجھے آفتاب بھائی کی طرح بھابی ہی بلائیں۔ اس حویلی کی ہر چیز سفاک ہونے کے ساتھ بے حس بھی ہے۔ یہ دلوں کے جذبوں کو نہیں جانتی اس لیے محتاط رہنا ضروری ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ڈیٹول میں بھیگا ہوا ٹھنڈا کاٹن اس کے زخم پر بارش کی ٹھنڈی بوند کی مانند پڑ رہا تھا جو پیاسی روح کو سیراب کرے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں ضحیٰ فاطمہ! آپ کو اپنے پیشے کے ساتھ یہ ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔ آپ کو یہ کام ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔''

''مجبوری تھی۔ آپ کو میرے حالات کا علم نہیں۔'' وہ پل میں پرائی ہوگئی تھی۔

''اگر میں کہوں مجھے علم ہے تو؟'' وہ اپنے پن سے بولا تھا۔

اس اپنے اور پرائے پن کے درمیان پل بھر کو ایک خاموشی حائل ہوگئی تھی۔

وہ اٹھی' ٹرالی آگے سرکائی' فرسٹ ایڈ باکس اٹھایا اور جانے لگی۔

''ناشتا کر لیجیے گا۔ ملازم بھیجتی ہوں برتن اٹھانے کے لیے۔'' وہ اپنے سچ سے بھاگ رہی تھی۔ آئینہ اس کے روبرو آ کے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ آئینے سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ کون تھا جو اس کی ہموار زندگی میں اشتعال بن کر آ گیا تھا اور لہریں بنانے لگا تھا۔ یہ کون جادوگر تھا جو قید سے چھڑانے آ پہنچا تھا۔ اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی تھی اور چھ سال بعد اس نے جانا تھا کہ اس کا دل سینے کی قید میں اب بھی دھڑکتا ہے۔

☆

وہ اپنی ڈائری کے ہمراہ ٹیرس میں موجود تھی۔ رات کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے جو ڈھلتے دنوں کے آدھے چاند کی روشنی کے بیچ حائل تھے۔ وہ اپنے آپ میں' اپنے غموں میں کھوئی ہوئی تھی کہ وہ اچانک ہی آن ٹپکا تھا۔ سرخ آنکھوں' بکھرے بالوں اور صداقت سے پر انداز لیے وہ اس کے سامنے تھا۔ پل بھر کو وہ ڈر گئی تھی۔ ایک ہلکی سی کراہ اس کے دل سے نکل کر ہونٹوں تک آئی تھی مگر وہ خود کو سنبھالنا جانتی تھی۔

''آپ یہاں رات کے اس پہر؟''

''کیوں اگر تم یہاں ہو سکتی ہو تو میں نہیں ہو سکتا۔ آخر تمہیں بھی تو میری طرح نیند نہیں آتی ضحیٰ!'' وہ

ایسے بولا جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتا ہو۔

''مت بلائیں مجھے اس طرح۔ کیا لگتی ہوں آپ کی۔ جانتے نہیں کہ میں کون ہوں۔ سکندر شاہ کے بیٹے کی بیوہ ہوں اور چلے جایئے یہاں سے۔ اس حویلی کے مکینوں کو پتہ چل گیا تو وہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے اپنی بے وقعت جان کی کوئی پرواہ نہیں لیکن آپ......'' وہ سختی سے کہتی رک گئی۔

''مت کہو اپنے آپ کو بے وقعت۔ اپنی وقعت کا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں اور اتار پھینکو اپنے اوپر سے یہ بیوگی کا کفن۔ وہ مر چکا ہے جس کے ساتھ تمہارا رشتہ زبردستی جوڑا گیا تھا۔ وہ لولا لنگڑا' اپاہج رشتہ مر چکا ہے۔ ضحیٰ! میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں۔ خدارا میرا یقین کرو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرا ساتھ دو خدا کے واسطے۔'' وہ دو زانو ہو کر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

''نہیں بتانا چاہیے تھا۔ آفتاب بھائی کو آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہیے تھا۔ میں جا رہی ہوں کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔'' وہ کرسی سے اٹھی تھی اور وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اٹھ کر آگے آیا تھا اور ٹیرس کا سلائیڈنگ ڈور بند کر کے اس کا لاک لگا لیا تھا۔

''کہیں نہیں جاؤ گی تم۔'' سختی سے بولتے ہوئے اس نے بتیاں بجھا دی تھیں۔ ٹیرس کے اندھیرے کونے میں اب انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' وہ سختی سے بولی۔

''میری بات اطمینان سے سنو۔ میری اخلاقی اقدار بہت اونچی ہیں۔ میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔'' وہ بھی قدرے سخت لہجے میں بولا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی کرسی تک آئی تھی اور نقاش پہلے ہی کی طرح دو زانو ہو کر اس کے آگے بیٹھ گیا تھا۔

''ضحیٰ! میرا یقین کرو۔ مجھے آفتاب نے کبھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ حویلی آنے سے پہلے میں تمہارے نام سے بھی واقف نہیں تھا مگر پچھلے ایک ماہ میں نے حویلی میں رہ کر اگر کسی کو جانا ہے تو وہ تم ہو۔ میں نے تمہاری چھ سال پرانی ڈائری پڑھنے کی گستاخی کی ہے۔ میں واقف ہوں تمہارے ہر درد سے' تمہاری ہر تکلیف سے۔'' وہ پل بھر کے لیے رکا۔

''ضحیٰ! تم سے ملنے' تمہیں دیکھنے سے بھی قبل مجھ پر ایک انکشاف ہوا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ یہ انکشاف مجھ پر میرے دل' میری روح' میرے ہمزاد نے کیا تھا جو میرے اندر کہیں رہتا ہے۔ ضحیٰ! میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ہے۔ بہت تلاش کیا ہے اور تم ملی بھی ہو تو اپنی تحریر کی وجہ سے۔ اس دن بجلی جانے کی وجہ سے میں یہیں آیا تھا اور تمہاری نئی ڈائری دیکھ لی تھی اور وہ میرا سیڑھیوں سے گرنا وہ بھی کچھ اسی تلاش کا حصہ تھا۔ ضحیٰ! آئی لو یو۔ پلیز میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں اس حویلی سے دور' بہت دور لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہارے خواب پورے کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے وجود سے اس بیوگی کی سفید

چادر کو نوچ کر تمہیں رنگوں میں لپیٹنا چاہتا ہوں۔ تم میں ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز ضحیٰ! میرا ساتھ دو۔ میرا یقین کرو۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔'' وہ کہتے کہتے اسے پر امید نظروں سے دیکھنے لگا۔ اپنی سچائیوں کا یقین دلانا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ اپنی بے قراریاں کسی پر کھولنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ وہ گردن جھکائے رہا اور وہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

وہ اٹھا اور سلائیڈنگ ڈور کھولتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ضحیٰ فاطمہ نے اسے روکنا چاہا تھا۔

✻

وہ تمام رات جاگتی رہی تھی۔ اس کی باتوں کی بازگشت ضحیٰ کی تنہائی میں شور مچاتی رہی تھی۔ آج تک ہر کوئی اس سے مانگتا آیا تھا۔ اس سے اس کی آزادی' اس کے خواب چھینتا آیا تھا۔ کبھی حق کے نام پر تو کبھی فرض کے نام پر اس سے توقع کر کے اور وہ دیتی آئی تھی' دیتی آئی تھی۔ ہر ہر موڑ پر آنکھوں سے خواب نوچے تھے۔ دل سے خواہشوں کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ تنہائی کو ہی اپنا ہمراز' ہمزاد بنایا تھا مگر آج یہ کون آیا تھا جو اتنے پیار سے' اتنی سچائی سے ساعتوں میں شور مچائے ہوئے تھا۔ ''تم آزاد ہو۔ تم آزاد ہو۔'' وہ تو آزادی کے نام تک کو فراموش کیے بیٹھی تھی پھر یہ کس نے محبت کی دھن چھیڑی تھی جس کی تان پر اس کا من' اس کا روم روم' اس کی ہر ہر شریان جھومے جا رہی تھی۔ اسے اس سفاک' بے درد' ٹھوس جامد حویلی کی دیواروں سے چھڑوانے یہ کون شہزادہ آ پہنچا تھا جو اتنا پر اعتماد تھا' اتنا سچا تھا۔

کون تھا جس نے اس کے جسم سے تنہائی کی سوئیاں نکالنی شروع کر دی تھیں۔

کون تھا جس نے اماوس کی کالی راتوں میں چاند اور ستارے ٹانکنے شروع کر دیئے تھے۔

کون تھا جس نے زندگی کے تپتے صحرا میں سے تھوہر کے پودے اکھاڑ پھینکے تھے اور نئے بیج بو کے ایک گلشن آباد کرنا شروع کر دیا تھا۔

کون تھا جو دو زانو بیٹھ کے اس سے اسی کی آزادی' اسی کی خوشی بھیک کی طرح مانگ رہا تھا۔

کون تھا جو محبت کا یقین دلا رہا تھا۔

کیا واقعی وہ سراپا محبت تھا۔ سراپا صداقت تھا۔

یا پھر فریب تھا۔

چھل تھا۔ دھوکہ تھا۔

جنت کے شجرِ ممنوعہ کو چھونے کو اکسانے کے لیے آدم و حوا کو بہکانے کے لیے شیطان بھی تو شرافت کا لبادہ اوڑھ کر آیا تھا۔ کہیں یہ بھی شیطان ہی کا تو کوئی بہروپ نہ تھا؟ وہ سوچتی۔ دل سے آواز آتی نہیں یہ خدشے نکال دو۔ وہ فریب' چھل' دھوکا نہیں۔ وہ تو فرشتہ ہے۔ محبت کا معصوم فرشتہ جسے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تمہاری چاہت کا روگی بن گیا ہے اس کا ہر ہر روم' ہر ہر عضو۔

اس نے رات کے اس پہر صبح ہونے سے کچھ قبل نفل نماز پڑھی اور اپنے لیے بھلائی کی دعا کی۔ اسے ہر وہ فیصلہ منظور تھا جو اس کے رب تعالیٰ نے اس کے لیے سوچا تھا' چاہا تھا اور وہ اپنے دل کے شور سے تنگ آ کر اسی کے دروازے پر جواب مانگنے آئی تھی اور بار بار اسے محسوس ہوا کہ اس دروازے سے جو جواب آیا وہ مثبت ہے۔

✻

وہ ہمیشہ کی طرح صبح ہی صبح جاگی تھی۔ نقاش اور اس کی پچھلی ملاقات کو دو راتیں گزر چکی تھیں۔ یہ دو راتیں اس نے خوب سوچ کر گزاری تھیں۔ اس نے اپنے ضمیر کا خوب امتحان لیا تھا اور نتیجتاً نقاش حسن کی وارفتہ محبت سرخرو ہوئی تھی۔ اس سنگلاخ دیواروں والی حویلی کے بیچ وہ ایک محتاط لڑکی کے دل میں پھول کھلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ خود پر ظلم نہیں کرے گی اور اب زیادہ خود پر جبر نہیں کرے گی۔ زمین پر جنم پانے والے ہر بنی نوع انسان کی طرح وہ بھی خواہشیں پالے گی۔ خواب رکھے گی۔ ذرا سا خود غرض ہو کر اپنے متعلق سوچے گی۔ اس حویلی سے آزاد ہو گی۔ آخر یہاں اس کا ہے ہی کون۔ بیٹے کی موت کی وجہ سمجھتے سکندر شاہ یا پھر قابلِ تحقیر و نفرت سمجھتی ان سب کی اولادیں۔ نوکر کی بیٹی کہہ کر ہر وقت طعنے دینے والی نندیں۔ وہ کیونکر سہتی یہ سب کہ جب بابا ہی نہیں رہے تھے جن کے لیے اس نے یہ قربانی دی تھی۔

وہ نہا کر باتھ روم سے نکلی تھی اور گلابی رنگ کا چکن کا سوٹ زیب تن کیا تھا۔ آئینے کے روبرو کھڑی ہو کر اس نے فرنچ پرفیوم کی دلفریب مہک کو اپنے ملبوس کا حصہ بنایا تھا۔ پنکھڑی ہونٹوں پر ایک شیڈ لگایا تھا اور وہ پری پیکر عمر کا اتنا حصہ یونہی سادہ گزار دینے کے بعد بھی ویسی ہی ترو تازہ' خوبصورت' پرکشش تھی۔ کچن میں آ کر اس نے کک سے خاص ناشتا بنوایا اور کرسٹل کی ٹرالی پر اپنے ہاتھوں سے سجا کر ہولے قدموں سے اسے دھکیلتی وہ نقاش حسن کے کمرے کے عین سامنے کھڑی تھی۔ دو انگلیوں سے دستک دی تو اندر سے یس کی آواز آئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ ابھی تک بستر میں تھا۔ غالباً اس نے یس سوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مسکرائی اور ٹرالی آگے رکھ کر ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اٹھیے اور ناشتا کر لیجیے۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ بہت مختلف لہجے میں بولی تھی تو نقاش حسن اس کے جلترنگ سی آواز سن کر فوراً اٹھا۔ اپنے سامنے ان بھیگے بالوں' رنگین کپڑوں اور گلابی ہونٹوں والی لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ تو نہ تھی جسے کچھ دن قبل وہ دیکھتا آیا تھا۔ یہ تو ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ تھی۔ وہی جوان ڈائری کے اوراق میں اس سے ملتی تھی۔ وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ ان آنکھوں کی چاہت سے پزل ہو رہی تھی۔ ٹی کوزی ہٹا کر شیشے کی کیتلی میں سے کپ میں چائے انڈیلی۔ شوگر کیوب شامل کیں۔ چمچہ ہلا کر اسے کنکھیوں سے دیکھا اور کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ابھی بھی اس کی جانب

دیکھ رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں کوئی جن بھوت تھوڑی ہوں جو ابھی دھواں بن کر اس چائے کی کیتلی میں چلی جاؤں گی۔'' وہ مسکرا کر بولی تھی۔

''کیا خبر ایسا ہی ہو یا پھر یہ کہ میں ابھی تک سویا ہوں اور تم میرے خوابوں کی سرزمین پر پرستان کی پری کی مانند اتری ہو۔ ابھی جاگوں اور ابھی یہ خالی درودیوار میری تنہائی پر ہنسی اڑائیں گے۔ سچ ضحیٰ! میں کیسے یقین کرلوں کہ جولڑکی میرے سامنے گلابی کپڑوں اور بھیگے الجھے بالوں کے ساتھ بیٹھی ہے وہ ضحیٰ ہے' میری ضحیٰ۔'' وہ چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتے ہوئے بھی انہی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کھو سی گئی تھی۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا نقاش کہ میری زندگی میں بھی کوئی بہاروں کا قاصد بن کے آیا ہے۔ مجھے تو امید ہی نہ تھی کسی ایسی نوید کی' کسی ایسی خوشگوار نیک ساعت کی۔ نقاش! اس سے پہلے کہ کسی کورشب کا سایہ پھر سے میرے خوابوں کے اوپر پڑے' مجھے اپنا بنالیں۔ اس سے قبل کہ پھر کوئی سفاک قیدی مجھے روک لے' مجھے یہاں سے لے چلیں۔'' اس کی آنکھوں میں بلا کا تیقن تھا۔

''بس چند دن اور۔ آفتاب اور سکندر شاہ کو آنے دو۔ ان سے بات کرکے پھر ہم شادی کرلیں گے۔''

''نہیں' خدارا نہیں! ایسا ہرگز مت کیجیے گا۔ سکندر شاہ کے ظالم کانوں تک یہ خبر ہرگز آنے مت دیجیے گا۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اس کے بیٹے کی بیوہ دوبارہ کسی کے نام کا سرخ جوڑا پہنے۔ میری مانیں تو آج ہی مجھے لے کر یہاں سے نکل چلیں۔ مجھے اب بربادی اور بدنامی کا کوئی ڈر نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کرب اتر آیا تھا۔ وہ کرب جو کتنے سالوں سے وہ تنہا جھیلتی آئی تھی۔

''میں کمزوروں کی طرح بھاگنا نہیں چاہتا ضحیٰ! تاعمر اپنی ہی آنکھوں میں ذلیل نہیں ہونا چاہتا ہوں۔ اگر میری محبت میں ذرا سی بھی طاقت ہوگی تو میں تمہیں مانگنے میں کامیاب ہوجاؤں گا اور یقیناً تمہیں اپنا بنالوں گا اور اگر ایسا کچھ نہیں ہوا تو ایک راہ فرار تو پھر بھی ہوگی۔ بہرحال ضحیٰ! جو بھی ہو میں تمہیں اس حویلی کی سفاک قید سے نکال کرلے جاؤں گا۔ میرا یقین کرو۔'' اس نے ہاتھ اس کے کپکپاتے ہاتھ پر رکھا تھا اور اپنے ہاتھ کی گرفت اس پر مضبوط کرلی تھی۔ ناشتے کی ٹرالی سمیت پورے کمرے میں اپنی خوشبو چھوڑ کر وہ جا چکی تھی۔

کچھ دیر بعد جب نقاش نے اپنے کمرے کے پردے کھولے اور شفاف دھوپ کو اندر آنے کا راستہ دیا تو دیکھا ٹیرس کے منی پلانٹس اور پودوں کو پانی دیتی ہوئی ضحیٰ کے لبوں پر ایک نغمہ تھا۔ ایک خوشی تھی اور آنکھوں میں جگمگاتے امیدوں کے چراغ تھے۔

☆

وہ کتنے دن دل میں ارادے باندھتا رہ گیا۔ الفاظ جوڑتا رہ گیا تھا۔ بات بے شک غلط یا ناجائز نہ تھی مگر کرنی ان سے تھی کہ جن کے ظلم اور بے حسی کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جن کی سزائیں انسان کو زمین کے اندر پہنچا دیا کرتی ہیں۔ پر عزم تو وہ تھا اور جب عزم اور جنون ایک ساتھ ہی روح میں آسمائیں تو منزلیں مل جایا کرتی ہیں۔ پتھر کی سخت سے سخت دیواریں بھی زمین بوس ہوجایا کرتی ہیں اور جب کبھی دل کے نہاں خانوں میں چھپی امید دم توڑنے لگتی تو وفا سر اٹھاتی۔ ضحیٰ کے چہرے کے نقش' اس کے تحریر کردہ لفظ' سطریں اس کا حوصلہ دوگنا کردیتیں اور وہ از سرِ نو ایک پرامید اور حوصلہ مند ارادہ باندھ لیتا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ سب سے پہلے آفتاب شاہ کو کنوینس کرے گا اور اس کو منا لینے کے بعد مشکل اور قدرے ناممکن مرحلہ سکندر شاہ کو منانے کا تھا کہ اس سفاک دل پر ضرب لگانا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

مگر سفاک دل پر ضرب قدرت نے لگادی تھی۔ پراپرٹی کا کیس ہارنے کے بعد سکندر شاہ کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ سخت چٹان سے سینے میں مدفون بے حس دل بھی اثر انداز ہوگیا تھا۔ آفتاب نے اسے فون پر مطلع کیا تھا کہ اس کے بابا لاہور میں ہی زیرِ علاج ہیں۔ انہیں سی سی یو میں رکھا گیا ہے۔ بہت پریشان و آزردہ ہیں اور ماضی میں کیے اپنے ہر گناہ پر پشیمان و شرمسار ہیں۔ چند ہی دنوں میں بہت بدل گئے ہیں۔ چند ہی دنوں میں ان کے اندر کا انسان بیدار ہوگیا ہے۔

پھر اگلے ہی دن آفتاب شاہ بنفسِ نفیس حویلی میں موجود تھا۔ اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر نقاش حسن حیران ہی تو ہوگیا تھا۔

''یار! ایمرجنسی میں آنا پڑا۔ بابا کی ضد تھی۔ ان کو اکیلا چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ علی نے جانے کا پروگرام کینسل کردیا۔'' آفتاب بولا تھا۔

''لیکن یار کیسے ہوگیا اچانک سب کچھ۔ میرا مطلب اس کیس وغیرہ سے ہے۔'' نقاش حسن نے تشویش ظاہر کی۔

''یار نقاش! تم سے کیا چھپانا۔ یہ پراپرٹی کا کیس دراصل میرے تمام چچاؤں نے زمینوں اور باقی پراپرٹی کے حصوں کے لیے کیا تھا مگر بابا کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جائیداد کا بٹوارہ ہو یا کوئی اور ان کی جگہ حکمران ہو۔ بابا ہر کسی سے ناانصافی کرتے آئے اور جب رب کی بے آواز لاٹھی چلی تو بابا کی آنکھیں کھل گئیں۔ میرے چچا پراپرٹی کا کیس جیت گئے اور جائیداد کے بٹوارے کا فیصلہ ہوگیا۔ نتیجتاً بابا کو دل کا دورہ پڑگیا۔'' آفتاب نے تفصیل بتائی۔

وہ دونوں راہداری میں چلتے ہوئے باغ تک آگئے تھے۔ باہر آسمان پر سفید ابر پارے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ ماحول میں رچی بسی تھی۔

"لیکن آفتاب! انکل کے ہارٹ اٹیک کی وجہ کیا صرف یہی ہے؟"

آفتاب ٹھنڈی آہ بھر کر مسکرایا تھا۔ "وجہ! نہیں نقاش وجہ تو کوئی اور ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے کہتے کہتے رکا تھا۔ "نقاش! انسان کا جو ضمیر ہوتا ہے ناں وہ کبھی نہ کبھی ضرور جاگتا ہے انسان کو یہ باور کرانے کے لیے مالک تم نہیں کوئی اور ہے۔ بابا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ افتخار بھائی' نورین' فرحین آپی اور ان کے بھائی رضی کی موت اور بابا کے عزیز ترین ملازم کریم بخش کی موت' امی کی وفات' علی کا ان کی نافرمانی کر کے کسی انگریز عورت سے شادی کر لینا۔ شاہین اور تجل کا نافرمان ہونا' لڑکوں سے دوستیاں کرنا' پراپرٹی کا چھن جانا' بھائیوں کا دشمن بن جانا' بابا کو باور کرا گیا کہ وہ زمینوں کے مالک ضرور ہیں مگر زمین کے' دنیا کے' کائنات کے نہیں۔ انہیں اپنا کیا ہر ظلم یاد آنے لگا۔ ہر ناانصافی ذہن میں ابھرنے لگی۔ وہ نفسیاتی طور پر سفر کرنے لگے اور ان کی ناانصافی اور ظلم کی لسٹ میں سب سے اوپر بھابی کا نام تھا۔ ڈاکٹر ضحیٰ فاطمہ کا۔

اپنی حویلی کی ناک اونچی کرنے کے لیے' اپنے بڑے بیٹے کے عیب کو' اس کے معذور دماغ پر پردہ ڈالنے کے لیے بابا نے ایک مظلوم بے زبان لڑکی پھانسی جو کریم بخش کی بیٹی تھی اور کریم بخش کے لہو میں خون نہیں بابا کا کھلایا نمک دوڑتا تھا لہٰذا یہ شادی ہو گئی۔ بھابی کی قربانی ہو گئی۔ انہوں نے اپنا ہر خواب توڑ دیا۔ میڈیکل کے پیشے کو خیر باد کہہ دیا اور تمام عمر بابا اور اس گھر کی خدمت میں وقف کر دی۔ بیوہ ہونے کے بعد بھی دوبارہ شادی کا مطالبہ نہیں کیا اور بابا کے ضمیر نے ان سے آخر کار لڑائی شروع کر دی ہے۔ ضحیٰ فاطمہ کے نام کی جنگ! پتہ ہے نقاش! میں یہاں بھابی کو لینے آیا ہوں تاکہ بابا اس بے چارے وجود سے معافی مانگ سکیں۔ مجھے بابا نے یہاں بھابی کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔"

آفتاب شاہ اس کے سامنے ہر انکشاف کرتا رہا اور وہ خاموشی سے سنتا رہا کچھ اس طرح جیسے وہ آج سے پہلے کسی چیز سے آشنا نہ ہو۔

وہ ابھی تک اپنے دل کی بات کہنے کے لیے لفظ تراش رہا تھا۔ رات کے کھانے کے لیے سیڑھیاں اترتے ہی اس کی نظر ضحیٰ پر پڑی جو کچن کے دروازے سے لگی سوالیہ آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ گویا وہ بھی بہت بڑے امتحان' بہت بڑی کشمکش سے گزر رہی تھی۔

ڈنر کے بعد ہی اس نے اپنی بات کہنا شروع کر دی تھی۔

"آفتاب! مجھے علم نہیں کہ میں جو بات کہوں گا اس پر تم کس طرح ری ایکٹ کرو گے مگر مجھے اتنا علم ہے کہ میرا مطالبہ اور مانگ ناجائز نہیں۔"

"کیا بات ہے یار! کچھ تو بولو۔" آفتاب پر تجسس لہجے میں بولا۔

"میں تمہاری بھابی ضحیٰ فاطمہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ٹھنڈی سی ایک سانس کے بعد نقاش نے

یہ بات کہہ دی تھی اور آفتاب حیران آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"کیا واقعی یار!" آفتاب کے لہجے میں غیر متوقع اپناپن تھا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔

"تم نے میرا بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا ہے یار! بھابی کی شادی بابا مجھ سے کروانا چاہتے تھے تلافی کے طور پر مگر میں بھابی کو اس سفاک حویلی سے کہیں دور بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے لیے ہمیشہ مقدس رہی ہیں' رہیں گی اور تمہاری شریک سفر بن کر وہ تو بہت خوش رہیں گی۔" آفتاب کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ "مگر!" اچانک اس کا لہجہ بدلا۔ "بھابی سے پوچھنا پڑے گا۔ ان کی مرضی' ان کی خوشی سب سے زیادہ اہم ہے۔"

نقاش نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔

"وہ خود بھی یہی چاہتی ہے۔ اطمینان رکھو۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا اور باقی آفتاب نے سمجھ لیا تھا اور لاؤنج کے پردے کے پیچھے ہلکی اور تیز ہوتی ضحیٰ کی دھڑکنوں کو بھی سمجھ لیا تھا۔

☆

سی سی یو کے ٹھنڈے خنک ماحول میں کئی بیڈ رکھے تھے جن میں سے ایک بیڈ پر سکندر شاہ لیٹے تھے۔ آفتاب شاہ نے ان سے پہلے مل کر بات کر لی تھی جس کے بعد انہوں نے نقاش کو ملنے کے لیے اندر بلایا۔ وہ جب ان کے سامنے آیا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ سکندر شاہ تو نہ تھا جس سے وہ چند روز قبل ملا تھا۔ وہ رعب داب' وہ تن فن کہیں نہ تھی۔ اس بستر پر ٹی وی مانیٹر اور ڈرپس کے درمیان جکڑا ایک کمزور و لاغر' بے بس و بے کس وجود تھا۔ اسے دیکھ کر ان کی پپڑیوں جیسے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ نقاش حسن پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"پتہ ہے نقاش! آج مجھے پہلی بار محسوس ہو رہا ہے کہ میں جاگیردار نہیں بلکہ بیٹی کا باپ ہوں۔" سکندر شاہ نے کہا۔ وہ چپ رہا۔

"میں تمہارا ممنون و مقروض ہوں۔ تم نے میری روح' میرے ضمیر کے بہت بڑے بوجھ کو اتار دیا ہے۔ ضحیٰ فاطمہ تمہیں سونپ کر چاہے میں مر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں ہوگا۔"

"نہیں انکل! آپ کو ابھی اور جینا ہے۔ اپنی باقی اولادوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں۔"

"نقاش! تم سے ایک گزارش کرنا چاہوں گا۔"

"انکل! گزارش نہیں حکم کریں۔" وہ عاجزی سے بولا تھا۔

"وہ یہ کہ تم بارات حویلی میں لاؤ۔ ضحیٰ فاطمہ حویلی سے بیٹی کی طرح دلہن بن کر نکلے۔" سکندر شاہ پرامید آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ایسا ہی ہوگا انکل! آپ جلد صحت یاب ہو کر اپنے گھر آئیں۔ میں اپنے والدین کے ہمراہ آپ

سے آپ کی بیٹی مانگنے آؤں گا اور آپ ہی کی دہلیز سے اس کی رخصتی ہو گی۔'' اس نے نہایت سرخوشی کے عالم میں کہا تھا اور سکندر شاہ مسکرا دیے تھے۔

*

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سحر و افطار جاری تھے۔ انہی دنوں نقاش حسن اپنے امی ابو کے ہمراہ ضحیٰ فاطمہ کا ہاتھ مانگنے جھوک ضامن آیا تھا۔ قدم قدم پر ضحیٰ کی محبت' اس کی دعائیں نگہبان تھیں۔ نہایت خوشگوار ماحول میں سب کچھ طے پایا تھا۔ عید کے اگلے روز رخصتی تھی۔

ضحیٰ کو انتظار تھا اس چاند کے نکلنے کا جس کے اگلے روز اسے اس حویلی سے آزاد ہونا تھا۔

بہار نے میری آنکھوں پہ پھول باندھ دیئے
رہائی پاؤں تو کیسے حصار رنگ میں ہوں

زندگی میں پہلی بار روم روم جھوم رہا تھا۔ انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ خواب اپنی قسمتوں پہ نازاں تھے۔ آنکھیں تعبیروں پہ مطمئن اور پھر وہ چاند نظر آ گیا تھا جس کے آنے کی دعائیں شب قدر اس کے ہونٹوں پر مچلتی رہیں۔ جس کی امید اور ملنے کی آس میں مصلوں پر آنسو بکھرتے رہے۔ شکرانے کے لیے ہونٹ ہر ہر پل جنبش میں ہوتے۔

رخصتی کے وقت سکندر شاہ ایک باپ کی طرح ضحیٰ سے ملا تھا۔ چھلکتی آنکھوں اور شفقت بھری دعاؤں کے ساتھ اور پھر بارات کا یہ قافلہ سادات حویلی کی سفاک دیواروں سے نکل آیا۔

نقاش اپنی گاڑی پر دلہن کے ہمراہ تھا جس کا چاند چہرہ اندھیرے میں بھی جگمگا رہا تھا۔ ہونٹ خاموش تھے کہ کہنے کو کچھ نہ تھا۔ فقط محبت کی باتیں تھیں جن کو کرنے کے لیے آنکھیں ہی کافی تھیں۔ گاڑی ہموار سڑک پر اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ نقاش نے گیئر لگا کر اس کے حنائی ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ ضحیٰ نے چہرہ اٹھا کے اس کے مسکراتے والہانہ محبت کا اظہار کرتے چہرے کو دیکھا تھا اور شرما کے چہرہ شیشے کی طرف پھیر لیا تھا جہاں تیسری تاریخ کا نویلا چاند ان کی گاڑی کی کھڑکی میں جھانک رہا تھا۔ ضحیٰ نے اس پرانے دوست کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور مسکرا کے سوچا تھا۔

وہ چاند بن کے میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی
زمیں پر پاؤں نہیں پڑ رہے تکبر سے
نگارِ شوق کوئی دلہن نئی نویلی ہوئی

* * *

زبیدہ

نیت شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اُتر نہ جائے کہیں
آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

میں زبیدہ ہوں۔ میرے اپنے مجھے زوبی کہہ کے بلاتے ہیں۔ خواب دیکھتی ہوں' مسکراتی ہوں' تتلیوں' جگنوؤں' پھولوں' ستاروں سے پیار کرتی ہوں۔ فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ میری بہت ساری سہیلیاں ہیں۔ میں دوستی نبھانا خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے تحفے دینا اور لینا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں پڑھنے میں بھی اچھی ہوں اس لیے بابا جانی کی لاڈلی بھی قرار پائی ہوں۔ مجھے خوشبوئیں بہت اچھی لگتی ہیں اس لیے میں پرفیومز کی بھی دیوانی ہوں۔ میرے پاس ڈھیر ساری پرفیومز ہیں۔ بلیو

لیڈی' پائیزنس' ایکیوا مرین' گیمبٹ' پوائزن' لومانیہ' رمبا' کرڈینشلز' مسکری' سوشانے' سمد پیلس اور ڈھیر سارے فرنچ پرفیوم بھی ہیں۔ میرے خوشبوئیں لگانے کے شوق کی وجہ سے مجھے میری دوست ثنا ''رفعت سراج کی کستوری'' بھی کہتی ہے۔

میں کپڑے بھی عام لڑکیوں سے ہٹ کر پہنتی ہوں۔ مجھے جینز پہننا اچھا لگتا ہے۔ میری دادی مجھے اکثر روکتی ٹوکتی ہیں لیکن بابا جانی نے مجھے اجازت دے رکھی ہے۔ جینز کے اوپر میں کوئی کرتا یا قمیص پہن لیتی ہوں۔ کالج کے بعد یہ میرا پسندیدہ لباس ہے۔ کالج میں تو وہی گھسی پٹی سفید یونی فارم ہوتی ہے' ایسا لگتا ہے کہ ہزار ہا سفید پوش روحیں اپنے اعمال کا حساب دینے ایک جگہ جمع ہوئی ہوں۔ میرے اس ''ماڈرن'' قسم کے گیٹ اپ کی وجہ سے مجھے میری باجی زوبیہ ''بانو قدسیہ کی سیمی شاہ'' کہتی ہیں۔

مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق بھی ہے' بچپن سے میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ سنو وائٹ' سنڈریلا' ایلس اینڈ ونلڈر لینڈ' ٹارزن' عمرو عیار اور بڑے ہونے کے بعد بہت سارے ادیب' جن میں اشفاق احمد' بانو قدسیہ' مستنصر حسین تارڑ اور ڈھیر ساری رسالوں کی رائٹرز۔ میں ہر ماہ چوری چوری کئی ڈائجسٹ خریدتی ہوں اور چند ہی دنوں میں انہیں پڑھ کے دوستوں میں بانٹ دیتی ہوں۔ آیئے میں اپنے چند دوستوں اور اپنوں سے آپ کا تعارف کرواتی ہوں۔

کالج میں یوں تو بہت سی لڑکیوں سے ہائے ہیلو ہے لیکن میری اچھی دوستیں چار ہیں۔ ثنا' سپان' فرح اور شاوانہ۔ ہم پانچوں کا گروپ پورے کالج میں مشہور ہے۔ ہم شرارتیں بھی کرتے ہیں' لڑتے بھی ہیں' کلاس بھی بنک کرتے ہیں۔ کینٹین والے 'ماموں' سے ہم پانچوں کی اچھی جان پہچان ہے اس لئے ہم اکثر ادھار بھی لیتے ہیں۔

کالج کے قصے تو میں آپ کو سناتی رہوں گی۔ آیئے میں آپ کو اپنے گھر لے چلتی ہوں۔ یہ جو ہماری گلی میں تیسرے نمبر والا بنگلہ ہے ناں...... جس کا گیٹ براؤن کلر کا ہے' یہ ہمارا گھر ہے۔ اس گھر میں ہم سب کوئی چار برس پہلے آئے تھے' اس سے پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے جہاں میرے چچا چچی اور ان کے بچے رہتے ہیں۔ یوں تو مجھے گاؤں بھی پسند ہے لیکن مجھے زیادہ مزہ یہاں آتا ہے' اپنے گھر میں...... اپنی اس جنت میں۔ لیں جی' ہم اپنے گھر میں داخل ہو چکے ہیں۔ انٹرنس کے دروازے کے بعد یہ چھوٹا سا کورٹ یارڈ ہے جس کے دونوں طرف گھاس ہے اور بیچ میں یہ راہداری ہے جس پر بابا نے سفید ٹائل لگوائے ہیں۔ یہاں سے ایک دروازہ گھر کے اندر کھلتا ہے' وہ دیکھیں بالکل سامنے لاؤنج کے صوفے پر میری ماما بیٹھی ہیں۔ فہمیدہ فرخ' میری ماما بہت اچھی ماں ہیں۔ ان کی شادی بہت کم عمر میں ہوئی تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس' اس لیے وہ ہماری ماما نہیں بڑی بہن لگتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماما نے ہم دونوں بہنوں کو اپنے خال وخد دیے ہیں لیکن نہیں' ہم ماما جتنے خوب صورت نہیں۔ وہ تو

''مس زبیدہ فرخ علی! کیا آپ نے کل ہی یہ سوری نہیں کیا تھا؟'' میڈم نے نہایت مودبانہ طریقے سے پوچھا۔ غالباً بے عزتی کرنے کے ارادے سے۔

''جی۔'' میں نے سمجھ لیا کہ شامت آئی ہی آئی۔

''آپ جانتی ہیں کہ آپ نے ایف ایس سی کون سے سبجیکٹ میں رکھا ہے۔'' انہوں نے مزید عزت افزائی کی۔

''جی۔ بائیلوجی۔'' میں نے آرام سے کہا۔

''جی اور آپ بائیو ہی کے پیریڈ میں لیٹ آتی ہیں۔ امتحان میں جب نمبر نہیں ملیں گے ناں تو عقل ٹھکانے آئے گی۔'' تسلیم آفندی کی باریک آواز کی چیں چیں پورے کلاس روم میں گونجنے لگی۔ میں نے معصوم بھرائی آنکھوں سے اپنے گروپ کی چاروں بدتمیز دوستوں کو دیکھا جو منہ پر ہاتھ رکھے چپکے چپکے مسکرائے جا رہی تھیں۔

''آجاتی ہیں اپنے ماں باپ کے پیسے ضائع کرنے۔ چلیں آئیں اندر اور آئندہ اگر لیٹ آئیں تو کلاس سے باہر ہی بیٹھ کر لیکچر سن لیجیے گا۔'' انہوں نے جتنی عزت افزائی کی' وہ کلاس کی ساٹھ لڑکیوں کے سامنے بے عزتی کے لیے کافی تھی۔ اب انہوں نے اندر بلایا اور میری جگری دوستوں نے میرے لیے سیٹ خالی کی۔ ثناء تھوڑا سا سرک گئی اور میرے لیے جگہ بنائی۔

خیر کلاس تو جیسے تیسے لے لی۔ تسلیم آفندی کی چیں چیں کچھ بھی سمجھانے سے قاصر تھی البتہ ان کے چہرے کے بدلتے زاویے قابلِ غور تھے۔ ان کی ننھی سی چندھیائی ہوئی آنکھیں کبھی کھلتیں تو کبھی بند ہو جاتیں۔ ان کے سیاہ پھٹے پھٹے ہونٹ متواتر حرکت میں رہتے' البتہ وہ کیا کہنے یا سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں' یہ ہم میں سے آج تک کوئی اندازہ بھی نہیں لگا پایا۔ ہاں البتہ کبھی کبھار بورڈ پر جو بے چارے مینڈک کا ڈائجسٹو سسٹم یا پھر ری پروڈکٹری سسٹم بنا دیتیں تو ہم کچھ کچھ اندازے لگا لیتے تھے۔

کلاس ختم ہونے کے بعد دوسری کلاس مس زہرہ منیر کی تھی جن کی اردو سننے کا فی الحال ہم پانچوں کا کوئی موڈ نہ تھا اسی لیے ہم اچھے بچوں کی طرح ان کے آنے سے پہلے ہی نکل آئے اور پیچھے لگے نیم کے درختوں کے نیچے بیٹھ کے گپیں لڑانے لگے۔

بائیلوجی کے پیریڈ میں ہم کچھ سمجھیں نہ سمجھیں' زولوجی کے پریکٹیکل بڑے مزیدار ہوتے تھے۔ ویکس ٹرے کے اوپر موٹا سا بے ہوش مینڈک رکھنا' اسے الٹا لٹا کر اس کے ہاتھ اور پاؤں کو پن سے بند کر لینا۔ اس کے کھلے ڈلے جسم میں ڈائسکشن باکس سے نکلی چھری سے کٹ لگانا۔ پہلے اس کی موٹی اسکن کاٹنا' پھر قینچی سے اسے مزید کھولنا' اسے کھولتے ہی ہزاروں چھوٹی موٹی چیزوں کو پانا' سانس لینے والے چند ریسپائریٹری آرگنز' اس کالیور' کڈنی نما چیز ان سب کو دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔

پریکٹیکل ختم ہونے کے بعد ہم اکثر لائبریری جایا کرتے تھے۔ ہمارے کالج کی لائبریری بہت اچھی تھی۔ ہم پانچوں کی چوائس قدرے مختلف تھی اس لیے ہم پانچوں کتابوں میں بھی مختلف ٹاپکس پڑھتے تھے۔ ثنا اور شاوانہ انگلش لٹریچر پڑھتیں' سپنا کو اپنی ضرورت کی یعنی بائیو کی بکس درکار ہوتیں۔ فرح فیملی میگزین کے پیچھے ہوتی اور میں...... آپ تو جانتے ہی ہیں' ناولوں کے پیچھے۔ آج بھی میں اردو ناولز والی روم میں سے کوئی اچھی سی کتاب دیکھ رہی تھی کہ سراحد میرے پاس آئے۔ اب آپ سوچیں گے کہ سراحد کون ہیں؟

سراحد ہماری لائبریری کے انچارج ہیں۔ کبھی کبھار پیریڈ بھی لے لیتے ہیں لیکن زیادہ تر وہ لائبریری میں ہی رہتے ہیں۔ لمبا سا سراپا' براؤن سلکی بال' کشادہ پیشانی' گہری سبز آنکھیں اور دل کو چرا لینے والی مسکراہٹ۔ وہ مجھے بہت اچھے لگتے۔ وہ جب میری طرف دیکھتے ہیں تو دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ آنکھیں اٹھائے نہیں اٹھتیں۔ سانس پھولنے لگتی۔ فرح اور ثنا تو کہتی ہیں کہ مجھے ان سے محبت ہے لیکن میں ابھی یہ دعوا نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ محبت جاننے پہچاننے سے ہوتی ہے' صرف نظر بھر کر دیکھنے سے نہیں اور پھر کیا پتہ سراحد کے دل میں ویسے خیال نہ ہوں۔ کیا پتہ کہ یہ پسندیدگی یک طرفہ ہو لیکن یہ تو طے ہے کہ وہ میری آنکھوں اور دل کو اچھے لگتے ہیں۔ میری آنکھیں انہیں دیکھنا چاہتی ہیں اور دل ان سے باتیں کرنا۔ یہ احساس زندگی میں مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

''زبیدہ! کون سی کتاب چاہیے آپ کو' میں کچھ مدد کروں؟'' وہ ہمیشہ کی طرح بڑے اعتماد سے بولے۔ میرے پاؤں میں کپکپاہٹ شروع ہوگئی۔ دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''سر! وہ...... مجھے...... ناول۔'' میں نے چار ٹوٹے پھوٹے لفظ ادا کیے۔

''ناول۔ کون سا چاہیے؟'' وہ اب کتابوں کی قطار میں سے کچھ ڈھونڈنے لگے۔

''کوئی بھی۔''

''ہوں۔ کیا آپ نے مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول پڑھا ہے' پیار کا پہلا شہر۔'' انہوں نے ایک کتاب ریک میں سے نکالی۔ میں نے گردن نفی میں ہلائی۔

''پڑھیے گا۔ بہت نازک جذبات میں لکھا ہے مصنف نے یہ ناول۔ یقیناً اس عمر میں ایسے ناولز دل کو بہت بھلے لگتے ہیں۔'' انہوں نے وہ ناول مجھے دیا اور جانے لگے۔ میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ جاتے جاتے مڑے۔

''زبیدہ۔'' میں نے ان کی جانب دیکھا۔

''آپ نے خوشبو بہت اچھی لگائی ہے۔'' انہوں نے مسکرا کے کہا۔ ''سانسوں کو معطر کرنے والی۔''

یہ کہہ کے وہ چلے گئے اور میں جھوم اٹھی' میرا روم روم معطر ہوگیا۔

*

''پلکوں کی چلمن پہ
اچھے خواب سجائے وہ
میں اس کو کیسے یہ کہوں
کہ خوابوں میں آئے وہ''

''بیہ' یہ دیکھو میں نے اپنی زندگی کا پہلا شعر کہا ہے۔ پڑھو ناں اس کو۔'' ڈریسنگ ٹیبل پہ بیٹھی بیہ اپنی پونی ٹیلز بنانے میں مشغول تھی۔

''چھوڑو ناں زوبی! مجھے کام کرنے دو' دیکھا ہے دن بھر مجھے فرصت ملتی ہی نہیں اور ابھی مجھے ڈنر بھی بنانا ہے۔'' بیہ باجی نے صاف منع کر دیا۔

''افوہ باجی...... بس ایک نظر۔'' میں نے ابھی اپنی معصوم التجا سے انہیں منانے کی کوشش کی ہی تھی کہ خاور بھائی کمرے میں آئے۔

''زوبیہ باجی۔ آپ کو ماما بلا رہی ہیں۔'' خاور بھائی کے کہنے پر بیہ باجی فوراً ہی اٹھیں' میں نے اپنی ڈائری خاور بھائی سے چھپائی۔

''اے چھپکلی! کیا چھپا رہی ہو مجھ سے؟'' خاور بھائی مجھے اس طرح کے نام دیتے رہتے تھے' کبھی چھپکلی تو کبھی مینڈکی' کبھی بندریا اور بدلے میں' میں بھی انہیں قطعاً بخشتی نہ تھی۔

''اے کاکروچ! مجھے اس طرح چھپکلی نہ کہا کرو۔''

''شرم نہیں آتی۔ میں تم سے چھ سال بڑا ہوں۔ دکھاؤ کیا چھپا رہی ہو؟'' انہوں نے میری ڈائری جھپٹنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔

''دیکھو بھائی! میں بابا کو بتا دوں گی۔ بابا! دیکھیں ناں خاور بھائی مجھے تنگ کر رہے ہیں۔'' میں نے شور مچا دیا۔

''چیخ لو' چیخ لو' بابا تو دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔'' خاور بھائی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''ماما!'' میں نے اور زور سے چیخ ماری۔ یہ تو خدا کا شکر تھا کہ خاور بھائی کے سیل فون پر گھنٹی بجی' ورنہ وہ میری ڈائری چھین کے دم لیتے۔ میں کمرے سے دوڑ کے نکلی اور ماما کی تلاش شروع کر دی۔ یہ جاننے کے لیے کہ انہوں نے بیہ باجی کو کیوں بلایا تھا۔ ابھی میں ماما کے کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ مجھے بیہ باجی کی آواز آئی۔

ابھی تک اتنی پیاری لگتی ہیں۔ ماما کے ساتھ ہماری بہت پرانی کام والی زہرہ بھی بیٹھی ہے۔ زہرہ خالہ فرش پر بیٹھی پالک کے ساتھ کھیلنے' مطلب کاٹنے میں مشغول ہیں۔

لاؤنج کی بائیں طرف ڈرائنگ روم ہے جو کہ ماما کے سلیقے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یلو اور بلیو ٹائلز والا اوپن کچن میری باجی زوبیہ کی پسند سے بنا تھا۔ آخر انہی کو تو الگ الگ تجربے کرنے ہوتے ہیں کچن میں۔ کبھی مچھلی کے کوفتے بن رہے ہوتے ہیں تو کبھی مونگ کی دال کا حلوہ...... کبھی برگر بن رہے ہوتے ہیں تو کبھی چائنیز۔

امی سے تو آپ مل لیے۔ آئیں دادی کے کمرے میں چلتے ہیں۔ لاؤنج کے بائیں طرف دو بیڈ رومز ہیں' ایک دادی کا اور دوسرا میرے بڑے بھائی خاور کا۔ خاور بھائی تو یونی ورسٹی گئے ہوئے ہیں لیکن دادی کمرے میں موجود ہیں۔ غالباً تلاوت میں مصروف ہیں چلیں آئیں دادو کو تنگ کرتے ہیں۔

''دادو۔'' میں نے دوڑ کے دادی کے گلے میں باہیں ڈالیں۔

''ارے زبیدہ بیٹی! آ گئیں کالج سے۔'' دادی نے حسبِ سابق وہی جملہ بولا۔

''دادو۔ مجھے زبیدہ نہ بلایا کریں۔ میں اپنے آپ کو آپ کی عمر کا محسوس کرنے لگتی ہوں دادو۔ مجھے زوبی کہا کریں۔'' میں نے نخرے سے کہا۔

''اے کیوں' اچھا خاصا نام رکھا تھا میں نے اپنی والدہ کا۔ میرا تو دل کرتا ہے کہ تمہیں ماں جی کہہ کے بلاؤں۔'' دادی نے مسکرا کے کہا۔ آپ کو پتہ ہے میری دادی بھی بہت شرارتی ہیں بلکہ شاید شرارت ہمیں انہی سے ورثے میں ملی ہے۔ دادی اور ماما کی آپس میں بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ دونوں سہیلیاں ہیں گویا۔ دونوں میں کبھی نوک جھوک نہیں ہوئی۔ دادی سے تو آپ مل لیے' آئیں میں آپ کو بیہ باجی سے ملواتی ہوں۔ میری بڑی بہن اور پیاری سی دوست۔ زوبیہ باجی' جسے میں بیہ باجی کہتی ہوں۔

لاؤنج میں سے اوپر جانے والی سیڑھیاں اوپر کے پورشن کو نیچے سے ملاتی ہیں۔ اوپر تین کمرے ہیں۔ ایک گیسٹ روم جو کہ شاذ و نادر ہی کھلتا ہے۔ ایک ماما' بابا کا کمرہ اور کونے والا کمرہ میرا اور بیہ باجی کا ہے۔ ہے تو یہ ہمارا مشترکہ روم لیکن گویا انڈیا اور پاکستان کا بارڈر ہے۔ بیہ باجی اور میرا مزاج بہت مختلف ہے اس لیے تو ہمارا کمرہ دو الگ مخلوقات کی پناہ گاہ ہے۔ دو سنگل بیڈز ہیں' میں نے اپنے بیڈ پر جو بیڈ شیٹ بچھائی ہے وہ ڈارک بلیو کلر کی ہے' اوپر پیلے رنگ کی تتلیاں بنی ہیں۔ بیہ باجی کے بیڈ پر بچھی چادر پنک کلر جس پر ہلکے میرون اسٹرائپ ہیں' بچھی ہے۔ درمیان کی سائیڈ ٹیبل بارڈر کا کام دیتی ہے۔ میرے بیڈ کی پرلی طرف ایشوریا رائے' ریتک روشن اور لیو نارڈو ڈی کیپریو کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہیں اور بک شیلف میں میری کتابیں رکھی ہیں اور بیہ باجی کے بیڈ کے اوپر مدر ٹریسا اور

''لیکن ماما' آخر ان لوگوں کو نکاح کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیا منگنی سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔ آپ' بابا سے بات تو کر کے دیکھیں۔''

''کوئی فائدہ نہیں تمہارے بابا سے بات کرنے کا۔ جانتی تو ہو تم کہ وہ اپنے بھائی پہ کس طرح جان نچھاور کرتے ہیں۔ ان کے سامنے میری اور تمہاری کسی کی کوئی اہمیت نہیں اور پھر ان کا کہنا ہے کہ اب تم نے گریجویشن بھی مکمل کر لیا ہے' تمہاری شادی کی عمر بھی ہے۔'' ماما کا لہجہ خاصا الجھا الجھا تھا۔

''لیکن ماما! میں اپنی آرٹ گیلری کھولنا چاہتی ہوں۔ سالوں سے جمع کی اپنی پینٹنگز کی نمائش کرنا چاہتی ہوں۔ ان پیسوں سے ایک ٹرسٹ قائم کرنا چاہتی ہوں۔'' بیہ باجی کی آواز روہانسی تھی' شاید وہ رو رہی تھیں۔

''ماما! میں نے شادی سے انکار تو نہیں کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس سے میری شادی ہو رہی ہے وہ ان پڑھ ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی طرح چھوٹا سا ذہن رکھتا ہے۔ میں نے اُف بھی نہ کی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرے کوئی ارمان نہیں۔''

''میں صدقے تیرے ارمانوں کے میری بچی! لیکن میں کیا کروں' میں مجبور ہوں' تیری دادی اور تیرے بابا کے فیصلے کے آگے میں مجبور ہوں۔ کتنے ارمان ہوتے ہیں ہر انسان کو اپنے بچوں کی شادی کرنے کے۔ پتہ نہیں تیرے بابا کو اس ان پڑھ' گنوار لڑکے میں کیا نظر آیا جو اپنی ہیرے جیسی بیٹی انہیں دے دی۔ میں کیا کروں میری چندا' میں کیا کروں؟'' ماما کتنی بے بسی سے بیہ باجی کو گلے سے لگا کے رو رہی تھیں۔ میرے اپنے بھی آنسو نکل آئے تھے۔ اگر میں بیہ باجی کی جگہ ہوتی تو

خوابوں کا قتل کر پاتی......؟

خواہشوں کی لاشیں گرا پاتی......؟

سپنوں کو کھنڈر بنا سکتی......؟

نہیں' نہیں۔ میں بیہ جتنی بہادر نہیں۔ اسی طرح کی چند اور باتوں کے بعد بیہ باجی باہر نکلیں اور مجھے دروازے کے پاس دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ پھر اپنی آنکھیں پونچھ کر خود کو سنبھال کر بولیں۔

''چل لا۔ اپنی شاعری دکھا۔''

لیکن ان کی طرح مسکرانے کی شاید مجھ میں سکت نہ تھی اس لیے میں ان کے گلے سے لگ کر دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

''بیہ باجی! ایک بات کہوں؟'' رات کو سونے سے پہلے میں نے بیہ کو مخاطب کیا جو کہ اپنے بیڈ کی چادر درست کر رہی تھیں۔ انہوں نے گردن اثبات میں ہلائی۔ وہ آج شام سے ہی گم صم تھیں۔ ایسا ہی ہوتا تھا جب بھی ان کی شادی سے متعلق کوئی بات ہوتی' وہ بکھر کے رہ جاتیں۔ منگنی کے دن ایک تجی

پرنسس ڈیانا کی تصاویر آویزاں ہیں اور ایک عدد انہی کے ہاتھوں سے بنی آئل پینٹنگ۔ وہ بہت اچھی پینٹنگ کرتی ہیں۔ فائن آرٹس گریجویٹ ہیں۔ ڈریسنگ ٹیبل مشترکہ ہونے کے باوجود بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف میرے پرفیومز کا ڈھیر ہے تو دوسری طرف بیہ کے کیوٹکس اور ڈھیر سارے ہیئر بینڈز کا قافلہ۔ جی ہاں' بیہ باجی اپنے کمر سے نیچے ڈھلکنے والے بالوں کو انہی رنگ برنگی بینڈز میں بند کر کے رکھتی ہیں' ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ بینڈ۔ ایک سو اٹھارہ ہیئر بینڈز موجود ہیں ان کے پاس۔

بیہ باجی کمرے میں موجود نہیں۔ وہ اپنی اکلوتی سہیلی حنا کے ساتھ کہیں باہر گئی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے بیہ باجی کی منگنی ہمارے چچا کے بیٹے سہیل سے ہو چکی ہے' تب جب باجی فرسٹ ایئر میں تھیں۔ سہیل نے صرف دس جماعتیں پڑھی ہیں اور اپنے باپ دادا کی زمینیں سنبھالتا ہے۔ بیہ باجی اس رشتے سے کبھی خوش نہ تھیں لیکن بابا کی خوشی کی آگے سب ہار گئے۔ ماما بھی جو کہ کسی صورت سہیل کو پسند نہ کرتیں۔

بیچاری بیہ...... وہ کہتی تو ہے کہ وہ خوابوں پر ایمان نہیں رکھتی لیکن آخر ہے تو لڑکی ناں...... اور لڑکیاں تو خواب تب ہی اوڑھ لیتی ہیں جب آنچل اوڑھتی ہیں۔

ہمارے بابا یوں تو بہت اچھے ہیں لیکن اپنے اکلوتے بھائی یعنی ہمارے چچا سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ہم سب سے بھی زیادہ۔ تبھی تو اپنی تمام زمینیں اور اپنی بڑی بیٹی جو کہ لائق تھی' پڑھی لکھی تھی' خوب صورت تھی' ایک ان پڑھ شخص کو دے دی۔

چلیں چھوڑیں۔ یہ کچھ غم ہماری فیملی کے پوشیدہ غم ہیں۔ انہیں نہ ہی کریدیں تو اچھا ہے۔

آپ میری فیملی سے تو مل لیے۔ اب کیا آپ میری اس چھوٹی سی دنیا کا حصہ بننا چاہیں گے......؟؟

❋

''زوبی...... زوبی اٹھ جاؤ' باہر کا دروازہ بند کرلو۔ میں واک کے لیے جا رہی ہوں۔'' زوبیہ باجی میری چادر کھینچے جا رہی تھیں۔

''کیا ہے بیہ باجی' کیوں اٹھا رہی ہو؟'' مجھے اور کچھ پیارا ہو نہ ہو' نیند بہت پیاری تھی۔

''اٹھو...... مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' بیہ باجی نے گھسیٹ گھسیٹ کر آخر چادر کو کھینچ ہی لیا اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ بیہ باجی کو اسمارٹ رہنے کا جنون تھا اور پچھلے تین سالوں سے ان کی روزانہ کی یہ روٹین تھی۔ واک پر جانا اور مجھے اسی طرح اٹھانا۔ بیہ باجی کو دروازے تک چھوڑ کے میں ابھی اوپر آنے کا اور دوبارہ سونے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دادو کی آواز نے میرے کانوں میں نقارے بجائے۔

''زبیدہ بیٹی! نمازِ فجر ادا کی ہے؟''

''دادو' کل پڑھ لوں گی۔'' مجھ پر میری معصوم نیند نے جو دھاوا بولا تھا۔

''نہیں بیٹا! نماز نیند سے بہتر ہے۔ سنا نہیں تم نے الصلوٰۃ خیر من النوم۔ کتنی مٹھاس ہوتی ہے اس آواز میں۔'' دادی نے پھر کوئی نیا لیکچر دینا چاہا اس لیے مجھے ان کے کمرے میں جا کے وضو کرنا پڑا۔ ابھی میں دوپٹہ باندھ کے جائے نماز پہ کھڑی ہی ہوئی تھی کہ انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔

''اے ہے' یہ کیا۔ تم پتلون پہنے نماز پڑھوگی۔'' انہوں نے میرے اتنے مہنگے سلیپنگ سوٹ کی گویا توہین کی۔

''دادو! یہ پتلون نہیں ٹراؤزر شرٹ ہے جو کہ ماما نے مجھے دلوائی تھی اور اس میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' میں نے ان کا جواب سننے سے پہلے نماز کی نیت باندھ لی لیکن ان کا جواب کون سا رکتا۔ وہ تو اسی رفتار سے بول رہی تھیں۔

''ہائے ہائے۔ ایک ہمارا زمانہ تھا' شلوار اتنی نیچے ہو کہ پنڈلیاں نظر نہ آئیں۔ دوپٹہ ایسا اوڑھا ہو کہ جسم کا احساس نہ ہو اور ایک یہ ہیں آج کل کی لڑکیاں...... ٹانگوں کو لفافوں میں بند رکھتی ہیں' جینز اور نہ جانے کیسی کیسی پتلونیں...... تیرے دادا ابا ہوتے تو شرم سے ڈوب جاتے۔'' دادی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔

نماز ادا کرنے کے بعد میں اٹھی۔ ابھی میں دوبارہ موڈ بنانے لگی تھی سونے کا اور سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے کا رخ کیا ہی تھا کہ بابا نے آواز دی۔

''زوبی...... زبیدہ بیٹی! ذرا مجھے اخبار کی سرخیاں پڑھ کے سناؤ۔ آج زوبیہ شاید لیٹ ہو گئی ہے۔'' بابا کی عادت تھی کہ وہ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کے ناشتا بھی کرتے تھے اور بیہ باجی سے اخبار بھی سنتے تھے۔ اب بابا جان کو تو میں ٹال نہیں سکتی تھی اس لیے بادل نخواستہ میں ڈائنگ ٹیبل تک گئی اور بابا کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بابا! آپ اتنی جلدی ناشتا کیوں کرتے ہیں؟ ابھی تو سورج بھی بمشکل نکلا ہوگا۔'' میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''بیٹا! اللہ تعالیٰ نے جو نظامِ کائنات بنایا ہے ناں' اسی کے مطابق چلنے میں انسان کی کامیابی ہے۔ جلدی رات کا کھانا کھا کے' نماز ادا کرنا' پھر دس بجے تک سو جانا اور نمازِ فجر کے وقت اٹھ جانا۔ میری بات مانو' تم بھی زوبیہ کے ساتھ واک پہ چلی جایا کرو۔'' بابا بریڈ پہ مکھن لگاتے ہوئے بولے۔ ساتھ میں ماما بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''ان صاحبہ کو سونے سے فرصت کہاں۔ رات کو بارہ بجے تک ڈائجسٹ پڑھتی ہیں اور صبح کالج جانے سے پندرہ منٹ پہلے جاگتی ہیں۔'' ماما نے اپنے ننھے سے چشمے کے اوپر سے مجھے دیکھا' کچھ کچھ

شکایتاً کچھ کچھ پیار سے۔

''ماما!'' میں نے لاڈ سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا! یہ عمر ہی تو ہوتی ہے نیند کے مزے لوٹنے کی۔'' بابا نے ہمیشہ کی طرح میری سائیڈ لی اور میں نے ان کا پسندیدہ کام یعنی اخبار کی سرخیاں پڑھنا شروع کر دیں۔ دنیا بھر کی پھیلتی ہوئی بیماریوں کے قصے' دو چار قتل' چار چھ لوگوں کے اغوا' چند روڈ ایکسیڈنٹ' یہ خبریں بابا بڑے غور سے سنتے۔ میں روانی سے سرخیاں پڑھتے پڑھتے رک گئی۔

''بابا! میری ایک بات مانیں۔ آپ یہ فضول قسم کی خبروں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ڈائجسٹ مجھ سے پڑھوایا کریں۔ قسم سے بڑا مزہ آتا ہے۔ ایسے جیسے کہ آپ فلم دیکھ رہے ہوں۔ ایک ہیروئن ہوتی ہے' ہیرو ہوتا ہے' پہلے دونوں کالج میں لڑتے جھگڑتے ہیں پھر محبت ہو جاتی ہے۔ رومینٹک باتیں ہوتی ہیں' ماں باپ ٹانگ اڑاتے ہیں' شادیاں کہیں اور ہوتی ہیں' وہ مر جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ خبریں تو روزانہ ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔''

''میرا خیال ہے اب آپ نے بہت سرخیاں پڑھ لیں' آٹھ بجنے والے ہیں جا کے کالج کی تیاری کریں۔'' ماما نے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔

''لیکن ماما! میں پہلے ناشتا کروں گی۔'' میں نے منہ بسورا۔

''زوبی! مجھے پتہ ہے تم نے برش نہیں کیا۔'' ماما نے ہمیشہ کی طرح ٹوکا۔

''کیسے کرتی ماما! مرغوں کے جاگنے کے وقت مجھے بیبا باجی نے اٹھا دیا۔ کمرے میں آنے ہی والی تھی کہ دادو نے بلا لیا۔ وہاں سے سیدھی کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ بابا نے آواز دی۔ برش کرنے کا موقع دیا آپ لوگوں نے؟'' میرے مظلوم قصوں پر پاپا اور ماما دونوں مسکرا دیئے۔

''اچھا جاؤ' جا کے تیار ہو جاؤ۔ واپس ٹیبل پر آنا ناشتے کے لیے اور ہاں' ڈائجسٹ پڑھنا کم کرو' امتحان سر پر ہیں۔'' ماما نے تنبیہ کی۔ میں چپ چاپ شکلیں بناتی کرسی سے اٹھی۔

☆

''مے آئی کم ان میڈم!'' میں نے مسکرا کے بڑے ادب سے کہا۔

''نو'' اتنے ہی ادب سے مس تسلیم آفندی نے جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں میڈم کے پیریڈ جو کہ بدقسمتی سے پہلا ہوتا ہے' میں صرف پندرہ منٹ لیٹ تھی' اور وہ بھی اس نگوڑے آصف کی وجہ سے' جسے بابا نے نیا ہی ڈرائیور رکھا تھا اور جسے اپنی نئی نویلی بیوی کی زلفوں تلے رہنے سے دن چڑھے کا پتہ ہی نہیں لگتا اور روزانہ لیٹ آتا۔

''آئی ایم سوری میڈم...... میں آئندہ کبھی لیٹ نہیں ہوں گی۔'' میں نے معصوم سی شکل بنائی۔

کر لے۔ آخر کوئی چیز تو اس کے ضبط کو توڑ پائے گی۔'' میرے اگلے سوال پر سراحد کی مسکراہٹ بہت گہری ہو گئی۔

''زبیدہ! محبت کسی کو کسی سے کروائی نہیں جاتی' یہ کوئی مائیکرو چپ یا پھر موبائل سم نہیں کہ مشین میں لگائی اور مشین چل پڑی۔ یہ جو محبت نامی چیز ہے ناں یہ کسی کی ہدایت کی محتاج نہیں۔ یہ دلوں میں خود ہی اگ آتی ہے۔ خودرو پودوں کی طرح' جو بارش برستے ہی خود بخود زمین سے پھوٹ آتے ہیں' بنا کسی بیج کے' بنا کسی جڑ کے' وہ بس ہو جاتے ہیں۔ محبت بھی اسی طرح ہو جاتی ہے۔'' سراحد کے چہرے پر اس طلسماتی شے 'محبت' کا عکس لہرا گیا۔ وہ عکس جسے میں ان سے چھپائے پھرتی تھی۔

''آپ محبت کے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے جانتے ہیں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس کے بارے میں تفصیل پھر کبھی بتاؤں گا۔ ابھی مجھے کلاس لینے جانا ہے۔ تم نے باتوں میں لگا دیا' ویسے زبیدہ! تمہاری باتوں اور تمہاری آنکھوں کے اندر ایک بہت گہری لڑکی ہے جس سے ملنا اور بات کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔'' سراحد یہ کہہ کے اٹھے اور میری آنکھوں میں ہزاروں خواب سجا گئے۔ مجھے یہ جان کر اچھا لگا کہ میں انہیں اچھی لگتی ہوں۔

میں گھر آئی تو پتہ چلا کہ کل ہم گاؤں جا رہے ہیں' سہیل کی بہن وسیمہ کی شادی اٹینڈ کرنے۔ ماما سے مختصراً ابھی پتہ چل سکا۔ کیوں کہ ماما گاؤں جانے کے زیادہ حق میں نہ ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کا ہماری چچی یا پھر اپنی نندوں سے کوئی اختلاف تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ماما وہاں کے ماحول کو دیکھ کے اپنی بیٹی کے مستقبل کا سوچ کے اداس ہو جاتی تھیں اور اکثر وہاں سے بیمار ہو کے آتیں۔ یہ بات قابل غور تھی کہ بیبا اور ماما کا رشتہ ماں اور بیٹی سے زیادہ دوستوں جیسا تھا۔ ماما بھی زوبیہ کو دوست سمجھتی آئیں۔ ابھی تک دونوں اکٹھے شاپنگ پہ جاتی ہیں۔ کپڑے سلیکٹ کرنا' ان کے ڈیزائن سوچنا' جوتوں کی ورائٹیز دیکھنا' گھر سجانا' نئے نئے کھانوں کی ترکیبیں نکالنا' دونوں ماں اور بیٹی کم' دوست زیادہ لگتی ہیں۔

ماما مجھے مزید کوئی تفصیل بتانے کے موڈ میں نہ تھیں اس لیے میں دادی کے پاس آ گئی۔ بیبا بھی کہیں باہر تھی' دادی ہمیشہ کی طرح گاؤں جانے کی تیاری بڑے جوش و خروش سے کرتی تھیں۔ اپنے شوہر کے گھر جانے میں انہیں بڑا سکون ملتا تھا۔ ہمارے ساتھ رہنے کی وجہ صرف خاور بھائی تھے کہ جن کو دادو نے پالا تھا اور جن کے بغیر وہ رہ نہیں سکتیں اور پھر دوسری وجہ میری چچی کہ جن سے دادو کی کم ہی بنتی تھی حالانکہ وہ دادو کی بھانجی تھیں اور ماما غیروں میں سے' لیکن یہ تو تربیت پر منحصر ہوتا ہے ناں۔

ابھی بھی دادی اپنے چھوٹے سے بیگ میں اپنی مختصر چیزیں ڈالنے میں مشغول تھیں۔ میں ان کے پاس جا کے بیٹھ گئی۔

''زبیدہ بیٹا! تم نے کر لی اپنی تیاری؟'' وہ مجھے دیکھ کے پیار سے بولیں۔

''نہیں دادو! مجھے تو ابھی ابھی ماما نے بتایا اور ویسے بھی بیہ آئے گی تو میرے کپڑے بھی پیک کر لے گی۔'' میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ فہمیدہ بھی ناں۔ اتنے سال اس نے وہیں گزارے لیکن ابھی تک وہاں جانے سے اس کا منہ بن جاتا ہے۔ آج بتا رہی ہے وہ تم کو۔ ارے پچھلے دو ہفتوں سے شادی کی تاریخ طے کی تھی اور تم یہ ہر بات زوبیہ پر کیوں چھوڑتی ہو' بیٹا! ابھی چند ہی ماہ میں اس کی شادی ہو جائے گی پھر تو خود ہی کرو گی ناں۔ چلو اپنا سامان خود پیک کرو۔'' دادو نے بیک وقت ماما اور مجھ سے شکایت ظاہر کی۔

''دادو! آپ لوگوں کو بیہ کی شادی کی اتنی جلدی کیوں ہے؟ دادو آپ نے کسی بھی بات کے بارے میں بیہ سے پوچھا ہے؟'' میں نے بات کا پہلو بدلا تو دادی نے میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

''کیوں؟ کیا بات پوچھیں ہم اس سے۔ دیکھ بھال کے ہم نے اس کی منگنی اپنے بچے سے کی ہے۔ اپنے گھر کی لڑکی گھر میں ہی رہے گی اور پھر اس کی منگنی کو تیسرا سال ہونے کو آیا۔ ابھی اگر اس کی شادی کر دی تو کیا برا ہو گا۔'' دادی قدرے سخت لہجے میں بولیں۔

''دادو! اچھے برے کی بات نہیں' لڑکی کی رائے جاننے کا حق ہمارے دین نے بھی دیا ہے۔'' میں نے ٹھوس وجہ بتانی چاہی۔

''زبیدہ! اب تم ہمیں دین کی باتیں سکھاؤ گی۔ تمہیں قرآن' نماز بھی میں نے ہی سکھائی ہے۔ زوبیہ کوئی بچی نہیں کو کچھ سمجھ نہ پائے۔ اس نے خود آمادگی ظاہر کی تھی سہیل کے لیے۔'' دادو بہت غصے میں بولیں۔

''وہ تو اس گائے کی طرح ہے کہ جس کی ناک میں نکیل ڈال کے کوئی کہیں بھی گھسیٹ کے لی جائے۔ بے زبان لڑکی!'' میں نے زوبیہ پہ غصہ نکالا۔

''لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں زبیدہ بی بی! اپنے خاوند خود پسند کرنے والیاں لڑکیاں نہیں کہلاتیں۔ یہ بے زبانی ہم نے اپنی اولاد کو دی ہے اور ہمیں ہماری ماؤں نے۔'' دادو کا لہجہ فخر سے تنا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سے اٹھنا ہی مناسب سمجھا کہ دادو سے بحث فضول تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر قائم تھیں' ان کے لیے میرے خیالات کوئی معنی نہیں رکھتے تھے اور پھر اس کے لیے کون سے رکھتے ہیں' جس کے لیے میں لڑے جا رہی تھی۔ وہ تو واقعی بے زبان ہے۔ اس کی ناک میں نکیل ڈالی جا چکی تھی اور اسے گھسیٹا بھی جا رہا تھا مگر وہ تو بے زبان تھی' گونگی تھی وہ۔

زوبیہ باجی گھر آئیں تو ڈھیر سارے شاپرز ساتھ تھے۔ پتہ چلا کہ شادی پہ پہننے والے کپڑوں کی

شاپنگ کر کے آئی ہیں۔ میرے اور اپنے لیے لہنگے' میچنگ جیولری' چوڑیاں۔ درزی سے ماما اور دادو کے کپڑے بھی لے آئیں اور دلہن یعنی وسیمہ کے لیے تحائف بھی۔ دادو تو اسے اپنا ٹیکا جھومر دے رہی تھیں' ماما نے ایک انگوٹھی بنوائی تھی اور ہم تینوں کی طرف سے اس کے لیے چھوٹے موٹے تحائف تھے۔

بیہ ساری چیزیں اپنے سوٹ کیس میں پیک کر رہی تھیں کہ اسی وقت انہیں ماما نے آواز دی۔ غالباً ڈنر بنانے کا ٹائم ہو چکا تھا اور انہیں اپنی ڈیوٹی نبھانی تھی۔

''زوبی پلیز' ایک کام کر دو۔ یہ بقایا سامان ذرا سلیقے سے پیک کر دو گی' اس سوٹ کیس میں۔ میں ذرا چاول بنا لوں۔'' بیہ کی التجا پہ میں نے ہامی بھر لی اور ان کے جانے کے بعد بقایا سامان پیک کرنے لگی۔ کپڑے' جوتے' میک اپ کا سامان' بیہ کتنی سلیقہ مند تھی اس کا اندازہ صرف اس کی پیکنگ دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے۔ جوتوں کے چار جوڑے شاپرز کے ساتھ کونے میں رکھے گئے تھے' اوپر کپڑے سلیقے سے تہہ کر کے' میک اپ کا سامان پاکٹ میں اور ٹوٹنے والی چیزیں تولیے میں لپیٹ کے رکھی تھیں۔ میں ابھی کارپٹ پر رکھا باقی سامان اٹھا کے رکھ ہی رہی تھی کہ ایک کالی جلد والی ڈائری میری گود میں گر گئی۔ اچانک میری توجہ اس ڈائری کی جانب چلی گئی۔ یہ ڈائری بیہ روزانہ سونے سے پہلے بیٹھ کے لکھتی تھیں لیکن وہ کیا لکھتی تھیں' اس کا مجھے علم نہ تھا۔ بیہ بہت گہری تھیں' ایک ایسے شجر کی طرح کہ جو بظاہر تو اپنی تمام شاخوں سے سورج کی روشنی کو راستہ دے رہا ہو لیکن اس میں کتنے گھونسلے ہیں' یہ کسی کو پتہ نہ ہو۔

میں نے اس ڈائری کو کھولا' دانستہ یا دانستہ...... یا چوری' لیکن بیہ کے دل کا حال کالی جلد والی ڈائری ہی جانتی تھی۔ یہ ڈائری شاید مجھ سے' ماما سے بھی زیادہ عزیز تھی انہیں' جس پہ انہوں نے اپنے ارمانوں کا بوجھ ڈالا تھا۔ اچانک میری نظر ایک تحریر پر پڑی۔ اس کے نیچے آج سے تین سال پہلے کا دن اور تاریخ درج تھی۔

''آج مجھے ماما نے بتایا کہ سہیل کا رشتہ میرے لیے چاچا جی لائے تھے۔ بابا نے بنا مجھ سے یا ماما سے پوچھے فقط دادو کی رضامندی پہ ہاں کر لی ہے۔ ماما نے بھی مجھے صرف بتایا ہے' پوچھا تو نہیں' لیکن ان کا بھی تو کوئی قصور نہیں' وہ بھی تو بے بس ہیں۔ میری طرح' یا شاید مجھ سے بھی زیادہ۔ میں ماما کو کیا جواب دیتی۔ نہ ہاں کرنے کا اختیار ہے اور نہ ناں کرنے کی ہمت۔ آج میں خود کو اس ان پڑھ گنوار لڑکی کی طرح محسوس کر رہی ہوں جس کی شادی اس کی پیدائش کے وقت طے پاتی ہے اور چھ ماہ کی عمر میں وہ کسی کی منکوحہ بھی بن جاتی ہے۔ میں نے عاصم کو بھی بتا دیا۔ کہتا ہے کہ انکار کر دو اپنے بابا کو۔ میں کل رشتہ لے کر آتا ہوں لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میرے لیے بابا کو منع کرنا آسان نہیں' میں نے ہمیشہ ان کی خوشی چاہی ہے۔ انہوں نے میری پرورش کی' مجھے تعلیم دی' میری ہر خواہش پوری کی اور

سجائی مورتی کی طرح وہ بیٹھی تو تھیں مگر بے جان۔ کاٹو تو لہو نہیں ایسی۔

''بیہ باجی! تم شادی سے انکار کیوں نہیں کرتیں۔ تم اس سے محبت بھی تو نہیں کرتیں۔'' میرے کہنے پر پل بھر کو بیہ کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ آئی۔ انہوں نے زیرلب 'محبت' لفظ دہرایا اور دوبارہ چادر درست کرنے لگیں۔

''میری جان! تم ابھی چھوٹی سی ہو' ان باتوں کو نہیں سوچا کرو۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو اور جو وقت بچے تم اپنے ناولز کے کرداروں کے ساتھ رہو۔'' بیہ باجی مسکرا کے بولیں۔

''نہیں بیہ باجی' آپ بات کو تبدیل نہ کریں۔ میں نے سب سن لیا تھا۔ آپ کے بہت سارے خواب ہیں باجی جو وہاں' اس گاؤں میں' ان لوگوں کے درمیان پورے نہیں ہو سکتے۔ پلیز باجی! آپ شادی سے انکار کر دیں' منع کر دیں بابا کو۔'' میں نے تڑپ کے کہا۔ بیہ باجی میرے بستر تک آئیں اور مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''میری پیاری سی گڑیا! زندگی ویسی نہیں ہوتی جیسی ہمیں یہ فلمیں' یہ کہانیاں دکھاتی ہیں۔ زندگی ان خوابوں سے بہت دور ہے' بہت الگ چیز ہے' ہمارے یہاں اس طرح انکار نہیں کیے جاتے' ہمارے یہاں انکار کی سزا صرف موت ہے اور پھر مجھے کیا ملے گا انکار کر کے۔ آخر مجھے کسی نہ کسی سے شادی تو کرنی ہی ہے ناں۔ کیا پتہ قدرت کو وہی شخص میرے لیے موزوں لگا ہو' جسے بابا نے پسند کیا ہے۔ میں خواہ مخواہ اپنے بابا کا دل کیوں دکھاؤں۔'' بیہ باجی مسکرا کے کہہ رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں درد تھا' اذیت تھی۔ ایک سنسان سی اداسی تھی۔

''لیکن بیہ باجی! کوئی کس طرح ایثار کر سکتا ہے ایسے ماحول میں کہ جہاں زندگی کا تصور سرے سے ہی مختلف ہو۔ ہم یہاں کی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں' تم بتاؤ کیا تم رہ سکتی ہو اپنی پینٹنگز' اپنے رنگوں کے بغیر۔ گاڑیوں کے بغیر' شہر کی زندگی کے بغیر ایک ایسے ماحول میں جہاں تمہیں جاننے والا کوئی نہ ہو۔'' میں چیخ اٹھی۔

''زوبی! میں ان تمام چیزوں کے بغیر گزارہ کر سکتی ہوں یا نہیں' یہ تو میں نہیں جانتی لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ میں بابا اور دادی کو دکھی کر کے کسی صورت گزارہ نہیں کر پاؤں گی۔'' زوبیہ باجی کے لہجے کے اطمینان پہ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہو۔ آپ کو اپنے خواب' اپنے ارمان بے حد عزیز ہیں اور پھر ہر کسی کو حق ہے اپنی سانسیں اپنی مرضی سے لینے کا۔ آپ اپنے حصے کی سانسیں بابا اور دادی کے نام کیوں کر رہی ہیں۔'' میرا لہجہ اور سنگین ہو گیا۔

''زوبی جان! میں نے خواب ضرور دیکھے ہیں لیکن ان کے حقیقت میں بدلنے کی شرط نہیں رکھی۔

جب انہوں نے میرے لیے کوئی فیصلہ کیا ہے تو کیا میں انکار کر دوں......؟ نہیں' ہرگز نہیں۔

میں نے عاصم سے کہہ دیا کہ میں اس سے تعلق ختم کر رہی ہوں اور آج کے بعد' ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ کہہ کر میں نے ریسیور کریڈل پہ رکھ دیا۔''

میری آنکھوں سے ایک ننھا سا آنسو گرا اور زوبیہ کی ڈائری کے ورق پہ گر کر الفاظ کو دھبا بنا گیا۔

ہائے بیہ......تم نے اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ میں غلط نہ تھی' تمہیں کسی سے محبت ہے یا پھر تھی۔

میں نے باقی سامان پیک کر لیا لیکن بیہ کی ڈائری اٹھا کے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ رات کو بیہ کے سونے کے بعد میں اسٹڈی روم میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ رات کے اس پچھلے پہر اس کمرے میں میں تھی اور میری بے زبان بہن کی اکیلی اور سسکتی محبت تھی۔

جان سے مار دے مجھے لیکن
چھوڑ جانے کا مجھ پر ظلم نہ کر

''آج عاصم کا خط مجھے ملا۔ وہ تو پاگل ہو گیا ہے میری محبت میں۔ میرا کوئی دعوا کوئی بات اس پر اثر نہیں کرتی۔ آج خط میں یہی شعر لکھا تھا اس نے۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں بے وفا نہیں۔ صرف ایک لڑکی ہوں...... مجبور اور بے بس' لیکن جب تک میں اسے اپنا آپ بے وفا کے طور پر نہیں دکھاؤں گی' وہ مجھے بھلا نہیں پائے گا۔''

تبھی بیہ کی ڈائری سے ایک خط بھی نکلا۔ اس خط سے صاف ظاہر تھا کہ اسے لکھنے والا کس کرب سے گزر رہا ہے۔ اس خط میں ایک نظم درج تھی لیکن اس کا ایک ایک لفظ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

''ایک آنچل سے بندھا ہے سب کچھ
ایک تصویر......اور تصویر میں بھیگے ہونٹ
ایک صندل کی عنابی پنسل
ایک بے ربط سا اکھڑا ہوا خط
ایک عدد کارڈ
جس کو چھونے سے تیری یاد چلی آتی ہے
اور اس کارڈ میں رکھی ہوئی اکلوتی پلک
جس سے مانوس دعاؤں کی مہک آتی ہے
کسی گمنام سے شاعر کا ادھورا مصرعہ
ایک پازیب سے بچھڑا ہوا اجلا موتی
ایک مرجھائی ہوئی زرد چنبیلی کی کلی

میرے لیے پل بھر کے خواب اور ان کی خوشی ہی سب کچھ ہے۔ حقیقتوں کے عذاب کبھی کبھار بہت کٹھن ہوتے ہیں۔'' بیبہ کی آنکھوں کے کونے جھلملانے لگے۔

''لیکن بیبہ باجی!'' میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

''بس گڑیا بس! اپنے ننھے سے دل پر اتنا بوجھ نہ ڈالو۔ یہ باتیں تمہارے سوچنے کی نہیں۔ تم اپنے خوابوں کی ڈور سنبھالو' حقیقتوں کی پرچھائیاں بہت دکھ دیتی ہیں۔ چلو سو جاؤ۔'' بیبہ باجی نے مجھے زبردستی لٹایا اور مجھے کمبل اوڑھا دیا اور چپ چاپ جا کے اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔

لیکن وہ سوئی نہیں۔ وہ کتنی دیر گلابی رنگ کی چادر کو اپنے بے رنگ آنسوؤں سے بھگوتی رہیں۔ اپنے خوابوں کے دامن تر کرتی رہیں۔

*

''اے زوبی! آج تو اتنی چپ کیوں ہے۔'' مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر فرح نے پوچھا۔ میں نے کوئی خاص بات نہیں کی اور نہ ہی نوٹس لیا۔

''زبیدہ بیگم! ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں۔ کہیں دل ول تو نہیں کھو گیا؟'' ثنا نے بھی فرح کا ساتھ دیا اور اس کے زبیدہ بیگم کہنے پر میں نے تاؤ کھا کے اسے گھورا۔

''شٹ اپ یار! کبھی کوئی کام کی بات بھی کر لیا کرو۔ کوئی ڈھنگ کا کام بھی کر لیا کرو' ہر وقت چخ چخ' بخ بخ۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اوہو۔ ایسا کون سا ڈھنگ کا کام سوچ رہی ہو۔ کل تک تو تم بھی ہمارے ساتھ چخ چخ' بخ بخ کیا کرتی تھیں۔ آج کیا ہو گیا؟'' شاوانہ نے مجھے ٹوکا۔

''لگتا ہے 'پیار کا پہلا شہر' ابھی تک چھایا ہوا ہے۔ کیا ہوا ابھی تک پیرس میں پھر رہی ہو کیا سنان کے ساتھ ساتھ...... مس پاسکل۔'' سپنا نے یہ ناول پڑھا ہوا تھا اس لیے تفصیلات بھی اسے معلوم تھیں۔ میں نے اکتاہٹ والی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''آج سراحد نظر نہیں آئے۔ کیوں آخر؟ کہیں چھٹی پر تو نہیں۔'' فرح نے شرارت سے گھورا۔

''یار! کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئے۔'' سپنا نے آنکھ ماری۔

''ہو سکتا ہے شادی وادی کر لی ہو' ہنی مون کی چھٹی پہ گئے ہوں۔'' یہ ثنا تھی۔

''نہیں نہیں' یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ موصوف باپ بن گئے ہوں۔'' شاوانہ نے آخری جملہ بولا۔ اس پر وہ چاروں ہنس دیں اور میں نے چاروں کو کتاب اٹھا کے باری باری ماری۔ میں وہاں سے اکیلی ہی اٹھ آئی تھی اور انجانے میں' میں لائبریری کی طرف چل پڑی تھی۔ ان چاروں میں سے کسی نے بھی میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کی۔ میں لائبریری کے باہر بنے لان میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور 'پیار کا پہلا

شہر' کا مطالعہ کرنے لگی لیکن میرا سارا ذہن بیبہ باجی پر تھا۔ وہ جن حالات سے گزر رہی تھیں یا گزرنے والی تھیں ان حالات کی دشواریوں پہ تھا۔ بیبہ باجی نے پہلی بار میرے دل میں درد کا احساس جگایا تھا' میں سوچ رہی تھی کہ بیبہ کتنی عظیم ہیں کہ بابا کی خاطر' دادی کی خاطر وہ اپنی زندگی کی سب سے ضروری خوشی کھو رہی ہیں یا پھر وہ کتنی پاگل ہیں کہ جو قدرت کی سب سے اچھی فیلنگ محبت سے منکر تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر بیبہ کو کسی سے محبت ہو جائے اور وہ ان سے شادی کر لے تو شاید وہ اپنے خوابوں کا مان رکھ سکتی ہیں۔ اپنی مرضی سے جی سکتی ہیں' لیکن کیا بیبہ واقعی کسی سے محبت نہیں کرتیں؟ اپنی چھبیس سالہ زندگی میں کیا یہ احساس ان کے دل میں کبھی نہیں جاگا؟ کیا بیبہ کو کبھی کوئی اپنا نہیں لگا۔ اگر نہیں تو آخر کیوں؟ بیبہ اتنی اچھی ہیں...... پریوں جیسے نقش' حسین سراپا رکھنے والی' اچھی تعلیم رکھنے والی' ہر طرح سے لائق۔ پھر آخر انہوں نے کسی نے محبت کیوں نہیں کی؟

میں انہی خیالوں میں ڈوبی تھی کہ سراحد لائبریری سے نکل کے شاید اسی طرف آ رہے تھے جہاں میں بیٹھی تھی۔

''کیسی ہیں آپ زبیدہ؟'' وہ میرے بنچ کے پاس آ کے ٹھہر گئے۔

''ٹھیک ہوں سر!'' آج پتہ نہیں کیوں پہلی بار مجھ پر وہ فیلنگز حاوی نہیں ہوئیں جو پہلے ہوتی تھیں۔

''لیکن مجھے آپ کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہیں۔ بھئی اس پھولوں جیسی مسکراہٹ کا کیا ہوا' آج مرجھائی سی کیوں ہے؟'' سراحد کے یہ کہتے ہی میری مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے اور دل کی مرجھائی کلیاں بھی کھلنے لگیں۔

''یہ ہوئی ناں بات۔ پتہ ہے زبیدہ! جب آپ کی عمر کی لڑکیاں قہقہے مارتی ہیں ناں تو موسم تبدیل ہو جاتے ہیں۔ رم جھم پھوار برستی ہے' ہر طرف رنگ بکھرتے ہیں۔'' سراحد نے بڑے ہشاش بشاش لہجے میں کہا۔

''سر! آپ اتنی اچھی باتیں کیسے کر لیتے ہیں' یہاں پر تو لوگ صرف دل دکھانا جانتے ہیں۔'' میرے ذہن میں پھر بابا کا فیصلہ آ گیا جو انہوں نے بیبہ کی قسمت کیا کیا تھا۔ اس بات کے جواب میں سراحد نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''آپ نے ناول پڑھ لیا؟'' وہ میرے ہاتھ میں مانوس کتاب دیکھ کے بولے۔ میں نے گردن اثبات میں ہلائی۔ ''کیسا لگا؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

''کہانی اچھی تھی' بس آخر میں مصنف نے تشنگی چھوڑ دی۔ محبت کی پیاس...... سراحد! انسان کی زندگی میں محبت کی اتنی پیاس کیوں ہوتی ہے؟ جیسی پاسکل کو تھی۔ جیسی ہر ناول کی ہر لڑکی کے اندر ہوتی ہے۔ جیسی خوابوں میں ہوتی ہے۔'' پتہ نہیں آج کیوں میں اتنی بہادر ہو گئی تھی کہ سراحد سے اس طرح

کی باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ میری طرف دیکھتے رہے، پھر مسکرا کے بولے۔

''جانتی ہو زبیدہ! اس پیاس تک ہر کوئی نہیں پہنچ پاتا۔ اس تشنگی کو ہر کوئی نہیں سمجھ پاتا۔ کچھ لوگ تو زندگی محض مصلحت کوشی کی بنیاد پر جیتے ہیں۔ وہ محبت کو، زندگی کو، دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔'' سر احد نے مفکرانہ انداز میں کہا۔

''میں اسی بات پر تو سوچ رہی ہوں۔ پریشان ہوں کہ لوگ آخر اپنی زندگی کے فیصلے خود کیوں نہیں کرتے۔ ان کے لیے دوسرے لوگ کیوں اہم ہوتے ہیں۔ کبھی ماں باپ، کبھی دوست، تو کبھی اپنی ہی مصلحت پسندی۔'' میں نے ان کی تائید کی۔ وہ خاموش رہے۔ میں نے اپنی پرابلم ان سے ڈسکس کرنا بہتر سمجھا۔

''سر! میں آپ کو بتاؤں میں کس لیے پریشان ہوں۔'' میری بات کے جواب میں سر احد نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

''سر! میری ایک دوست ہے، بہت اچھی پڑھی لکھی، اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی، اس کے بہت سارے خواب اور ارمان ہیں، لیکن وہ صرف اپنے باپ اور دادی کی وجہ سے اپنے کزن سے شادی کر رہی ہے جو کہ پڑھا لکھا بھی نہیں، گاؤں میں رہتا ہے اور جو کہ اس کے خوابوں اور ارمانوں کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔'' میں نے تفصیل بتائی۔ انہوں نے لمبی سی ''ہوں'' کی اور کچھ سوچ کر بولے۔

''اس طرح کے کیسز تو پچھتر فیصد تک ہیں، جو لڑکیاں صرف اپنے والدین کی رضامندی کی خاطر کونین کی گولی کو بھی شکر لگا کے نگل لیتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ان کا اطمینان ہو جاتا ہے۔''

''نہیں ہو سکتا اطمینان، سر میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں، وہ خوش نہیں رہ پائے گی۔ وہ ماں باپ کے دل میں عظیم بننے کے لیے اپنا آپ کھو رہی ہے، اپنی پہچان کھو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے روکنا چاہیے لیکن میں کیسے روکوں۔'' میں نے عاجز آتے ہوئے کہا۔

''جب تک وہ خود نہیں چاہے گی اس فیصلے سے ہٹنا تب تک یہ ممکن نہیں، کیوں کہ اگر اس کے والدین سے آپ یا کوئی اور اس بارے میں بات کرے گا تو وہ یہی کہیں گے کہ جب ہماری بیٹی کو کوئی اعتراض نہیں تو آپ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔ اس لیے پہلے اس لڑکی کو ہی اسٹیپ اٹھانا ہوگا، اپنی زندگی کے اہم فیصلے کے لیے۔'' سر احد نے بہت اہم نقطہ سامنے رکھا۔

''نہیں مانے گی۔ وہ لڑکی تو کبھی بھی نہیں مانے گی، انکار کے لیے۔'' میری گردن آپ ہی آپ نفی میں ہلنے لگی۔

''پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔'' سر احد مایوس ہو گئے۔

''لیکن سر! کوئی ایسا جواز تو پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی کسی اور سے شادی کر لے۔ کسی سے محبت

جس میں اب بھی تیری زلفوں کے بھنور لپٹے ہیں
شربتی کانچ کی ٹوٹی ہوئی نازک چوڑی
ایک ٹوٹا ہوا ہلکا سا گلابی ناخن
ایک گدلا سا ٹشو پیپر بھی
جس پہ مہکے ہوئے اشکوں کے نشاں زندہ ہیں
یہی دولت ہے یہی کچھ ہے اثاثہ میرا
ایک آنچل سے بندھا ہے سب کچھ
حسرتوں، سسکیوں، آہوں میں سمیٹا آنچل
تیری خوشبو میرے اشکوں میں لپٹا آنچل

نظم کے ختم ہوتے ہی میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائی اور بے چارے عاصم کی معصوم محبت پہ کتنی دیر گھٹنوں میں منہ دیے رہی۔

میں نے ڈائری کا ایک اور ورق تبدیل کیا۔

''آج میری منگنی تھی اور آج ہی عاصم سے میری آخری ملاقات بھی ہوئی۔ عاصم کے فلیٹ سے واپس آئی تو اپنا آپ تو وہیں چھوڑ آئی، جو لڑکی سفید کامدانی سوٹ میں سہیل کے نام کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھی۔ وہ تو کوئی اور تھی۔ بے روح، بے جان، ایک پلاسٹک کی گڑیا، اپنی زوبیہ کو تو عاصم نے لے لیا تھا۔ کتنا رویا تھا آج میرے شانے سے لگ کے وہ اور میں کم ظرف، بے حس انسان کی طرح یہ دعوا کرتی رہی کہ مجھے اس سے محبت نہیں۔ گھر تک آتے آتے میں واقعی پتھر کی ہو گئی۔ دل کے تمام زخم آنکھوں میں آ گئے اور یہاں آنکھیں پڑھنے والا کوئی نہیں، کوئی نہیں۔''

کتنی معصوم تھی میری بے خبر بہن۔ کیا کچھ قربان کر چکی تھی وہ اور اس پتھر کی پتلی کی آنکھیں تین سال تک کوئی نہیں پڑھ پایا۔ واقعی وہ صحیح کہتی ہے کہ یہاں آنکھیں پڑھنے والا کوئی بھی نہیں۔

رات بھر میں زوبیہ کی خاموش محبت کی کہانی سنتی رہی۔ صبح کی اذان ہوئی تو میں نے دل سے ان کے لیے دعا مانگی اور بہت سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں عاصم کو ڈھونڈوں گی۔ بیا اور عاصم کو ملاؤں گی۔ میں زوبیہ کو اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے نہیں دوں گی۔ میں نے عاصم کا وہ خط اپنے پاس رکھ لیا۔ اس خط کے لفافے کے پیچھے عاصم کا ایڈریس تھا۔ بیا کی ڈائری میں نے ان کی الماری میں واپس رکھ دی۔

☆

گاؤں پہنچے تو ہمارے ہر طرف وہی ماحول تھا جو کہ کچھ سال پہلے مجھے بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ کھلے

کھلے کھیت کھلیان' گھروں کے کشادہ آنگن' آنگن میں رکھی چارپائیاں' گھر کے باقی کمروں سے دور باورچی خانہ' باورچی خانے میں نیچے بیٹھ کے کھانا پکانے کا رواج' یوں تو ہمارا یہ گھر دیہاتوں یا گاؤں کی نسبت بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ فرش پکا' سفید رنگ کی اونچی عمارت' گھر کے داخلی دروازے کے پاس جامن کا درخت اور تھوڑی سی گھاس۔

ہمیشہ کی طرح رضیہ چچی' آمنہ پھوپھو اور ان کے بچوں نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ شادی کا گھر تھا تو خوب چہل پہل تھی۔ میری اکلوتی پھوپھی آمنہ کی تینوں نک چڑھی بیٹیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے صرف بڑی کی تھوڑی بہت بیہ سے ہائی ہیلو تھی ورنہ باقی تو دونوں خود کو پرستان کی پریاں سمجھتی تھیں۔

دلہن یعنی وسیمہ باجی بہت اچھی تھیں' سادہ سی طبیعت اور چہرے والی۔ ان کے دو ہی بھائی تھے سہیل اور روحیل۔ سہیل بھائی جو کہ بیہ کے منگیتر تھے' بدقسمتی سے انہوں نے تو اپنے شوق کی بنا پر تعلیم ترک کی لیکن روحیل میاں کو شروع سے ہی پڑھنے سے غرض نہ تھی۔ پتہ نہیں جاگیرداری کا گھمنڈ تھا یا تعلیم سے دلچسپی کی کمی' کھینچ کھینچ کے انہوں نے بھی میٹرک کر ہی لیا اور پچھلے چھ سال سے گھر بیٹھے مکھیاں مارتے تھے۔

آج وسیمہ باجی کی مہندی تھی۔ گاؤں میں زیادہ فنکشن وغیرہ کا انعقاد تو ہوتا نہیں لیکن ماما اور بیہ نے چھوٹے سے مگر اچھے فنکشن کی ارینجمنٹ کر دی۔ صحن میں چارپائیوں کی جگہ کرسیاں رکھوا دیں اور ایک صوفہ مہمان خانے سے اٹھوا کے رکھ دیا جس پر بیہ نے پیلے اور سبز کاغذ کے پھولوں سے ڈیکوریشن کی اور یہ اچھا خاصا پیارا لگنے لگا۔

فنکشن کے وقت گاؤں کی اور رشتہ داروں کی کئی عورتیں موجود تھیں۔ میں نے سبز رنگ کی قمیص ٹراؤزر پہ پیلے رنگ کا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ بیہ نے میک اپ کیا تھا میرے بالوں اور ہاتھوں میں گجروں کی لڑیاں تھیں۔ بیہ خود بھی اسی طرح کے سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بیہ کے لمبے لہراتے بال ان کی کمر تک جھولتے تھے اور میرے بال صرف شانوں تک لیکن یہ تو اپنا اپنا اسٹائل تھا ناں۔

لڑکوں نے سبز چنریاں گلے میں ڈال رکھی تھیں۔ لڑکیوں میں پھوپھو کی تینوں بیٹیوں نشاء' خوشبو اور نتاشا' جنہیں میں نشہ' بدبو اور بتاشا کہا کرتی تھی' نے بھی سبز لہنگے پہن رکھے تھے اور چہروں پر لیپا تھوپی کی ہوئی تھی۔

سہیل بھائی تو دور دور ہی تھے لیکن روحیل صاحب غالباً مووی بنا رہے تھے۔ رسم شروع ہوئی' ہر کوئی باری باری آتا' وسیمہ کو مہندی رسم کے مطابق ہتھیلی پر لگاتا اور چلا جاتا۔ میں کونے میں کھڑی اس

تمام منظر کو دیکھ رہی تھی' تبھی بیہ باجی یہ رسم ادا کرنے آئیں۔ انہیں دیکھ کر' میرا پچھلے دنوں والا دکھ پھر جاگ اٹھا۔ وہ مسکرا کر اپنی متوقع نند کی رسم مہندی میں شامل تھیں لیکن کیا وہ واقعی مسکرا رہی تھیں؟ کیا ان کی آنکھیں' ان کا دل' سب مسکرا رہے تھے یا وہ ڈھونگ رچائے ہوئے تھیں؟ لیکن وہ ہونٹ' وہ آنکھیں' وہ دل...... عاصم کے بنا کس طرح مسکرا سکتے تھے...... لیکن بیہ ڈھونگ رچانے میں کتنی ماہر ہو چکی ہیں۔ ڈرامہ کرتے رہنے کی انہیں کتنی عادت ہو گئی ہے۔

بیہ اس ماحول سے کتنی مختلف تھیں۔ یہ ماحول' یہاں کے لوگ' ان کے چھوٹے چھوٹے ذہن' چھوٹی باتیں اور بیہ...... وہ تو زرخیز ذہن رکھنے والی عقلمند اور سمجھدار لڑکی تھیں' پریکٹیکل اپروچ اور سمجھدار خواب رکھنے والی' ان کی زندگی میں شاید ایک ہی معصوم خواب تھا ''عاصم' اور اس کی محبت''۔ لیکن شاید وہ اس کو بھی تیاگ چکی تھیں۔ اچانک بیٹھے بیٹھے میری نظر بیہ کے ہاتھ میں پڑی سبز چوڑیوں پر پڑی اور میرے ذہن میں عاصم کی لکھی نظم دوڑ گئی۔

''شربتی کانچ کی ٹوٹی ہوئی نازک چوڑی
ایک آنچل میں بندھا ہے سب کچھ
تیری خوشبو میرے اشکوں میں لپیٹا آنچل''

پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں وہاں مزید بیٹھ نہ سکی۔ اس فنکشن کے شور سے دور میں جامن کے درخت کے نیچے والی گھاس کی راہداری کے ساتھ ایک پرانا کنواں جسے اب بیٹھنے کی جگہ بنایا گیا تھا' پر بیٹھ گئی۔ چاند کی بارہویں تاریخ تھی۔ ارمانوں اور خواہشوں کی جگمگاہٹ لیے ہوئے روشن چاند۔ میرے ذہن پر زوبیہ اور عاصم کی خاموش بے بس محبت بری طرح سے حاوی تھی۔

میں یونہی خاموش بیٹھی کہ مجھے اپنے پاس کسی کے بیٹھنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کے دیکھا' وہ سہیل بھائی تھے۔ جب ہم یہاں رہتے تھے تو سہیل بھائی سے میری اچھی دوستی ہوتی تھی لیکن بیہ کی منگنی کے بعد پتہ نہیں کیوں وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔

''یہاں کیا کر رہی ہو چھوٹی؟'' سہیل بھائی نے پہلے کی طرح مجھے ''چھوٹی'' کے نام سے پکارا۔

''سہیل بھائی! اب میں بڑی ہو چکی ہوں' جانتے ہیں فرسٹ ایئر میں آ چکی ہوں۔ فرسٹ ایئر پری میڈیکل' مستقبل کی ڈاکٹر ہوں میں' جانتے ہیں۔'' میرے لہجے میں نادانستہ تمسخرانہ پن تھا' ان کی تعلیم پر لیکن انہوں نے اسے نارمل ہی لیا۔

''بھئی مجھے نہیں پتہ میڈیکل' پری میڈیکل۔ میرے لیے تو تو آج بھی وہی چھوٹی ہے۔ آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئی' گود میں کھیل کے بڑی ہوئی ہے۔ کھیتوں میں سیر کر کے کھیلی ہے میرے ساتھ۔ بڑی آئی ڈاکٹرنی۔'' انہوں نے عجیب لہجے میں کہا' مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ میں خاموش ہو گئی۔

''یہ بتا یہاں اس طرح اندھیرے میں' ادھر مہندی ہو رہی ہے اور تو یہاں اکیلی بیٹھی ہے۔''

''بس میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔'' میں نے اداس لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ دل کیوں نہیں لگ رہا۔ تمہاری بہن تو ایسی نہیں' ہر کسی کے ساتھ گھل مل جاتی ہے۔'' انہوں نے گویا فخر سے کہا۔

''مجھ میں اور زوبیہ باجی میں بہت فرق ہے اور ویسے بھی میں ان کی طرح اپنے اوپر حاوی احساسات چھپا نہیں سکتی۔ مجھے ڈرامہ کرنا نہیں آتا۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''ڈرامہ...... کیا مطلب...... تمہاری بہن ڈرامہ کرتی ہے؟'' ان کی مسکراہٹ کچھ پھیکی پڑ گئی۔ میں چپ ہی رہی۔

''سہیل بھائی! دیکھا جائے تو دنیا کا ہر انسان ڈرامہ ہی کرتا ہے۔ ہماری ظاہری زندگیاں سب ڈرامہ ہیں' مادیت پرستی' مرئی اور غیر مرئی چیزوں کے پیچھے بھاگ دوڑ' پیسے کمانا' گھر بسانا' یہ تمام کی تمام چیزیں ڈھونگ ہیں' فریب ہیں' چھلاوا ہیں' زندگی کی حقیقت صرف محبت ہے۔ وہ محبت جو ہمیں رشتوں سے ہوتی ہے' اپنوں سے ہوتی ہے' اپنے خوابوں' اپنے ارمانوں سے ہوتی ہے۔ بیہ ڈرامہ اس لیے کرتی ہیں کہ انہیں آپ سے محبت نہیں۔'' میں نے دل کی بات صاف صاف کہہ دی لیکن میری اس حقیقت پسندی کا ان پر گویا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسکرا کے بولے۔

''چھوٹی! تو جس محبت کی بات کر رہی ہے وہ محبت ہمارے معاشرے میں شادی کے بعد ہوتی ہے۔ تجھے کیسے پتہ کہ زوبیہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ منگیتر ہے وہ میری' میرے نام کی زندگی جیتی ہے۔ اس کے پاس محبت کرنے کا ایک ٹھوس جواز ہے۔'' میں نے ان کے چہرے کو پل بھر کے لیے دیکھا' کچھ غصے سے' کچھ نفرت سے اور کچھ ہمدردی سے۔

''یہی تو غلط فہمی ہے آپ کی۔ محبت کسی جواز کو نہیں مانتی' نہ یہ کروائی جاتی ہے۔ محبت...... محبت تو بس ہو جاتی ہے۔ زمین سے اگنے والے خودرو پودوں کی طرح دلوں میں پھوٹ پڑتی ہے۔'' میں نے سراحد والا فلسفہ سہیل کے دماغ میں گھسانے کی کوشش کی۔

''سہیل بھائی! کسی کا منگیتر ہونا محبت کرنے کے لیے ضروری نہیں ہوتا نہ ہی شادی کر کے شوہر بن جانا۔ سہیل بھائی! کبھی کبھی سمجھوتے زندگی کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ خوابوں کے بدلے محرومی ملنا زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟'' میں نے پرامید آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''کوشش تو کر رہا ہوں۔ شاید تم کہنا چاہتی ہو کہ تمہاری بہن کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں ہلکی ہلکی رنجش امڈ آئی تھی۔

''نہیں سہیل بھائی! میرا مطلب یہ نہیں' آپ جانتے ہیں کہ بیہ باجی کے بہت سے خواب ہیں۔ آپ کو پتہ ہے وہ ایک آرٹ گریجویٹ ہیں' آرٹسٹ ہیں' وہ رنگوں کی دنیا کی باسی ہیں۔ ان کے تمام خواب انہی رنگوں سے رنگے ہیں۔ ان کے ارمان بھی قوس وقزح کی طرح خوب صورت ہیں۔ بیہ باجی ایک آرٹ گیلری کھولنا چاہتی ہیں۔ ان پیسوں سے وہ غریبوں کی مدد کرنا چاہتی ہیں۔ وہ ہر عام لڑکی کی طرح زندگی کھل کر جینا چاہتی ہیں۔'' میں نے بہت کھلے کھلے لہجے میں کہا۔

''چھوٹی! اسے میرے ساتھ کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی' وہ بے شک کرلے جو چاہے۔ اس گھر میں کوئی بندش نہیں ہوگی اس پر۔'' سہیل بھائی انتہائی معصومیت سے بولے۔

''اس گھر میں رہنا ہی ان کے لیے بہت بڑی بندش ہوگی سہیل بھائی! یہاں اس گھر میں' جہاں ایک بار آ کر باہر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جہاں ٹیلی فون' کمپیوٹر' انٹرنیٹ اور موبائل فون جیسی سہولتیں مہیا نہیں' جہاں تک آنے کے لیے ابھی پکی سڑک تک نہیں بنی۔ یہاں پہ بیہ کیا خوش رہیں گی۔ یہاں کی دھول مٹی میں ان کے تمام خواب رل جائیں گے' فنا ہو جائیں گے۔ سہیل بھائی! وہ آپ کی اس بڑی کوٹھی میں بے رنگ زندگی گزار کر مر جائیں گی اور ان کے ساتھ وہ تمام خواب بھی مر جائیں گے۔'' میری آنکھوں میں موتی اتر آئے تھے۔

''تم سے زوبیہ نے کہا یہ سب کچھ۔'' وہ پتہ نہیں کہاں کھو گئے۔ ان کے اس سوال پر میں نے سوچا کہ میں یہ کیا کرنے جا رہی ہوں۔ میں یہ باتیں اس شخص سے شیئر کر رہی ہوں جو یہ باتیں سمجھ ہی نہیں سکتا اور اس نے اپنے بابا اور میرے بابا تک یہ پہنچایا تو بیہ خواہ مخواہ رسوا ہو جائیں گی۔ بیہ کی عزت رکھنے کے لیے تو بیہ نے عاصم کے ساتھ جھوٹ بولا تھا اور میں...... یہ کیا کر رہی ہوں۔

''نہیں سہیل بھائی! بیہ نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ بس ویسے ہی میرے دل میں خیال آیا تھا' وہ تو بہت خوش ہیں۔ بہت زیادہ۔ اچھا میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھی اور واپس فنکشن کے شور ہنگامے کا حصہ بن گئی۔

اگلا دن شادی کا دن تھا لیکن پچھلی رات پتہ نہیں کیا ہوا تھا کہ ماما بہت ڈسٹرب تھیں۔ شاید بیہ کی شادی کے بارے میں کچھ بات ہوئی تھی۔ دادو اور چچی بھی ماما سے ناراض تھیں۔ صبح جب میں کچن کی طرف گئی تو چچی دادی سے مخاطب تھیں۔

''دیکھ لیا خالہ اپنی لاڈلی بہو کو' بڑا عزیز رکھتی ہیں ناں آپ اسے۔ اپنی زندگی دے دی اسے' کیسے انکار کر گئی آپ کو۔ پتہ نہیں بیٹیاں بٹھائے رکھنی ہیں عمر بھر۔ یہی فرق ہوتا ہے اپنوں اور غیروں میں۔ آپ تو مجھے ہی غیر سمجھتی آئیں آج تک۔'' رضیہ چچی روہانسے لہجے میں بولیں۔

''بس رضو بس' تو فکر نہ کر۔ میرا بیٹا اللہ زندگی دے ابھی ہے ناں۔ تو فکر کیوں کرتی ہے' میں اس سے بات کروں گی۔'' دادو نے چچی کو تسلی دی۔

میں وہاں سے ماما کے پاس آئی تو وہ بہت الجھی الجھی تھیں' پوچھنے پر کچھ بھی نہ بتایا۔ میں نے بیہ سے پوچھا تو شاید انہیں بھی کچھ خبر نہ تھی۔

بہر حال شادی کی تقریب مکمل ہوئی اور اگلے ہی دن ماما کی طبیعت خراب ہوگئی۔ بابا نے فوراً ہمیں خاور بھائی کے ساتھ گاڑی پہ بھجوا دیا۔ ہم واپس آ گئے۔ مجھے واپس آنے کا کوئی افسوس نہ تھا مجھے تو عاصم کو ڈھونڈنا تھا۔ میں نے ارادہ باندھ لیا کہ میں جلد از جلد ایسا کروں گی۔

آج مجھے کالج کے بعد عاصم سے ملنے اس کے فلیٹ پہ گلشن اقبال جانا تھا۔ اس کے بارے میں اور کسی کو خبر نہ تھی۔ ماما کو میں نے مطلع کر دیا تھا کہ آج میرا کیمسٹری کا پریکٹیکل ہوگا لہٰذا مجھے دیر ہو سکتی ہے۔ چھٹی کے وقت میں کالج گیٹ سے وقت پہ نکلنا چاہتی تھی لیکن لڑکیوں کی بھیڑ تھی گویا بکرا منڈی تھی۔ پتہ نہیں چھٹی کے وقت لڑکیوں کو گیٹ توڑنے کی اتنی تڑپ کیوں ہوتی ہے جیسے کہ انہیں عمر قید کی سزا کے بعد چھوڑا جا رہا ہو۔

بہ مشکل کوئی پندرہ منٹ بعد گیٹ کچھ خالی ہوا۔ موقع پا کر ہی میں نکلی اور بس اسٹینڈ تک آئی۔ یہ تو مجھے پتہ نہ تھا کہ گلشن اقبال کی طرف کون سے نمبر کی بس جاتی ہے لہذا میں نے رکشہ لینے کا سوچا۔ رکشہ ڈرائیور کو میں نے مطلوبہ جگہ چلنے کو کہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد رکشہ ایک مخصوص اپارٹمنٹ کے باہر رکا۔

''بی بی جی! آپ کا صنم ٹیرس آ گیا۔'' میں اتری' رکشہ والے کو اس کے پیسے دیے اور صنم ٹیرس کے اندر آ گئی۔ مطلوبہ بلاک نمبر اور پھر فلیٹ نمبر ڈھونڈ لیا۔ گھنٹی بجانے سے قبل بہت سارے واہموں اور خدشوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔

دو تین گھنٹیاں بجانے کے بعد دروازہ کھلا اور ایک لڑکا باہر آیا۔ وہ نامانوس سا بندہ میری طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ۔ آپ عاصم ہیں؟'' میں نے کہا۔

''عاصم' جی نہیں۔ میں صارم ہوں' عاصم کا دوست۔ آپ کو عاصم سے ملنا ہے؟'' اس کے سوال پہ میں نے گردن اثبات میں ہلائی۔ ''آیئے۔'' وہ مجھے اپنے فرنشڈ فلیٹ کے اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک مرد اندر داخل ہوا' یقیناً یہ عاصم ہی تھے۔ درمیانہ قد' بھرپور سراپا' پرکشش چہرہ اور قامت۔ وہ آئے' بنا کچھ بولے میری طرف دیکھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں سہیل کا عکس آ گیا۔ کہاں یہ اور کہاں وہ...... یقیناً محبتوں کے ہونے اور نہ ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

''جی فرمایئے...... میں عاصم ہوں۔'' انہوں نے بہت شائستگی سے کہا۔

''میں زبیدہ ہوں' زبیدہ فرخ علی! زوبیہ فرخ علی کی چھوٹی بہن!'' میرے اس طرح کے تعارف پر عاصم کے چہرے پہ ایک رنگ سا دوڑ گیا مگر وہ خاموش ہی رہے پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔

''مجھ سے کیا کام پڑ گیا...... اور میرا پتہ آپ کو کس نے بتایا؟'' ان کے لہجے میں خفگی بھی تھی اور حیرانی بھی۔

''عاصم بھائی! مجھے آپ سے کوئی کام نہیں پڑا اور نہ ہی میں کسی کے کہنے پر یہاں آئی ہوں۔ میں نے خود آپ کو ڈھونڈا ہے' اس خط پہ لکھے پتے کے ذریعے اپنی بہن کے لیے' آپ کے لیے' آپ دونوں کی محبت کے لیے۔'' میں نے وہ خط انہیں دکھایا' وہ مانوس سا خط دیکھ کر عاصم ایک بار پھر حیران ہوئے۔

''کون سی محبت؟ وہ جسے آپ کی بہن نے جھوٹا قرار دیا تھا اور ٹھکرا کے چلی گئی تھی جس کی چاہت اس کو تھی ہی نہیں۔'' ان کے لہجے میں بلا کی کرختگی تھی۔

''نہیں عاصم بھائی! وہ ایسی نہیں۔ بیہ کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میری بہن ہے' وہ کسی کا دل ہرگز توڑ نہیں سکتی۔ عاصم بھائی! آپ کا بھی دل انہوں نے نہیں توڑا۔ وہ تو مجبور تھیں' جو اذیت انہوں نے آپ کے سپرد کی ہے اس سے کئی گنا زیادہ انہوں نے اپنے اوپر جھیلی ہے۔'' میرا لہجہ بیہ کی تمام اذیت کا آئینہ دار تھا۔

''عاصم بھائی! صرف بابا اور دادو کی بات رد نہ کرنے کے لیے انہوں نے ایک ان پڑھ لڑکے سے منگنی اور شادی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اپنی اور آپ کی محبت کو مجبوراً رد کیا۔ وہ معصوم لڑکی' بے گناہ ہی سزاوار ہوئی۔ تڑپتی رہی' جھلستی رہی' مگر کسی کو خبر نہ ہوئی۔ کوئی جان ہی نہ سکا۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہ تمام انکشاف عاصم کے لیے باعث حیرت تھے۔

''لیکن...... لیکن اس نے تو مجھے چھوڑا تھا' اپنی مرضی سے' اپنی منشا سے۔''

''نہیں' نہیں۔ عاصم بھائی نہیں' وہ آپ سے آج بھی محبت کرتی ہیں' آج تک۔'' میری تمام باتیں سننے کے بعد عاصم کے دل میں پنہاں محبت نے اک بار پھر سر اٹھایا' وہ تڑپ اٹھے۔ ان کے لیے یہ انکشاف بہت بڑا تھا۔

ان کے چہرے کا رنگ پل پل بدل رہا تھا۔ وہ وفاؤں کے الاؤ میں پل پل جل رہے تھے۔ وہ خاموش تھے مگر ان کی آنکھیں لحظہ بہ لحظہ رنگ بدل رہی تھیں۔

کوئی چاند چہرہ کشا ہوا
وہ جو دھند تھی وہ بکھر گئی

وہ جو حبس تھا وہ ہوا ہوا
کوئی چاند چہرہ کشا ہوا...... تو سمٹ گئی
وہ جو تیرگی تھی چہار سو
وہ جو برف ٹھہری تھی روبرو
وہ جو بے دلی تھی صدف صدف
وہ جو خاک اڑتی تھی ہر طرف
مگر اک نگاہ سے جل اٹھے
جو چراغ جاں تھے بجھے ہوئے
مگر اک سخن سے مہک اٹھے
مرے گلستاں' مرے آئینے
کسی خوش نظر کے حصار میں
کسی خوش قدم کے جوار میں
کوئی چاندہ چہرہ کشا ہوا
مرا سارا باغ ہرا ہوا

عاصم بھائی کو میں نے ایک ایک حقیقت بتادی۔ بیہ کے ساتھ بیتی ہر اذیت کی منظر کشی میں نے کرلی۔ ان کی منگنی سے پہلے کے قصے' منگنی کے وقت کے تاثرات' ہر چیز میں نے بیہ کے محبوب کے سپرد کردی۔ وہ پتھر کے بنے ہوئے بت کی مانند بے حس وحرکت تھے ـــــــ اس درخت کی طرح کہ جس کی جڑیں زمین میں جکڑی ہوئی ہوں اور وہ ہلکی سی جنبش سے بھی قاصر ہو۔

میں نے اس درخت کی جڑوں کو کچھ جنبش دینے کا راستہ نکالنا چاہا۔

''عاصم بھائی! اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ہم دونوں بیہ کو اس گونگی' بہری زندگی سے نجات دلا سکتے ہیں۔'' ''ہم بیہ کو ان کی پسند کی زندگی دے سکتے ہیں۔''

''کس طرح......؟'' وہ بس یہی بول پائے۔

''مجھے پوری طرح تو پتہ نہیں کہ کس طرح لیکن یقیناً کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ میں بیہ سے کسی نہ کسی طرح بات کروں گی۔ آپ پلیز مجھ سے رابطے میں رہیے گا۔'' میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ وہ متواتر چپ تھے۔ میں جانے کے لیے اٹھی' وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے اور وہاں آ کر انہوں نے اپنی چپ کا قفل توڑ دیا۔

''زبیدہ! میں زوبیہ سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا' لیکن آج تمہاری باتوں

نے اس کی عظمت دگنی کردی ہے میرے دل میں' میں اس کو پانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں اور زبیدہ تم...... تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم یقیناً میرے لیے دعاؤں کا ثمر بن کے آئی ہو...... کسی معجزے کی مانند۔'' ان کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی' ان پر بیتے لمحات کی آئینہ دار تھی۔ ان کے دل میں چھپی محبت کا عکس تھی میں اسی محبت میں لمحہ لمحہ بھیگتی' آنسو بہاتی گھر تک آئی۔

میں گھر آئی تو گھر پر چچا' چچی اور دادو کو پایا۔ وہ گاؤں سے آج ہی آئے تھے۔ ان کے آنے پر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا کہ بیہ کی محبت کو مٹانے میں ان کا بہت بڑا رول تھا۔ وہ تینوں دادو کے کمرے میں بیٹھے تھے' ساتھ میں بابا اور ماما بھی تھے۔ میں آئی تو چچی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''ائے میری بچی' میری چندا' آ گئیں واپس کالج سے۔ دیکھو تو کتنی کمزور ہوگئی ہے۔'' چچی نے میرے ماتھے پہ پیار کیا۔

''کیسی ہیں آپ چچی؟ اور وسیمہ باجی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کب آئے آپ لوگ؟'' میں نے بھی ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔

''دیکھو تو' میری بچی کتنا پیار کرتی ہے سب کو۔ ہر ایک کا پوچھتی ہے الگ الگ۔'' دادو نے مجھے پاس ہی بٹھا لیا۔

''یہ دیکھ گڑیا' یہ سب میں تمہارے لیے لائی ہوں۔'' چچی نے کپڑوں کے چند عدد جوڑے میری طرف بڑھائے۔ میں نے حیرانی سے ماما کی طرف دیکھا۔

''جاؤ زوبی' جا کے یونی فارم تبدیل کرلو اور زوبیہ سے کھانا بھی لے کر کھا لو۔'' ماما نے مجھے چلے جانے کا حکم دیا اور میں نے فوراً ہی مان لیا کہ مجھے بھی اب ان لوگوں کے درمیان الجھن ہوتی تھی۔ میں کچن میں آئی تو بیہ کو کام کرتے پایا لیکن آج وہ بھی کچھ الجھی الجھی سی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بھی سرخ سی تھیں' یقیناً وہ روئی تھیں' ان کی حالت دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو چچا چچی بیہ کا نکاح کروانے آئے ہیں۔ اسی لیے ماما بھی ڈپریس ہیں۔ بیہ نے مجھے کھانا دیا اور جلدی جلدی کام سمیٹ کر اوپر کمرے میں آ گئیں۔

پتہ نہیں بیہ کو کیا ہوا تھا' وہ میری کوئی بات بھی سننے کو تیار نہ تھیں اور ماما کو پتہ نہیں کیا ہوا تھا' نہ انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر سب کے ساتھ کھانا کھایا' نہ ہی شام کی چائے پی۔

میں صبح کالج جا رہی تھی تب بھی گھر کا ماحول بہت عجیب تھا۔ بیہ پتہ نہیں کہاں گئی ہوئی تھیں' ناشتے کے لیے بابا کے ساتھ بھی براجمان تھے سوائے ماما کے۔ سب سے برائے نام مل کر میں گھر سے نکل آئی۔ واپسی پر بھی مجھے کچھ خاص سراغ نہ مل سکا۔

لیکن شام کو بیہ باجی اور ماما ٹریس میں کھڑی باتوں میں مصروف تھیں جب میں نے کچھ سننے کی

کوشش کی۔ مجھے بیہ باجی کی آواز صاف سنائی دی۔

''ماما! میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ آخر بابا اپنی اولاد سے ہمیشہ ہی قربانی کیوں مانگتے ہیں۔ نہیں ماما! یہ کس طرح کا انصاف ہے ہمارے ساتھ' کیا سبھی والدین اس طرح ہوتے ہیں۔''

ماما مسلسل خاموش تھیں۔

''ماما! میں اس وقت چپ تھی کیوں کہ اس وقت میری قربانی مانگی گئی تھی لیکن اب' نہیں ماما! آپ کو بھی اس طرح خاموش نہیں رہنا۔'' بیہ غصے سے بول رہی تھیں۔

''تم کیا سمجھتی ہو زوبیہ! میں اس سب سے خوش ہوں؟ یہ جو سب ہو رہا ہے' مجھے یہ اچھا لگ رہا ہے؟ کل سے میں کیا اذیت جھیل رہی ہوں' خود پر جانتی ہو...... مگر تمہارے بابا...... میں انہیں کیسے سمجھاؤں زوبیہ!'' ماما بے بسی سے بولیں۔

''ماما! آپ نے کبھی اس کے چہرے کی طرف دیکھا ہے۔ کیسی معصومیت ہے اس کے نقوش میں۔ بابا اس سے اس کا بچپن کیوں چھیننا چاہتے ہیں۔'' بیہ کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ میں حیران ہوئی کہ بیہ باجی کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔ تبھی میں ٹیرس کا پردہ ہٹا کے ان دونوں کے سامنے آ گئی۔ میری آنکھوں میں پریشانی اور دکھ کے سائے دیکھ کر بیہ میری طرف آئیں۔

''نہیں زوبی! تو پریشان مت ہو' میں ویسا کچھ بھی نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے اپنی قربانی دی ہے' میں تمہیں قربان نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہاری شادی کسی صورت روحیل سے نہیں ہونے دوں گی۔'' بیہ نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میری سماعتیں گویا پھٹنے لگیں۔ یہ کیا......؟

میری شادی اور روحیل سے۔

کیا یہ جو گھر میں مسئلہ چل رہا ہے...... یہ میرا ہے؟

یہ جو سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں' یہ میرے لیے ہیں؟

یہ لوگ جو آئے ہیں' تو یہ مجھے مانگنے آئے ہیں؟

میں تو مارے حیرانی کے کوئی سوال بھی نہ کر پائی۔

''زبیدہ! تم پریشان مت ہونا...... تمہارے بابا نے ہاں ضرور کر دی ہے لیکن میں انہیں منا لوں گی۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے کیا بیٹیاں ان اَن پڑھ' گنواروں کے لیے پیدا کر رکھی ہیں۔'' ماما نے چشمے کے اندر اپنے اشک چھپانے چاہے۔

المیہ یہ نہ تھا کہ ان لوگوں نے مجھے مانگا تھا بلکہ المیہ تو یہ تھا کہ میرے بابا نے ہاں کر دی' بنا سوچے' بنا پوچھے۔

المیہ یہ نہ تھا کہ بیہ نے اپنی منگنی پر اُف تک نہ کی بلکہ المیہ یہ تھا کہ وہ میری منگنی پہ کیوں بغاوت پر اتر

آئی تھیں۔

اسی طرح المیہ یہ نہ تھا کہ مجھے روحیل سے دلچسپی نہ تھی بلکہ المیہ تو یہ تھا کہ زوبیہ کو سہیل پسند نہ تھا' اس لیے میرا قربان ہونا انہیں پسند نہ تھا۔ وہ شاید سمجھتی ہوں کہ میری زندگی میں بھی کوئی عاصم ہو' جسے میں بھی ان ہی کی طرح بابا کی خوشنودی کے لیے ٹھکرا دوں اور سر احد...... میرے دل کے گوشوں میں موجود میری پہلی محبت نے کروٹ لی۔ مجھے ان سے محبت ہے' میرے دل سے پہلی بار آواز آئی۔ یقین کی آواز' بھروسے کی پکار' میں تڑپ اٹھی۔ بیہ کے گلے سے لگی میں چپکے چپکے اشک بہاتی رہی۔

''تمہیں وسیمہ کی شادی کے فنکشنز میں روحیل نے دیکھا اور بقول ان کی والدہ کے' تم اسے پسند آ گئیں اور شادی کے دن ہی اس نے اپنی والدہ سے یہ فرمائش کی کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کی والدہ نے بھی یہ بات ماما کو بتا دی۔ گاؤں میں ماما کی طبیعت تبھی خراب ہو گئی تھی۔ تبھی ہم یہاں جلدی چلے آئے تھے' لیکن ان چند دنوں میں دادو اور چچا نے مل کر بابا سے وہ التجائیں کی ہیں کہ بابا نے خوشی خوشی ہاں کر دی ہے اور انہوں نے ماما کو کہہ بھی دیا ہے کہ میری دونوں بیٹیوں کو میرے ہی دونوں بیٹوں سہیل اور روحیل کے لیے بنایا گیا ہے۔'' بیہ باجی انتہائی تنفر سے بولیں۔ میں چپ ہی رہی اور پھر میں بولتی بھی تو کیا۔

''مجھے نفرت ہونے لگی ہے بابا سے' دادو' چچا اور سب سے۔'' بیہ جھنجھلا اٹھیں۔

''بیہ! کیا آپ کو ان لوگوں سے تب نفرت ہوئی تھی جب انہوں نے آپ کو مانگا تھا؟'' میں نے بہت نارمل انداز میں کہا۔

''زوبی! وہ اور بات تھی۔'' بیہ نے فوراً ہی کہا۔

''کیوں۔ چھری چاہے گردن پر پھرے چاہے پیٹ پر' کرتی تو وہ زخمی ہی ہے۔ اسی طرح قربانی چاہے زوبیہ کی ہو چاہے زبیدہ کی' رہے گی تو وہ قربانی ہی ناں۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''نہیں زوبی نہیں' فرق ہے۔ زوبی تم میری طرح فالتو نہیں ہو۔ میری طرح تم ان خوابوں سے نفرت نہیں کرتیں اور میری طرح......'' بیہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اور تمہاری طرح گونگی اور بے زبان بھی نہیں۔ بیہ تم ٹھیک کہتی ہو تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ تم نے اپنی محبت کو بھلا دیا اور میں اس طرح کے کسی گناہ کی سزاوار نہیں ہوں گی۔'' میں آنکھیں چھت پہ ٹکائے بولی۔ وہ کچھ دیر چونکیں پھر نارمل ہو کے بولیں۔

''زوبی! ہماری دنیا میں محبتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔''

''نہیں بیہ! ہماری دنیا میں لڑکیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ' بیہ! کیا تمہیں کسی سے محبت نہ تھی؟'' میں نے بیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں' ان کی آنکھیں پل بھر میں ویران

ہوگئیں۔ بے رنگ، سنسان، خاموش......

"محبت...... ہونہہ...... ہمیں تو یہ طے کرنے کا بھی حق نہیں کہ ہمیں محبت ہوئی تھی یا غلط فہمی۔ وہ خواب تھا کہ سراب۔" بیہ کا لہجہ اداس تھا۔

"لیکن اب مسئلہ میری محبت کا نہیں تمہاری زندگی کا ہے۔ میں کبھی بھی تمہاری شادی اس گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔ کسی صورت میں تمہیں اس دلدل میں نہیں گرنے دوں گی۔ نہ آج اور نہ کل۔" بیہ سختی سے یہ کہتی چلی گئیں اور میں اپنے کمرے کی تنہائیوں میں اپنے معبود سے بات کرتی رہی۔

"کیا بات ہے زبیدہ! آج تمہارا فون صبح ہی صبح آ گیا۔" عاصم بھائی یقیناً میری علی الصبح کی بجائی گھنٹی پہ حیران ہوئے تھے۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں عاصم بھائی!" میرا لہجہ اور ذہن سختی لیے تھا۔

"خیریت۔ کوئی پرابلم ہوگئی ہے کیا؟" ان کی نیند اب پوری کھل چکی تھی۔

"پرابلم تو نہیں لیکن ملنا ضروری ہے۔ کیا آپ آج دو بجے میرے کالج کے باہر مل سکتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں میں فون پہ بات نہیں کرسکتی۔" میں نے عجلت میں کہا۔ انہوں نے اوکے کہہ کے فون رکھ دیا۔ میں جس کشمکش و پیچ کی کیفیت میں مبتلا تھی، اس کیفیت سے مجھے یقیناً کوئی نکال نہیں سکتا تھا۔ نہ بیہ نہ ماما اور نہ ہی میری سہیلیاں۔ اپنا مسئلہ صرف میں عاصم سے ہی ڈسکس کرسکتی تھی اور پھر ہی کوئی حتمی فیصلہ لے سکتی تھی چونکہ اس سے پہلے میں نے کوئی فیصلہ اپنے لیے نہیں کیا تھا، لیکن اس بار کوئی نہ کوئی فیصلہ کرلینا ضروری تھا۔ بیہ کی زندگی کے لیے، ان کی محبت کے لیے۔ یوں تو میری گھر والوں نے عادتیں بگاڑ رکھی تھیں۔ ماما اور بیہ میرے کپڑوں کی ٹینشن اپنے سر لیتیں۔ مجھے یہ بھی طے نہ کرنا پڑتا کہ مجھے کب کہاں کیا پہننا ہے اور آج، اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اکیلے کرنا میرے لیے کتنا مشکل تھا۔

آج کالج میں تیسرا پیریڈ لائبریری کا تھا۔ میں جانا نہیں چاہتی تھی وہاں، کہیں سراحد کو دیکھ کر میرے پاؤں ڈگمگا نہ جائیں، جنہیں اس فیصلے پر میں نے بہت مشکل سے ٹھہرایا ہے۔ کہیں میں منتشر نہ ہوجاؤں، کہیں میرا حوصلہ ریت کی طرح مٹھی سے نکل نہ جائے۔

میں لائبریری میں گئی، کونے میں رکھی ٹیبل پر خاموشی سے بیٹھ گئی اور کسی غیر مرئی نقطے پہ اپنی آنکھیں ٹکائے رکھیں۔ میں سراحد کے وجود سے بھی منکر تھی۔ ان کی طرف دیکھنا بھی میرے لیے پل صراط پار کرنے کے مترادف تھا لیکن قدرت کو پتہ نہیں میرے امتحان کی جلدی تھی یا میرے حوصلے کی دیوار کو توڑنے کی مرضی کہ سراحد خود میری طرف آئے اور میرے سامنے رکھی کرسی پہ براجمان ہو کے اسی ظالم مسکراہٹ سے میرے حوصلے کو پسپا کرنے لگے۔ مجھے منتشر کرنے لگے۔

"کیا بات ہے؟ آج پھولوں جیسے چہرے پر پھر خزاں کی پرچھائیاں ہیں۔" وہ اسی مخصوص

اپنائیت سے بولے۔ آج میں نے پہلی بار یک ٹک ان کی طرف دیکھا تھا۔

"زبیدہ! کیا ہوا؟ آپ کی دوست کی شادی ہوگئی کیا؟" ان کی اپنائیت اب محبت سے لبریز نرمی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اس شخص کے اور میرے بیچ کچھ نہ تھا نہ کوئی رشتہ، نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی خوش کن لمحہ، پھر بھی وہ مجھے اس طرح کیوں انتشار اور اشتعال میں گھیر لیا کرتا تھا۔ میری آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

"زبیدہ! کیا ہوا؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ چلیں میں آپ کو خوش کرتا ہوں، ایک اچھی سی خوش خبری سناتا ہوں۔" سراحد نے ہلکا پھلکا ہونے کی کوشش کی۔

"پتہ ہے زبیدہ! پرسوں یعنی سولہ تاریخ کو میری آزادی کی آخری تاریخ ہے۔ کیوں کہ پرسوں میرا نکاح ہے۔ میری کزن آفرین سے۔" ان کے اس انکشاف سے میری آنکھوں میں آئے آنسو خشک ہوگئے۔ نکاح، سراحد کا...... کسی اور سے...... میرے دل کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ پھر ایک طویل خاموشی سی چھا گئی اور پھر اچانک کئی دھماکے ہونے لگے۔ کرچیاں بکھرنے لگیں۔ خواب ٹوٹنے لگے۔

"جانتی ہو زبیدہ! میری خالہ یعنی میری مستقبل کی ساس نے اچانک ہی یہ دھماکہ کیا۔ یوں تو آفرین اور میں ایک دوسرے کو بچپن سے پسند کرتے تھے لیکن ہمارے بڑوں نے بھی یہ سوچ رکھا تھا، یہ تو ہم نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔" سراحد خوش ہو کے بتا رہے تھے لیکن میرا ذہن ماؤف ہو کے ایک ہی نقطے پہ اٹکا ہوا تھا۔

"تقدیریں کبھی کبھار کتنی اچھی ہوجاتی ہیں۔" سراحد آنے والے دنوں کے خواب آنکھوں میں سجا کے بولے "تقدیریں کبھی کبھار بہت تلخ بھی ہوجاتی ہیں۔" میں نے دل میں سوچا۔

"مبارک ہو سر!" میں بامشکل ہی بول پائی۔

"پرسوں ضرور آنا اپنی دوست کے ساتھ، کارڈ ان کو دے دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے وہ جن سے نہ میرا کوئی رشتہ تھا، نہ وعدہ، نہ عہد و پیماں تھے، نہ کوئی خواب، وہ جن سے میرا ناتہ فقط ایک موہوم سے احساس کا تھا۔ وہ پل بھر میں مجھے اپنے سے بہت دور جاتے محسوس ہوئے۔ بہت دور...... بہت دور۔ آسمانوں کے فاصلوں تک۔ میں سوچتی ہی رہ گئی کہ خواب کتنے پاگل ہوتے ہیں۔ نہ یہ ناولوں کی طرح دلچسپ ہوتے ہیں اور نہ خوشبوؤں کی طرح دل فریب۔ نہ رنگوں کی طرح جاذب ہوتے ہیں اور نہ گیتوں کی طرح مدھر...... یہ جو بھی ہوتے ہیں، جیسے بھی ہوتے ہیں، ان کی حقیقت فقط ٹوٹنا ہی ہوتی ہے، بکھرنا ہی ہوتی ہے۔

سراحد کی آج کی باتوں نے مجھے سمجھا دیا کہ محبت بے شک خودرو پودوں کی طرح اگتی ہو لیکن کسی ایک دل میں اس کا پھوٹنا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ان پودوں کے کھلنے کے لیے دو دلوں کی موجودگی

بہت ضروری ہوتی ہے۔ میرے خوابوں کی کرچیاں ضرور ہوئیں لیکن میرے قدم میرے فیصلے پر مضبوطی سے جم گئے۔ ایسی مضبوطی سے کہ انہیں کوئی بھی ہٹا نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ایک پلان بنایا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

★

عاصم بھائی سے ہوئی میری آج کی ملاقات میں مجھے پتہ چلا تھا کہ ان کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ عرصہ پہلے وفات پا گئے۔ ایک بہن تھی' جس کی شادی کزن سے ہو گئی اور وہ دونوں ریاض شفٹ ہو گئے۔ یہاں وہ اکیلے تھے اور دو دوستوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کر رہے تھے۔

آج ان کے ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں ڈسکس کیں' بہت ساری پلاننگ کی' دل کو کچھ اطمینان بھی ہو گیا۔ ذہن پر جو سراحد کے کھو جانے کا احساس طاری تھا' وہ بھی کچھ چھٹ گیا۔ دل کے انتشار میں کچھ کمی ہوئی۔

گھر آئی تو گھر کا ماحول ویسا ہی پایا۔ ویران سا...... دادو اور چچی بائیکاٹ کیے بیٹھی تھیں ماما سے' ماما اپنے کمرے کی ہو کے رہ گئی تھیں اور میرے لیے بابا کی ناراضگی برداشت کیے جا رہی تھیں اور بیہ باجی بے دلی سے گھر کے کام کاج کیے جا رہی تھیں۔ چچی اور دادو نے فیصلہ ہی کر لیا تھا کہ وہ کوئی پکا کام کر کے ہی یہاں سے جانے کا نام لیں گی۔

لنچ کے بعد میں کچھ ریلیکس ہوئی' شاور لیا' کپڑے چینج کیے اور اپنے پلان کے مطابق ماما کے کمرے میں چلی آئی۔ ماما آنکھیں موندے کسی گہری سوچ میں گم تھیں' نہ جانے وہ سوچ کیا تھی اور کتنی گہری تھی...... لیکن ان کے چہرے پر اتنی اداسی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

میں خاموشی سے ان کے بستر کے قریب آئی اور بیٹھ گئی۔ بیڈ پر ان کا سرد ہاتھ پڑا تھا' انہی کی طرح اداسیوں میں گھرا ہوا۔

''ماما!'' میں نے انہیں بہت پیار سے پکارا۔ ان کی بند پلکیں اٹھیں' ان کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے رتجگے میں نے دیکھے اور وہ رتجگے یقیناً اپنی اولاد کے لیے تھے' میرے اور بیہ کے لیے۔ وہ اٹھیں' میرے ماتھے پہ پیار کیا۔

''آ گئیں کالج سے میری جان!''

''ماما! آپ باہر کیوں نہیں نکلتیں۔ یہ گھر آپ کا ہے...... اس گھر کی ایک ایک چیز پر آپ کا حق ہے۔ آپ کا اس طرح کٹ جانا کیا اچھا ہے؟'' میرے یہ کہنے پر ماما اور بھی اداس ہو گئیں۔

''عورت سوچتی ہے کہ وہ جس گھر کو اپنا سمجھ کر سجا رہی ہے' بنا رہی ہے' وہ گھر اس کا اپنا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ عورت کا کچھ نہیں ہوتا' اس کا تو اپنا وجود بھی اپنا نہیں ہوتا۔ وہ گھر کے لیے تو کیا' اس اولاد

کے لیے بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی جس کو وہ اپنی کوکھ سے سینچتی ہے' اسے ہزاروں تکلیفوں سے بڑا کرتی ہے۔'' ماما کی آنکھیں کھنڈروں کی طرح ویران تھیں۔

''ماما! ہماری وجہ سے آپ کو کتنے دکھ سہنے پڑ رہے ہیں۔'' ان کی حالت دیکھ کر میں اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپا نہ پائی۔

''اگر میرا دکھ میری بچیوں کو اس عذاب میں گرنے سے بچا سکتا ہے تو میں آخری سانس تک اس دکھ میں زندہ رہنا قبول کرتی ہوں۔ مجھے دکھ اس بات کا نہیں ہے کہ میری ساس مجھ سے بدل گئیں بلکہ دکھ تو مجھے اس بات کا ہے کہ تمہارے بابا' جنہیں میں نے اپنی پوری زندگی دے دی' وہ ہی مجھے سمجھ نہ پائے' جو کہ گھر کے پردوں کا رنگ بھی میری پسند کے بغیر فائنل نہ کرتے تھے۔ اپنی بچیوں کو بنا میری پسند کے کسی کو دے آئے۔'' ماما کی ویران آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''ماما! کبھی کبھار ہم کو جیسا لگ رہا ہوتا ہے' منظر ویسا نہیں ہوتا۔ ماما! آج بہت ہمت سمیٹ کر میں آپ کو ایک راز بتانے آئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرا ساتھ دیں گی۔'' میں نے بہت حوصلہ اکٹھا کیا۔ ماما میری طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ماما! آپ نے جس وقت بیہ باجی کے رشتے پہ چپ کی تو یقیناً آپ خوش نہ تھیں کیوں کہ تب آپ نے اپنے شوہر کی بات کو اہمیت دینا بہتر سمجھا' نہ بیہ کی رائے لینا ضروری سمجھا اور نہ ان کی بات مانی' جب کہ بیہ اس رشتے پہ قطعی رضامند نہ تھیں۔ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھیں' کسی سے محبت کرتی تھیں' لیکن انہوں نے اس محبت کی قربانی دے دی بابا اور سب کو خوش کرنے کے لیے اور جب میری باری آئی' میرے لیے روحیل کا رشتہ آیا تو آپ نے اور بیہ نے بغاوت کر لی۔ اپنے پرانے امیج کو یکسر تبدیل کر دیا۔ بنا یہ سوچے کہ میں روحیل کو پسند بھی کر سکتی ہوں۔'' میں نے بہت صفائی سے ایک جھوٹ گھڑا تھا' بیہ کی زندگی کی خوشیوں کے لیے۔

''کیا......؟'' ماما پر یہ انکشاف بہت حیران کن تھے۔

''ہاں ماما! میں روحیل سے محبت کرتی ہوں' اسے پسند کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور زوبیہ عاصم کو پسند کرتی ہے۔ وہ سہیل سے شادی کبھی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ زوبیہ کی شادی وہاں کرنے کو راضی ہیں لیکن میری نہیں۔'' یقیناً میری یہ اداکاری ماما پر شدت سے اثر انداز ہو رہی تھی۔

''زوبیہ کسی سے محبت کرتی ہے؟'' ماما سے کچھ بولا بھی نہ جا رہا تھا۔

''پچھلے چار سال سے' لیکن وہ گھٹ گھٹ کے مر رہی ہیں۔ پلیز ان کی شادی آپ عاصم سے کروا دیں اور انہیں ان کی محبت بخش دیں۔ رہی بات روحیل کی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پلیز ماما' بابا کو منا لیں۔'' میں نے التجا کی اور اپنی بات ان کے سامنے رکھ دی۔ مجھے بیہ باجی کی خوشیوں کے لیے اپنا کتنا

منظور تھا۔ ہر حال میں، میں اپنی بہن کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

ماما کے چہرے کے زاویے بدل رہے تھے۔ یقیناً وہ بہت بڑی سوچ میں ڈوب چکی تھیں۔ آج ان کی بیٹی نے ان کے سامنے جو انکشاف کیے تھے، وہ کچھ کچھ ناقابلِ یقین تھے اور کچھ حیران کن۔

اگلے دو دن تک گھر میں مکمل خاموشی تھی، میری توقع کے الٹ، میں تو کسی ہنگامے کا سوچے بیٹھی تھی۔ کسی طوفان کی توقع کیے بیٹھی تھی لیکن گھر پہ محیط اس موت جیسی خاموشی سے تو مجھے ڈر لگ رہا تھا، وہی روٹین جاری تھی، وہی روز و شب تھے، کہیں کوئی تبدیلی نہ تھی، کوئی بدلاؤ نہ تھا۔ عاصم بھائی بھی بار بار فون پر کچھ نئی پروگریس کا پوچھتے لیکن یقیناً کوئی بھی نئی پروگریس نہیں ہوئی تھی۔

آج بھی تیسرا دن شروع ہوا تھا اور وہی پرسکون خاموشی میری منتظر تھی۔ کئی خدشے، کئی وسوسے میرے دل کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں کالج جانے کے لیے ابھی انٹرنس دروازے کو عبور ہی کر پائی تھی کہ کورٹ یارڈ میں مجھے ماما مل گئیں۔ کچھ کچھ تروتازہ، کچھ کچھ مرجھائی سی۔ وہ ہنسنے اور رونے کا عجیب امتزاج لگ رہی تھیں۔

''زوبی! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' ماما نے مسکرا کے کہا۔

''کیوں ماما! خیریت؟'' میں بھی مسکرا دی۔ اس دن کی بات کے بعد یہ ہم دونوں کی پہلی مسکان تھی۔

''آج آصف چھٹی پر گیا ہے، اس کی بیوی ہسپتال میں ہے ڈلیوری کے لیے۔ بیچارہ پریشان تھا بہت۔ تمہیں کالج چھوڑنے میں جاؤں گی۔'' ماما نے یقیناً مجھ سے پوچھا نہ تھا، مجھے بتایا تھا۔ وہ ہولے ہولے میرے ساتھ چلتی کار پورچ تک آئیں اور سوزوکی مہران کا دروازہ کھولا۔ میں بھی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کے بیٹھ گئی۔

''کتنی خوش نصیب ہوگی ہمارے ڈرائیور کی بیوی کہ اس کو اس قدر چاہنے والا شوہر ملا ہے جو کہ اس کی اتنی کیئر کرتا ہے۔'' ماما گاڑی ریورس کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھیں، میں چپ ہی رہی۔

''پتہ نہیں میری بیٹیوں کے نصیب میں کوئی ایسا لڑکا ہوگا کہ نہیں۔ زوبیہ نے تو چلو اپنے بڑوں کی خوشی کا خیال کر کے اس آگ کو منتخب کیا، تمہیں کیا پڑی کہ اپنی بربادی کے راستے اس طرح منتخب کرو۔'' ماما کا لہجہ تو نارمل تھا لیکن ان کی باتوں میں آگ تھی، الاؤ تھا۔

''تم جیسی لڑکیاں صرف اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں، پڑھتی ہیں، لکھتی ہیں، میرٹ بناتی ہیں، ڈاکٹر انجینئر بنتی ہیں اور اگر یہ سب نہیں ہوتا تو کسی اچھے خاندان کے پڑھے لکھے لڑکے کا انتخاب کر کے اس کی دلہن بنتی ہیں تاعمر مطمئن رہتی ہیں، خوش رہتی ہیں، مگر تم نے...... تم نے کیا کیا...... تم نے نہ اپنی تعلیم مکمل کی اور نہ کسی مہذب لڑکے سے محبت۔ تم نے انتخاب بھی کیا تو کس کا،

گاؤں میں رہنے والے میٹرک پاس ایک گنوار لڑکے کا؟'' ماما کا لہجہ آہستہ آہستہ اندر کی آگ اگلنے لگا تھا۔ میں بدستور چپ ہی تھی۔

''اگر میں تمہارے بابا کو بتا دوں تو وہ دو دن میں تمہاری شادی ادھر کر دیں اور تمہارے فیصلے پر گردن فخر سے تان لیں، لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ زوبی! تم ابھی بچی ہو اور بچے صحیح فیصلے نہیں کرتے۔ اگر زوبیہ اپنی محبت کے لیے بغاوت کرتی تو میں اس کا ساتھ دیتی لیکن میں تمہارا ساتھ کس طرح دوں زبیدہ؟ کہ تم نے مجھ سے مانگی بھی ہے تو بربادی۔ میری بچی! جسے تم خواب سمجھ رہی ہو وہ سراب ہے، دور سے ریت کے چمکتے ہوئے ذرّے ہیں، بہروپ ہے۔ اس نے تمہیں چکنی چپڑی باتوں سے بہلایا ہے بیٹا! وہ گھرانا ہمارے قابل نہیں ہے۔ پلیز اس ضد سے ہٹ جاؤ زبیدہ...... پلیز۔'' ماما اب موم کی طرح پگھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ ریشم ایسا دل رکھنے والی ایک معصوم عورت۔

''ماما! میں نے آپ کا دل دکھانے کا ارادہ کبھی بھی نہیں کیا۔ آپ اپنی بیٹیوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں ناں ماما! میں نے تو بس آپ سے آپ کی بیٹیوں کی اور خود آپ کی خوشیاں مانگی ہیں۔ اگر بیبہ کی شادی سہیل سے ہو گئی تو دو زندگیاں تباہ ہو جائیں گی ماما! بیبہ کی اور عاصم بھائی کی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور اگر میری شادی روحیل سے نہ ہوئی تو دادو، چچی اور پاپا، ان تینوں کے دل آپ سے متنفر ہو جائیں گے، آپ کا گھر بھی ٹوٹ سکتا ہے ماما! بابا کو کتنا دکھ پہنچے گا جب وہ بیبہ کے بارے میں سنیں گے، ماما اسی دکھ سے بچنے کے لیے ہی تو بیبہ نے خود کو اتنی اذیت دی ہے۔ پلیز ماما! آپ میرا ساتھ دیں۔ میں نے نہ کچھ غلط مانگا ہے اور نہ غلط سوچا ہے۔ آپ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش تو کریں۔'' میرے لہجے کی نرمی یقیناً ماما کے دل میں بس گئی تھی اس لیے تو وہ پیار سے بولیں۔

''پلیز آپ گاڑی گلشن اقبال کی طرف لے چلیں۔ میں آپ کو سب سمجھا دوں گی۔'' میرے یہ کہنے پر ماما نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح سگنل سے گاڑی ٹرن کی اور پھر مصروف سڑکوں پر ہماری گاڑی گلشن اقبال کی طرف دوڑنے لگی۔

اسی مانوس صنم ٹیرس کے اندر میں نے گاڑی رکوائی اور ماما کو ساتھ لے کر عاصم بھائی کے فلیٹ تک آئی۔

دوسری بیل پر عاصم بھائی نے دروازہ کھولا۔ مجھے اور ماما کو دیکھ کر وہ حیران ہو گئے۔ وہ شاید کہیں جا رہے تھے، براؤن پینٹ کے اوپر گرین چیک شرٹ میں وہ نہایت اچھے لگ رہے تھے۔ ان کی چھب ہی نرالی لگ رہی تھی۔ وہ ایک موہوم سی حیرانی کے بعد ماما کو پہچان گئے تھے۔ انہوں نے ماما کو ادب سے سلام کیا اور ماما نے بھی مسکرا کے انہیں جواب دیا۔ ماما میرے بتائے بغیر ہی سب کچھ سمجھ گئی تھیں

لیکن میں نے بتانا پھر بھی ضروری سمجھا۔

''یہ عاصم بھائی ہیں ماما!''

''پہچان گئی ہوں' بتانے کی ضرورت نہیں۔ زوبیہ کی ماں ہوں۔'' ماما کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ عاصم بھائی ہم دونوں کو اندر لے آئے۔ کچھ دیر سرسری سی بات کی' پھر ماما کے صوفے تک آئے' اپنائیت سے ان کے گھٹنوں تک ہاتھ رکھ دیا اور نہایت پیار سے بولے۔

''آنٹی! میں نے بہت کم عمری میں اپنے والدین کھو دیئے۔ میرا کوئی ہوتا تو آپ سے آپ کی بیٹی کو مانگتا لیکن کوئی نہیں ہے اس لیے میں خود ہی یہ کام کرلیتا ہوں۔ میں آپ سے آپ کی بیٹی مانگتا ہوں آنٹی! میں ہر طرح سے لائق ہوں' سی اے کیا ہے۔ اچھی جگہ کام کرتا ہوں' اچھا کما لیتا ہوں۔ شادی کے بعد کمپنی کی طرف سے گھر بھی ملے گا اور سب سے بڑی بات میں زوبیہ سے بہت' بہت محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں' کل سے نہیں ہمیشہ سے اور میں آپ کی بیٹی کو بہت خوش رکھوں گا۔'' عاصم بھائی کا وہ لہجہ بیک وقت میری اور ماما دونوں کی آنکھیں نم کر گیا۔ ماما نے بہت محبت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹا! میں نے اپنی بیٹی تجھے دے دی۔ مجھے اپنی دونوں بیٹیوں پہ ناز ہے۔'' ماما کی آنکھیں اب بہنے لگی تھیں۔ انہوں نے عاصم بھائی کے لیے رضا مندی ظاہر کر کے میرے پلان نمبر ون کو کامیاب کر دیا۔

عاصم بھائی سے ملنے کے بعد ماما مطمئن تو ہو چکی تھیں لیکن بابا سے اس بارے میں بات کی ہمت وہ ابھی بھی نہ کر پائی تھیں کیوں کہ یہ اتنا آسان تھا اور نہ سو فیصد ممکن۔ دوسری طرف دادو' چچی نے مل کر ایک محاذ بنا لیا تھا میرے حصول کے لیے اور بابا بھی ڈھکے چھپے انداز میں انہی کے ساتھ تھے۔ بس کچھ کچھ ماما کی ناراضی کا خیال تھا ورنہ وہ رضا مند تھے۔ آج تو ایک اور انہونی ہونے کو تھی کہ سہیل بھائی اور روحیل آ پہنچے تھے' انہیں دیکھ کر نہ صرف ماما کے بلکہ میرے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ سوچنے کی قوت ختم ہو گئی۔ ہمیں یہ یقین سا ہونے لگا کہ ہو نہ ہو یہ دونوں اپنے کام کی تکمیل کے سلسلے میں ہی آئے ہیں۔ ماما نے مجھ سے کیے وعدے کے مطابق بیہ باجی سے سب کچھ چھپا رکھا تھا' اس لیے وہ بار بار مجھ سے پوچھتیں کہ زوبی اب کیا ہوگا' اب وہ لوگ آ گئے ہیں' ابھی بھی ماما کو اطمینان دلا کر ہی میں نیچے آئی تھی کہ

''ماما جو کچھ ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوگا اور اس میں اس مالک کی منشا ضرور شامل ہوگی۔''

میں سیڑھیوں سے اتری تو دادی کے کمرے میں خاور بھائی کے ساتھ سہیل اور روحیل دونوں ہی نظر آئے۔ میں کمرے میں گئی اور رسماً سب کو سلام کیا۔ دادو اور رضیہ چچی کے چہرے مجھے دیکھ کر کھل اٹھے۔

''آ گئی میری بچی! آج کس طرح آنے دیا تیری امی نے تجھے؟'' دادو مجھے پیار کرتے ہوئے بھی ماما کے خلاف بولیں۔

''نہیں دادو! ماما نے تو مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ وہ مجھے کہتی رہتی ہیں کہ میں نیچے آتی جاتی رہوں۔'' میں نے ماما کا دفاع کرنا چاہا۔

''میں صدقے جاؤں...... میری بچی کتنی تابعدار ہے۔ والدہ جو بھی کرے مگر اس کی پردہ پوشی کرتی رہتی ہے۔'' رضیہ چچی نے میری سائیڈ لینی چاہی۔

''چچی جان! تابعداری اور فرمانبرداری پرورش سے ہی آتی ہے اور میری پرورش یقیناً میری ماما کی ہے۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''اے پرورش سے بڑھ کر ہاتھ خون کا ہوتا ہے اور خون تم ہمارا ہو۔ ہمارے خاندان کا ہو' تیری ماں تو غیر خاندان سے آئی تھی' پرائی تھی وہ۔'' رضیہ چچی تنک کر بولیں۔

''لیکن چچی جان! اگر کسی غیر خاندان کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھ کر یا بنا کر کوئی اپنے گھر لے آتا ہے تو اپنا بنا کے لاتا ہے۔ پھر غیر ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ چچی کے چہرے کے زاویے بدلنے لگے' تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ خاور بھائی جانے لگے لیکن میں نے انہیں روکا۔

''رکیں بھائی! میری دوست کا فون ہوگا۔'' میں نے موقع غنیمت جان کر وہاں سے کھسک جانا ہی بہتر سمجھا۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ فون کس کا ہے۔ لاؤنج میں بجنے والے ٹیلی فون کو اٹھایا تو دوسری طرف عاصم بھائی تھے۔

''عاصم بھائی! دو منٹ ہولڈ رکھیے گا میں اوپر اپنے کمرے سے فون اٹھاتی ہوں۔'' میں نے فون واپس کریڈل پر رکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

''کیا بات ہے عاصم بھائی! آج آپ نے مجھے گھر پر فون کس طرح کر لیا؟'' میرے سوال پر وہ ہنس پڑے۔

''کیوں' میں اپنی بہنا کو فون نہیں کر سکتا۔ ویسے میں نے فون اپنے مستقبل کی عروسہ کا حال پوچھنے کے لیے کیا تھا۔ پتہ ہے زوبی! میں نے رات کو خواب میں اسے روتا ہوا دیکھا ہے۔''

''بالکل صحیح دیکھا ہے آپ نے۔ آج کل بیہ بہت اداس ہیں۔ مجھ سے کہتی تو نہیں لیکن وہ اندر ہی اندر منتشر ہوتی رہتی ہیں اور پھر جب سے چچی' بیہ کے ساتھ میرا ہاتھ بھی مانگنے آئی ہیں بیہ تو بیمار بھی پڑ گئی ہیں۔ ان کے منہ میں زبان تو ہے ہی نہیں جو کہ ان کے اندر کا حال بیان کر سکے۔ بس ان کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی ہیں اور ان پتھر کی آنکھوں کو بھی کوئی نہیں دیکھ پاتا۔'' میرا لہجہ افسردہ ہو گیا۔

''زوبی! جب میں نے تمہاری بیہ باجی سے محبت کی تھی تو اس کی کانچ ایسی شفاف آنکھوں کو دیکھ کر

کی تھی‘ اس نے بچھڑنے کی اذیت مجھے بھی دی اور اپنی آنکھوں کو بھی لیکن زوبی! تم اس کو کہنا کہ وہ اداس نہ ہو۔ میں اس کی آنکھوں کے تمام خواب‘ تمام رنگ اسے واپس سونپ دوں گا۔ اس کا ہر ارمان سمیٹ کر اسے واپس تھما دوں گا۔‘‘ عاصم بھائی کے لہجے میں وفائیں بول رہی تھیں۔ ’’یہ بتاؤ گھر پر کیا صورتِ حال ہے؟‘‘ انہوں نے بات کا پہلو بدلا۔

’’میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے بھائی! کہ کیا ہو رہا ہے اور یہ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کل سے تو سہیل اور روحیل بھی تشریف لا چکے ہیں۔ بابا سے بات کرنے کی ہمت کوئی بھی نہیں کر پا رہا۔ بیہ کو ابھی تک ہم نے کچھ بتایا نہیں۔‘‘ میں نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

’’زوبی! ساری مایوسیاں اپنی جگہ‘ ساری محرومیاں بھی اپنی جگہ لیکن اس بار مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میں تمہاری بہن کو اپنی دلہن بنا کے لاؤں گا۔ سچ یقین کرو میرا مجھے اس بار بہت بھروسہ ہے اپنے اللہ پر۔ وہ جو بھی کرے گا‘ بہت اچھا کرے گا۔‘‘ عاصم بھائی پرجوش انداز میں بولے۔

’’خدا کرے کہ آپ کا یہ بھروسہ تکمیل کو پہنچے۔ چلیں‘ فون رکھیں‘ کسی نے سن لیا تو خیر نہیں میری۔‘‘ میں نے مسکرا کے کہا اور فون واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ عاصم بھائی کے حوصلے نے مجھے بھی قوت عطا کی تھی اور میں نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ میں بابا سے خود بات کروں گی۔

بابا دو دن کے لیے پنڈی گئے ہوئے تھے‘ کسی کام کے سلسلے میں۔ سہیل بھائی کے گھر میں رہنے کی وجہ سے بیہ باجی بھی بہت وقت باہر لگا رہی تھیں۔ کبھی اپنے آرٹ کالج میں تو کبھی کسی دوست کے گھر۔ ماما نے بھی دادو اور چچی سے نئے تعلق استوار کر لیے تھے اور نیم رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہ تھی آج کل۔ مجھے تو صرف بیہ کے مستقبل کی جیت چاہیے تھی۔ ان کے خوابوں کی تعبیریں چاہیے تھیں۔ بابا کل رات دیر سے آئے تھے‘ اسی وجہ سے میری ان سے ملاقات ہو نہ پائی اور صبح جب میں اٹھی تو وہ دفتر جا چکے تھے اس لیے میں آج شام سے ہی ان کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ڈھیر ساری ہمت اکٹھی کیے کہ آج ان سے کہہ دینا ہے کہ میری شادی آپ بھلے روحیل سے کر دیں لیکن بیہ کے خواب نہ توڑیں۔ میں نے نہ کسی خواب سے واسطہ جوڑا ہے اور نہ کوئی امید باندھی ہے لیکن بیہ کے خوابوں کے توڑنے کا ظلم نہ کریں۔ صبح سے آج دل میں خدشوں اور واہموں کے طوفان بھی جمع تھے۔

کافی دیر سے میں لاؤنج میں بیٹھی خالی خالی ذہن سے ٹی وی کے چینل بھی تبدیل کیے جا رہی تھی تبھی ہارن بجا اور گاڑی پورچ میں داخل ہونے کی آواز آئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیزی سے دوڑ لگانے لگیں۔ ماما اس وقت کچن میں مصروف تھیں۔ دادو اور ان کی پارٹی اندر کمرے میں اور بیہ گھر سے باہر۔

بابا انٹرنس ڈور سے گزر کر اندر لاؤنج میں آئے اور ان کے پیچھے کوئی اور بھی اندر آیا لیکن وہ کون تھا‘ میں نے غور سے دیکھا تو وہ عاصم بھائی تھے۔ خطرے کی گھنٹیاں میرے چاروں جانب بجنے لگیں۔

عاصم بھائی اور بابا کے ساتھ۔ عاصم بھائی کے دائیں بازو پہ پٹی بھی بندھی تھی۔ عاصم بھائی مسکراتے ہوئے اندر آ رہے تھے۔ میں ششدر اور حیران سی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ بابا بھی بظاہر مطمئن تھے۔

’’زوبی بیٹا! کیسی ہو؟‘‘ بابا نے مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا۔

’’بابا! یہ......‘‘ میں نے گھبرا کے عاصم بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

’’یہ بہت اچھا لڑکا اور انتہائی بہادر نوجوان ہے بلکہ یہ سمجھ لو کہ یہ میرے لیے ایک فرشتہ ہے۔‘‘ بابا نے مسکرا کے بات شروع کی۔ ’’آج تمہارے بابا کو خدا نے اسی انسان کے ذریعے بچایا ہے۔‘‘

’’وہ کیسے بابا!‘‘ میں ابھی تک سمجھ نہ پائی تھی۔

’’فہمیدہ‘ اماں جی‘ خاور‘ سہیل۔‘‘ بابا نے سب کو آواز دی اور پل بھر میں سبھی جمع ہو گئے۔ عاصم بھائی کو دیکھ کر ماما کی آنکھیں بھی مارے حیرانی کے پھٹ گئیں۔

’’یہ لڑکا عاصم ہے۔ آج جب میں آفس سے آ رہا تھا تو ایک موٹر سائیکل تیز رفتاری سے روڈ کی جانب بڑھا۔ اگر یہ نوجوان مجھے آ کے روڈ کے اس کونے سے ہٹا نہ لیتا تو شاید وہ جلد باز موٹر سائیکل مجھے اچک لیتی اور میں...... اسی بچاؤ کی وجہ سے اس لڑکے کے بازو پہ چوٹ بھی آئی۔‘‘ بابا نے سبھی کو خوش ہو کے بتایا۔

’’بیٹا! خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ تم نے میرے بیٹے کی جان بچا کر ہم پر بہت احسان کیا ہے۔‘‘ دادو نے شکر گزاری سے کہا۔ پھر بابا نے ہم سب کا تعارف کروایا۔

’’بیٹا عاصم! یہ میری والدہ ہیں۔ یہ میری مسز ہیں‘ یہ چھوٹی بیٹی ہے زبیدہ! یہ خاور ہے‘ یہ دونوں میرے ہونے والے داماد اور بھتیجے سہیل اور روحیل ہیں۔ میری بڑی بیٹی زوبیہ شاید کہیں گئی ہوئی ہے۔‘‘

عاصم بھائی باری باری سب کو سلام کرنے لگے۔ بیہ کے خاندان سے یہ ان کی پہلی علیک سلیک ہی تھی لیکن وہ واقعہ یا ماجرا جو ابھی ابھی بابا نے سنایا تھا‘ وہ میری ماما کی سمجھ سے تو باہر ہی تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نشست کے بعد جب عاصم بھائی چلے گئے تو کچھ دیر بعد میں نے ان کا سیل فون نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ان کی کھنکتی آواز آئی۔

’’خدا کے لیے عاصم بھائی! مجھے سمجھائیں کہ یہ سب کیا تھا؟‘‘ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ دیر تک ان کی آواز ایئر پیس میں گونجتی رہی۔

’’عاصم بھائی! آپ ہنس رہے ہیں۔ میرا تو ذہن ماؤف ہو چکا ہے سوچ سوچ کر۔ پلیز بتائیں۔‘‘ میں نے اصرار کیا۔

’’بھئی زندگی اتفاقات سے مزین ہے‘ کہیں بھی کبھی بھی کوئی بھی ٹکرا سکتا ہے۔ ویسے آج جو بھی سین پارٹ ہوا‘ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔‘‘ وہ صاف گوئی سے بولے۔

''مطلب آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ فلمی سین واقعی اتفاق تھا۔''

''ہوں۔'' انہوں نے انتہائی معصومیت سے جواب دیا۔

''عاصم بھائی! مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' مجھے غصہ آ رہا تھا۔

''بھئی زوبی! تم یقین کرو نہ کرو لیکن ایسا ہوا ہے۔ میں تمہارے بابا کے آفس کسی کام سے گیا تھا' میرا ان سے ملنے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا لیکن راستے میں میری ان پہ نظر پڑ گئی اور میں نے ان کی ٹکر موٹر سائیکل سے ہونے سے بچا لی۔ بس' قصہ مختصر وہ مجھے پہلے اسپتال لے گئے' میری پٹی کرائی اور پھر اپنے گھر لے آئے۔'' عاصم بھائی نے تمام قصہ بیان کیا۔

''یعنی اس میں سے کچھ بھی آپ نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔'' میں ابھی تک غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

''آف کورس' میں مذاق نہیں کر رہا۔ ان کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں بالکل بھی نہ جانتا تھا کہ وہ سید فرخ علی شاہ یعنی میرے ہونے والے سسر صاحب ہیں۔ اس وقت جب انہوں نے میرے بازو پر بینڈیج کرائی تبھی اپنا تعارف بھی کروایا۔'' وہ مزید بولے۔

''او مائی گاڈ...... یعنی یہ اتفاق تھا۔'' اب جا کے مجھے کچھ یقین آیا تھا۔

''نہیں یہ سب پری پلان تھا۔ زوبی اتنی وضاحت کے بعد بھی تمہیں مجھ پر یقین نہیں۔'' انہوں نے مجھے مطمئن کر کے فون بند کر دیا۔ آج کا یہ دھماکہ ویسے بڑا مزیدار تھا۔

اگلے دن ایک اور دھماکہ ہوا۔

بابا نے ماما کو اور سب کو بٹھا کر کہہ دیا کہ اگلے ہفتے زوبی اور زوبیہ کے نکاح کی سیریمنی ہے اور رخصتی اگلے ماہ دونوں کی اکٹھے ہو گی۔

بیہ یا کسی اور کو تو خیر کیا فرق پڑتا' میرے اور ماما کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ کیا؟ اتنی جلدی مگر کس لیے؟ اس طرح کے کئی سوال ماما نے بابا سے کیے لیکن بابا کا جواب وہی ہوتا جو دادو کی زبان پر ہر وقت رہتا۔

''کیا فرق پڑتا ہے' گھر کی بچیاں گھر ہی میں رہیں گی۔''

ماما تو میرے چہرے کی طرف دیکھ کے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا چاہ رہی تھیں کہ ''بچی اب بتاؤ' دعوے تو بڑے بڑے کر رہی تھیں۔ اب کیا ہوا۔'' اور میں...... میں اپنا حال کیا بتاؤں۔ میں سمندر میں گرا ہوا وہ ابابیل تھی کہ جس کو بچانے کے لیے کوئی تنکا نہ تھا یا پھر وہ پرندہ کہ جس کو اڑنے کے لیے کسی سمت کا پتہ نہ تھا۔

میں کیا کرتی؟ میں کیا کر سکتی تھی؟ دل تو کرتا کہ بیہ کو ہاتھ سے پکڑ کر عاصم کے پاس لے جاؤں اور

دونوں کی شادی کروا دوں۔

یا پھر سہیل سے منتیں کروں کہ خدا کے لیے تم بیہ سے شادی سے انکار کر دو' لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی قدم اٹھانا میرے لیے آسان نہ تھا کہ میں اندر سے بہت بدھو سی لڑکی تھی' ڈرنے والی' جھجکنے والی۔

میں آج سیدھی عاصم بھائی کے فلیٹ پہ آئی۔ وہ مجھے اس طرح اچانک صبح صبح سامنے پا کر خاصے حیران ہوئے۔

''زوبی! تم اتنی صبح؟ آج کالج نہیں گئیں۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟ مجھے فون کر دیا ہوتا۔'' وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھتے رہے۔

اور میں خاموشی سے بیٹھی ان کی طرف دیکھتی رہی۔ میری آنکھیں اور ان کا چہرہ کب نمی سے دھندلانے لگا مجھے اس کا علم ہی نہیں ہوا۔ میری آنکھوں کو دھندلانے والے وہی اشک کب میرے گال اور پھر گردن اور پھر چہرہ بھگو گئے۔ میں جان ہی نہ پائی۔

''عاصم بھائی!'' میں نے بے بسی کی انتہا پہ پہنچ کر ان کو آواز دی تھی۔

''کیا ہوا زوبی! کیوں رو رہی ہو گڑیا؟'' انہوں نے بہت پیار سے میرے آنسو پونچھے' خاور بھائی کی طرح۔

''عاصم بھائی! بابا نے اگلے ہفتے نکاح کی تاریخ طے کر دی ہے۔ ہم کچھ نہیں کر پائے بھائی! ہم کچھ نہیں کہہ پائے۔'' میں بلک کے رو دی اور اپنی ہی گود میں منہ چھپائے سسکتی رہی۔ اپنے رونے کی وجہ سے میں عاصم بھائی کے تاثرات دیکھ ہی نہیں پائی۔ کچھ دیر' بلکہ بہت دیر عاصم بھائی بھی خاموش رہے' پھر میرے سر پہ ہاتھ رکھ کے بولے۔

''گڑیا! روؤ مت' دیکھو رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جو اوپر بیٹھا ہوا ہے ناں' وہ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے اور قسمتوں کے کھیل بھی۔ ہم انسانوں کے ہاتھوں میں کچھ نہیں' سب اس اوپر والے کارساز کے ہاتھ میں ہے۔ زوبیہ کا مجھ سے بچھڑ جانا' تین طویل سالوں کے بعد تمہارا مجھے ڈھونڈنا اور پانا' یہ سب کچھ بھی کتنا معجزاتی طور پر ہوا ہے۔ بالکل ایسے ہی ہم کسی اور معجزے کے منتظر ہو سکتے ہیں۔ ہے ناں۔''

وہ میری طرف متوجہ تھے اور' میرے تو آنسو خشک ہو چکے تھے' اس عجیب شخص کی پر تاثیر گفتگو سے۔

''دیکھو زبیدہ! میں نہیں جانتا میں کیا کروں گا یا کیا کرنے والا ہوں' لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میرا پروردگار ضرور کچھ کرے گا۔'' ان کے اس کامل یقین پہ دنیا بھر کی خواہشیں قربان ہو سکتی تھیں۔ دنیا بھر کے خواب وارے جا سکتے تھے' پھر زبیدہ یا زوبیہ کے خواب تو کچھ نہ تھے۔

گھر میں تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ دادی اور چچی کے لیے تو صرف سات دن تھے اور تیاریاں سات سو۔ روز بازاروں کے چکر لگائے جاتے' مختلف کام کیے جاتے۔ ماما بے دلی سے ہی سہی لیکن ان سب کاموں میں حصہ ضرور لے رہی تھیں کیوں کہ انہیں میری یا عاصم بھائی کی طرح کسی معجزے پر نہ یقین تھا اور نہ انتظار۔ وہ ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر کی اطاعت گزاری کرنے لگیں اور ہر ایک کی منظورِ نظر بننے لگیں۔ دیکھا جائے تو ماما کا کوئی قصور نہ تھا' حالات ہی ایسے تھے۔

اور میں کتنی پاگل تھی' مجھے اپنی کوئی فکر نہ تھی کہ میں روحیل کو اپنا ساتھی بناؤں۔ مجھے اگر فکر تھی تو صرف بیبہ کی۔ عاصم کی بیبہ کی اور بیبہ کے عاصم کی بھی۔

یہ ہفتہ واقعی سات سو دنوں پہ نہیں' سات دنوں پر ہی مشتمل تھا اور یہ سات دن کس طرح بیتے' مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔

آج صبح گھر کے ہر فرد کے چہرے پر خوشی کے سائے رقصاں تھے کہ آج دوہری خوشی تھی۔ زوبیہ اور سہیل کی شادی اور میری اور روحیل کی۔ گیارہ بجے کے قریب مہمانوں کی آمد شروع ہونی تھی اور دن کو بارہ بجے نکاح۔

آج صبح ماما ہمارے کمرے میں آئیں اور ہم دونوں کے عروسی لباس ہمیں دے گئیں۔ بیبہ بظاہر بہت مطمئن تھی اور اس کا یہ اطمینان مجھے مشتعل کیے جا رہا تھا۔

''تم خوش ہو بیبہ باجی!'' میں نے نہ جانے کیوں پوچھ لیا۔

''اپنے لیے تو نہیں لیکن تمہارے لیے بالکل خوش نہیں ہوں۔'' وہ بہت بجھے بجھے انداز میں بولیں۔

''میری ایک بات مانو گی زوبی! تم پلیز آج گھر سے بھاگ جاؤ۔'' بیبہ نے یہ بات بہت ہی آرام سے کہہ دی۔ میں حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں زوبی! تم یہاں سے بھاگ جاؤ' کہیں بھی۔ کسی دوست کے گھر یا پھر میری کسی دوست کے گھر۔ صرف چند دنوں کے لیے۔ میں بعد میں سب کو سچائی بتا دوں گی اس طرح تمہاری شادی روحیل سے ہونے سے بچ جائے گی۔''

کتنی مشترکہ اقدار تھیں ہم بہنوں میں' وہ میری شادی رکوانا چاہتی تھیں اور میں ان کی۔

''ٹھیک ہے' لیکن میری شرط یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ بھاگو۔ اس طرح تمہاری شادی بھی سہیل سے نہیں ہو گی۔'' میں نے کمالِ اطمینان سے جواب دیا۔ اب کی بار میرا اطمینان انہیں مشتعل کر رہا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہو زوبی! میری شادی سہیل سے ہر صورت ہونی تھی لیکن تم' تم تو بے وجہ ہی پھنس گئی ہو۔''

''غلط بیبہ...... غلط۔ میں نے نہیں' تم نے خود بے وجہ پھنسایا ہے اس دلدل میں' کیوں کہ میرے آگے کوئی راہ' کوئی راستہ' کوئی روشنی نہیں لیکن تمہارے آگے ہے۔ عاصم نام کی راہ اور روشنی۔'' میرے کہنے پر بیبہ کچھ دیر حیران ہوئیں پھر ان کی آنکھوں میں ویرانیاں اترنے لگیں جیسے کہ آسمان سے اڑتا ہوا کوئی پرندہ آنگن میں آ بیٹھے۔ اسی طرح بیبہ کی آنکھوں میں ویرانی پتہ نہیں کہاں سے اتر کے آ بیٹھی تھی۔

''عاصم...... تم عاصم کو کیسے جانتی ہو؟'' بیبہ کا لہجہ اور آواز بہت مدھم تھی' شاید وہ خود کو بھی یہ نام سنانا نہ چاہتی تھیں۔

''بیبہ باجی! عاصم کو میں نے تمہاری آنکھوں میں دیکھا ہے' تمہاری باتوں میں دیکھا ہے' تمہارے دل میں دیکھا ہے۔ وہ کم از کم میرے لیے انجان نہیں۔''

''اچھا تو تم عاصم سے ملی ہو اسی لیے تم اس دن میرے دل میں محبت کا فلسفہ گھسانے کے چکر میں تھیں۔ یاد رکھو زوبی! عاصم میرا گزرا ہوا کل ہے' جس کا میرے آج سے کوئی رشتہ نہیں اور تم بھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرو تو بہتر ہے۔'' بیبہ کے سنہرے ماتھے پر پسینہ آ چکا تھا۔

''کروں گی' دنیا بھر سے کہوں گی' دکھاؤں گی تماشا تمام دنیا کو۔ ایک ایسی محبت کا کہ جو نہ جی سکتی ہے' نہ مر سکتی ہے' نہ کھل کے اپنا اعتراف کر سکتی ہے اور نہ اپنا گلا گھونٹ سکتی ہے۔'' میری آواز قدرے اونچی ہو گئی۔

''چپ رہو زوبیدہ! کوئی سن لے گا۔'' بیبہ سرگوشی میں بولیں۔

''نہیں سنے گا بیبہ' کوئی نہیں سنتا یہاں۔ سب کے سب بہرے ہیں۔ سب کی سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہیں۔ نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ سن سکتا ہے۔ نہ تمہاری سسکتی' تڑپتی محبت کو اور نہ تمہارے روندے مسلے کملائے خوابوں کو۔ نہ تمہارے بے بس دل کو اور نہ تمہاری تمناؤں کو۔'' میں پورے کمرے میں روتی پھر رہی تھی اور بولے جا رہی تھی۔

''بس کرو زوبی! بس کرو۔'' بیبہ بیڈ پہ بیٹھی رو رہی تھیں اور التجائیں کر رہی تھیں۔

''کیا قصور ہوتا ہے بیبہ آخر ہم لڑکیوں کا کہ ان کے خوابوں والی آنکھوں کو ہی چھین لیا جاتا ہے۔ ان کے خواب نوچ کے ان کے پاؤں میں رشتوں کی زنجیریں پہنا دی جاتی ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکتی بیبہ' یہاں تمہیں اس طرح تڑپتے اور نہ وہاں عاصم بھائی کو جھلستے۔ پلیز زوبیہ! تم شادی مت کرو سہیل سے۔ وہ تمہارے بغیر زندہ رہ لے گا لیکن عاصم نہیں رہ پائے گا۔ عاصم نہیں رہ پائے گا۔'' میں ہچکیاں لے لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ بیبہ میرے قریب آئیں اور مجھے گلے سے لگا کے روتی رہیں دیر تک اور اپنی خاموش محبت کا پہلا اقرار کرتی رہیں۔

بیہ نے مجھے تیار کیا اور پھر خود تیار ہونے بیٹھ گئیں۔ باہر مہمانوں کی آمد تقریباً شروع ہو چکی تھی۔ ہلکے میوزک کا شور اندر تک آ رہا تھا۔ میری سہیلیاں بھی آ چکی تھیں اور غالباً ابو کے خاص مہمان عاصم بھائی بھی۔ تھوڑی دیر بعد میوزک کی آواز کچھ مدھم پڑ گئی اور باہر سے باتوں کا ایک شور سنائی دیا اور یہ شور آہستہ آہستہ ہلکا ہو گیا۔ بیہ کچھ حیران ہوئی' پھر ہم نے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ اوپر کے لاؤنج میں سب ہی جمع تھے۔ بابا' ماما' دادو' چچی' چچا' روحیل' سہیل اور عاصم بھائی بھی۔ بابا صوفے پر بیٹھے بہت پریشان اور سہیل اپنی گردن جھکائے کھڑے تھے۔ چچا برس رہے تھے ان پر۔

''سہیل! تمہیں شرم نہیں آتی عین شادی والے دن انکار کرنے سے۔''

''نہیں ابا! مجھے زوبیہ سے شادی نہیں کرنی' اس کا چال چلن نہیں اچھا۔''

''خبردار سہیل خبردار! جو میری بچی کے کردار پر حرف بھی اٹھایا تو۔ میری بیٹیاں میرا غرور ہیں جنہوں نے آج تک میرے کسی فیصلے پر اُف تک نہیں کی' کوئی سوال تک نہیں کیا۔'' بابا انگلی اٹھا کے سہیل کو باور کرا رہے تھے۔

''ارے میری بچیوں نے تو صرف اپنے ماں باپ کی عزت رکھنے کے لیے ان پڑھ گنواروں سے شادی قبول کر لی۔'' ماما بھی برس پڑیں۔ پہلی بار ہی تو انہیں موقع ملا تھا۔

''سہیل بیٹا! میرے پتر' تجھے کیا ہوا ہے۔ کیوں پاگل پن کر رہا ہے۔'' دادو نے بھی اسے سمجھانا چاہا۔

''ناں دادی ناں' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں شادی نہیں کروں گا۔'' سہیل بھائی اسی ہٹ دھرمی سے بولے۔ بابا کا غصہ اب اشتعال میں بدل گیا۔ انہوں نے سہیل بھائی کا بازو پکڑ کر انہیں دھکیلا۔

''نکل جاؤ...... نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں اپنی بچیوں میں سے کسی کی شادی نہیں کرتا تم دونوں سے۔ تم کیا سمجھتے ہو' میری بیٹیوں کو تم سے بہتر کوئی اور رشتہ نہیں مل سکتا۔''

''نہیں بھائی نہیں...... یہ تو پاگل ہے' ایسا مت کرو۔'' چچا نے بابا کو سمجھانا چاہا۔

''چپ ہو جاؤ تم۔ صرف تمہاری محبت کی وجہ سے میں نے تمہاری ہر بات مانی۔ اپنی بیٹیوں سے کچھ پوچھا تک نہیں۔ جاؤ' لے جاؤ اپنے دونوں بیٹوں کو اور چلے جاؤ میرے گھر سے۔'' بابا چچا سے اونچی آواز میں مخاطب تھے۔

''ناں بیٹا فرخ ناں۔'' دادی رونے لگی تھیں۔

''اماں جی! میری نیک بچی پہ یہ لڑکا الزام لگا رہا ہے۔ اس نے کبھی سوچا ہے کہ یہ میری بیٹی کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ میں ہی پاگل تھا جو پتھر کو پکھراج تھمانے چلا تھا۔ دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔ چلے جاؤ یہاں سے سب کے سب۔'' بابا نے چچا کی اور ان کے بیٹوں کی اچھی خاصی بے عزتی کی۔ وہ وہاں

سے جانے لگے تھے کہ بابا نے انہیں عقب سے آواز دی۔

''رکو سہیل! میری بچی پہ تم الزام لگا رہے تھے ناں۔ ابھی دیکھو۔'' بابا نے عاصم کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔

''عاصم! کیا تم میری بیٹی سے شادی کرو گے؟'' عاصم بھائی نے پہلے کچھ حیرانی سے دیکھا اور پھر گردن اثبات میں ہلا دی۔ بابا پھر زوبیہ کے پاس آئے۔

''زوبیہ! کیا تم اس لڑکے سے شادی کرو گی؟'' بیہ کی سمجھ میں آدھی باتیں ابھی تک نہیں آ رہی تھیں کہ عاصم کہاں سے آیا۔ بابا سے کیسے ملا اور بابا کیا کرنے جا رہے ہیں۔ بیہ روتی ہوئی بابا سے لپٹ گئی۔

''جہاں آپ کی خوشی ہو گی بابا! مجھے کوئی انکار نہیں۔''

اپنی فرمانبردار بچی کے منہ سے یہ جملہ سن کے بابا بہت خوش ہوئے پھر سہیل کو مخاطب کر کے بولے۔

''دیکھو...... یہ ہے میری بچی! صرف میری رضا کے لیے اس نے ایک انجان لڑکے کا ساتھ قبول کر لیا۔ تم اس دودھ کو میلا کر رہے تھے؟ تم اس دامن کو داغ دار کہہ رہے تھے۔''

سہیل اور چچا کی گردنیں جھک گئیں۔

''اگر اس بچے اور میری زوبیہ کی شادی دیکھنا چاہتے ہو تو رک جاؤ ورنہ ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔''

اور پھر اس طرح ایک معجزہ ہو گیا۔ قسمتوں کا یہ اچانک فیصلہ ہونا تھا۔ یہ حقیقت کتنی خواب پہ مشتمل تھی۔

اس طرح میری بیہ اپنے عاصم کی ہو گئی۔

عاصم بھائی اس جیت پہ بہت خوش تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور سرگوشی میں بولے۔

''دیکھا گڑیا! میرا اللہ کتنا عظیم ہے۔''

ماما اس مسرت کو سنبھالے نہ پا رہی تھیں اور پھر اس طرح میری بیہ اپنے من چاہے پیا کے گھر سدھار گئیں اور میری بھی شادی روحیل سے ہونے سے بچ گئی۔

آج میں بہت مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سہیل بھائی تھے۔ آج میں ان سے ناراض نہ تھی بلکہ خوش تھی۔ وہ بڑے تھکے تھکے انداز میں بولے۔

''گڑیا! میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ اس دن تم نے مجھے محبت کا فلسفہ بہت اچھی طرح سمجھایا تھا۔ میں نے تمہاری بیہ باجی کے رنگ اسے لوٹا دیے ہیں' ان رنگوں کو دھول مٹی میں رُلنے سے بچا لیا ہے۔ آج صبح میں تمہارے کمرے میں بنا کسی ارادے کے آ رہا تھا تو اندر سے مجھے تمہاری آوازیں آئیں۔ تم کہہ رہی تھیں ناں زوبی کہ یہاں سب کے سب بہرے اور اندھے ہیں۔ میں نے

ثابت کر دیا کہ میں اندھا اور بہرا نہیں۔ زوبیہ سے اس کے رنگ کوئی نہیں چھیننے لگا۔'' یہ کہہ کر سہیل بھائی نے فون رکھ دیا اور ان کی باتوں نے ان کی قدر میرے دل میں بہت بڑھا دی اور پہلی بار میں نے سوچا کہ انسانیت صرف تعلیم سے ہی نہیں آتی' قدرت کی طرف بھی ملتی ہے۔ آج بہت دنوں بعد میں سکون کی نیند سوئی تھی۔

اگلی صبح عاصم بھائی اور بیہ باجی سب سے ملنے آئے تھے۔ بیہ ایک ہی رات میں بہت بدلی بدلی لگ رہی تھیں۔ کھلی کھلی نکھری نکھری۔

بابا' ماما' خاور بھائی' دادو سبھی بظاہر خوش تھے۔ سب کے ساتھ ناشتا کرنے کے بعد بیہ اور عاصم میرے کمرے میں آئے۔ بیہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''زوبی! مجھے عاصم نے سب بتا دیا ہے کہ کس طرح تم نے اسے ڈھونڈا' کس طرح اسے میری مجبوریوں کا یقین دلایا اور کس طرح ناممکن کو ممکن بنایا۔''

''ہاں زوبی! یہ معجزہ ضرور تھا لیکن اس میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا تھا' اس ننھی سی لڑکی کا جو بقول زوبیہ کے ہر وقت خوابوں کے پیچھے رہتی تھی اور پاگلوں سی باتیں کرتی تھی۔'' عاصم بھائی نے خلوص سے کہا۔

''آج ہم دونوں تمہیں تھینکس کہنے آئے ہیں۔'' زوبیہ مسکرا کے بولیں۔

بیہ کو اپنا عاصم مل گیا۔ وہ اپنے گھر کی ہو گئیں۔

اور میں...... میرا کیا ہے۔ مجھے کبھی نہ کبھی پھر کوئی سر احد مل جائیں گے۔ آخر ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ چلیں اب میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتی ہوں کہ کل مجھے پھر اپنی چنڈال چوکڑی دوستوں سے اتنے دنوں بعد کالج میں ملنا ہے۔ میرے خوابوں کے لیے دعا کیجیے گا کہ مجھے بھی جلد ہی کوئی عاصم مل جائے اور میری دنیا نکھر جائے۔

***

مجھے پوجنے کو صنم ملا

کون یہ جانے کس موسم میں کب سچ بول سکیں گے
جب الفت کی رسم چلے گی تب سچ بول سکیں گے
آنکھیں بھی سچ بول سکیں گی لب سچ بول سکیں گے
سچ کہنے کا جب سیکھیں گے ڈھب بول سکیں گے

مانو بلی چھوٹی سی...... چھوٹی سی پر موٹی سی۔ جی چاہتا ہے دُم پکڑوں...... دُم پکڑوں یا چکر دوں لیکن وہ گھبرائے گی...... میرے پاس نہ آئے گی۔

ستارہ بھابی بلند آواز میں کہتیں اور ان کے پانچ عدد شاگرد ان کے پیچھے بلند و بانگ آواز میں دہراتے۔ ان کے گلوں سے نکلنے والی پھٹے بھونپو جیسی آواز تو مجھے کچھ زیادہ نہ بھاتی لیکن دوبارہ پھر جب ستارہ بھابی کی ستاروں سی جگمگاتی آواز ابھرتی تو میں کچن میں کھڑا کھڑا جھوم اٹھتا۔ میرا دھیان پل بھر کے

لیے ان برتنوں سے ہٹ جاتا' جنہیں میں بے دلی سے ہی سہی لیکن دھو ضرور رہا ہوتا۔ یوں تو میں 'بلال منزل' میں پچھلے دو سال سے کام کر رہا ہوں' جب میں صرف دس سال کا تھا لیکن سچ پوچھیں تو میں پہلے یہاں بڑا غم زدہ رہتا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اپنے اماں ابا بڑے یاد آتے تھے۔ اپنا چھوٹا بھائی پپلو اور بہن صائمہ کے ساتھ کھیلنا یاد آتا تھا۔ گھر کے باہر کھیتوں میں دوستوں کے ساتھ دوڑنا' ٹیوب ویل میں نہانا میں بھول ہی نہیں پاتا تھا۔ یہاں شہر آ کر بھی مجھے اپنے گاؤں کے وہ پیڑ یاد آتے تھے جن پر اکثر چڑھتے ہوئے میں گر پڑتا تھا اور اپنے کئی پرزے تڑوا چکا تھا۔

اماں' ابا کا مجھے یہاں لانا بھی بے مقصد نہ تھا۔ ایک تو گھر کے حالات ٹھیک نہ تھے۔ ابا بیمار پڑ گئے تھے اور گھر میں فاقے ہونے لگے تھے۔ اماں دن بھر کھیتوں میں کام کرتیں پھر بھی مشکل سے گزارا ہوتا' اوپر سے ہم چھ بھائی بہن۔ ایسے میں اماں کو کسی پڑوسن نے بتایا کہ کراچی شہر جا کر اپنے لڑکوں کو کام پہ لگاؤ۔ اچھے پیسے بھی ملیں گے اور ان کے روٹی کپڑے کی بھی فکر نہ رہے گی۔ کام بھی سیکھتے رہیں گے جیسے ہی کام سیکھ جائیں تو زیادہ پیسوں پہ کہیں اور کھڑا کر دینا لہٰذا اماں نے اسی پڑوسن کے شوہر خادم چاچا کے ساتھ مجھے اور میرے بڑے بھائی غلام رسول کو شہر بھیج دیا۔ غلام رسول کو بڑی جلدی کسی نے رکھ لیا کیونکہ وہ تیرہ سال کا تھا اور مجھ سے زیادہ چالاک بھی' باتیں کرنے اور تعریفوں کے پل باندھنے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا اور میں اس کا بھائی ہونے کے باوجود بھی بدھو اور گنوار تھا۔ نہ بولنے کی تمیز تھی اور نہ کام کرنے کی لہٰذا جو بیگم مجھے دیکھتی یہی کہتی اس سے تو کچھ نہ کیا جائے گا اور پھر کوئی پندرہ دن کی جان توڑ کوشش کے بعد ہم بلال منزل آئے۔ جہاں بیگم صاحبہ تسنیم آرا' ان کے دو بیٹے بلال بھائی اور طلال بھائی اور ایک عدد تنک چڑھی بیٹی سلمٰی رہتے تھے۔ ان دنوں تسنیم آرا کی طبیعت خراب تھی اور ان کا پہلے والا نوکر بھاگ گیا تھا لہٰذا انہیں جو ملا اسے انہوں نے قبول کر لیا اور اس طرح خادم چاچا مجھے ان کے گھر چھوڑ کر واپس گاؤں چلے گئے۔

طلال بھائی اور سلمٰی بی بی صبح کالج جاتے اور شام کو آتے' بلال بھائی نوکری کرتے تھے۔ رہ جاتے گھر میں' میں اور بیگم صاحبہ' جو کہ مزاج کی جتنی گرم تھیں ڈیل ڈول کی اس سے زیادہ ڈراؤنی۔ بھاری بھرکم وجود سانولے سے نقش' آنکھوں پہ چڑھا موٹا سا چشمہ اور تڑتڑ چلتی زبان۔ سچ پوچھیں تو چند ہی دنوں میں ان کے رویے سے تنگ آ گیا۔ کام سیکھنے میں تو مجھے زیادہ وقت نہ لگا لیکن تسنیم بیگم اتنا کام بتاتیں کہ میں تنگ آ جاتا۔

''ماشاءاللہ...... یہ برتن کیا تیرا ابا آ کر دھوئے گا۔''

''یہ کونے کا کچرا نظر نہیں آتا تجھے۔ آنکھوں میں کیا روشنی نہیں ہے۔''

''موئے...... سبزی اس طرح کاٹتے ہیں۔''

تسنیم بیگم کے اس طرح کے جملے دن بھر پورے گھر میں گونجتے رہتے اور میں ہر وقت اپنی قسمت پہ

رونے کے ساتھ ساتھ ان کو کوستا بھی رہتا۔ گھر کا کام بھی مجھے اتنا دردناک نہیں لگتا تھا جتنا کہ تسنیم بیگم کا رویہ۔ وہ مجھے کسی انسان کا نہیں بلکہ کتے کا پلا سمجھتی تھیں اور ڈھیروں ڈھیر کام کے ساتھ اپنی زبان کے زیر و بم بھی مارتی رہتی تھی۔ حقیقت میں ان دنوں زندگی کتنی بے رنگ' کتنی بے رونق' کتنی آزردہ ہو گئی تھی......

اور پھر انہی بے رنگ سے دنوں سے ایک جگمگاتی شام پھوٹی' ہوا کا ایک معطر سا جھونکا آیا اور میری زندگی کے روز و شب مہکا گیا۔ جگمگاتی کہکشاؤں کی چھاؤں چار سو پھیلی اور فضا جگمگا اٹھی۔ بلال منزل میں ستارہ نام کی روشنی جگمگائی۔ بلال بھائی کی نوکری پکی ہوئی تو انہوں نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ پہلے تو بیگم صاحبہ خاصی درشت ہوئیں' کئی دنوں تک بلال بھائی سے ناراض رہیں' کھانا چھوڑا' لیکن بلال بھائی بھی اپنی ضد پہ قائم رہے' گھر چھوڑ جانے کی دھمکی دی اور مجبوراً ماما کو ماننا ہی پڑا۔ خاندان اونچا تھا' لڑکی اچھی تھی' بیگم صاحبہ خوش ہو گئیں اور دو ماہ ہی کے اندر اندر ستارہ بھابی بلال بھائی کے آنگن میں جگمگانے لگیں۔

سچ پوچھیں تو ان کے آنے سے جہاں بلال بھائی کی زندگی روشن ہوئی تھی وہاں میری بھی' کیونکہ اب گھر کا زیادہ کام انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ کچن ان کے انڈر آ گیا تھا اور تسنیم بیگم ریٹائر ہو گئی تھیں۔ بس ان کی زبان ابھی بھی اسی عہدے پہ فائز تھی' بلکہ کبھی کبھی ستارہ بھابی پر بھی برستی تو ان کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی کڑھتا تھا۔ اتنی پیاری تو تھیں وہ۔ دمکتی دودھیا رنگت' بڑی بڑی براؤن آنکھیں' دراز زلفیں اور نازک سا وجود۔ روٹی بیلتے وقت جب ان کی چوڑیاں کھنکتی تھیں تو دل میں مجھے ایک عجیب سی گدگدی ہوتی تھی کہ اس بیلن کی وقعت اور قسمت بھی مجھ سے اچھی ہے جو ستارہ بھابی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی مٹھیوں کی گرفت اس پر ہے۔ ستارہ بھابی کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ کام لیتی بھی تھیں لیکن بہت پیار سے۔ مجھے بہت پیار سے سنی بلاتیں اور مجھے اپنے آپ پہ رشک آتا......

اور جب میں کام ان کی مرضی کے مطابق اچھا کرتا تو وہ میرے گھنگھریالے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیر دیتیں اور میں من ہی من میں جھوم اٹھتا تھا۔ میں ان کے آنے کے بعد زندگی سے بہت خوش رہنے لگا تھا' اب مجھے پپلو اور صائمہ یا اماں' ابا نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ پہلے تو یونہی جیتا تھا۔

ان دنوں میری زندگی کا صرف ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ بلال بھائی۔ جو بے شک میرے ساتھ جتنے اچھے تھے مگر مجھے ناپسند تھے' وہ ستارہ بھابی کے ساتھ ہنستے' چھیڑ خانی کرتے' باتیں کرتے یا کھانا کھاتے تو میں بہت اداس ہوتا۔ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا' بلال بھائی کو بددعا دیتا' تنہائی میں اپنی حیثیت یاد کر کے پریشان ہوتا' لیکن میری یہ پریشانی اس طرح دور ہوئی کہ بہت ہی جلد بلال بھائی کا تبادلہ دبئی ہو گیا۔ تقریباً ایک سال کے لیے' کسی کام کے سلسلے میں۔

پہلے تو ستارہ بھابی بہت روئیں' کئی دن انہیں بخار رہا' مگر پھر سب نے انہیں سمجھایا' کئی دلیلیں دیں اور اس طرح وہ راضی ہوگئیں بلال بھائی کو بھیجنے کے لیے اور یوں بلال بھائی دبئی چلے گئے اور میری ساری پریشانی کم از کم ایک سال کے لیے تو دور ہوئی۔

☆

''سنی...... اوسنی...... مجھے اچھی سی چائے تو بنا دو۔ بچوں کو پڑھا پڑھا کر سر دکھ رہا ہے۔'' ستارہ بھابی کی آواز مجھے ماضی سے باہر کھینچ لائی اور میں نے فوراً برتن سمیٹے کیتلی میں چائے کے لیے پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیا۔ ان کے مخصوص مگ میں چائے ڈال کر میں لاؤنج میں پہنچا تو وہ وہاں نہ تھیں۔ چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے میں ان کے کمرے میں آ گیا۔ وہ بستر پر نیم دراز ایک پاؤں کے اوپر دوسرا پاؤں رکھے ٹی وی چینل بدلنے میں مصروف تھیں۔ ان کا چہرہ سنجیدہ اور متین سا تھا۔ میں نے کپ ان کی طرف بڑھایا تو وہ متوجہ ہوئیں۔

''بھابی...... چائے۔'' میرے کہنے پر وہ مسکرائیں اور ہاتھ بڑھا کر کپ لے لیا میں جانے کے لیے مڑا تو انہوں نے مجھے پکارا۔

''سنی...... تمہیں کوئی کام ہے کیا؟''

''نہیں بھابی! برتن دھو لیے تھے' سبزی کاٹنے میں ابھی دیر ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر ذرا ادھر بیٹھ کر میرا کام ہی کر دو۔ میرے ڈریسنگ ٹیبل کی ساری چیزیں ہٹا کے انہیں صاف کر کے سیٹ کر دو۔'' وہ بہت تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔ میرے لیے اس حکم سے بڑھ کر بھلا اور کیا حکم ہو سکتا تھا۔ میں جھٹ سے گیا اور ڈسٹنگ والا کپڑا اٹھا کر آ گیا اور ان کی ڈریسنگ ٹیبل سے چیزیں اٹھا کر صاف کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگیں۔

''تمہارے گھر میں کتنے لوگ ہیں ثناء اللہ۔'' وہ تھوڑی دیر بعد بولیں۔

''ہمارے گھر میں جی...... ہم چھ بہن بھائی' ابا' اماں اور بوڑھے دادا ہیں۔'' میں نے دانت نکال کر خوشی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں ان سب کی یاد نہیں آتی؟'' ان کی طرف سے ایک اور سوال آیا۔

''یاد تو آتی ہے جی...... لیکن کیا کریں نوکری تو کرنی ہے ناں۔'' میں نے کہا۔

وہ کہیں کھو سی گئیں۔ ان کے صبیح چہرے پہ کتنے ہی دکھ کے سائے جمع ہوگئے۔ ''ہاں نوکری تو کرنی ہے...... چاہے یاد روح کو نوچتی رہے' جینا سوہانِ روح بن جائے...... چار دن کی زندگی بھی جدا رہ کر گزاری جائے...... لیکن نوکری تو کرنی ہے۔ نوکری تو ضروری ہے...... اپنوں سے بھی زیادہ' محبت سے بھی بڑھ کر۔'' وہ منہ ہی منہ ہولے ہولے کچھ کہتی رہیں جو کہ کم از کم میری سمجھ سے باہر تھا لیکن ان کی

آنکھوں میں چمکنے والا پانی مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

چیزیں صاف کرتے کرتے میرے ہاتھ سے تصویر کا فریم گر گیا' وہ اپنے خیالوں سے چونکیں' یہ تصویر ان کی شادی کی تھی' جس میں وہ سرخ زرتار لہنگے میں ملبوس دنیا کی خوب صورت ترین دلہن بنی بیٹھی تھیں اور بلال بھائی ان کے چہرے کو دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔

''یہ تصویر مجھے دینا۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے وہ فریم ان کو دیا تو انہوں نے اپنی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور اس کی طرف کروٹ لے کر لیٹ گئیں' جانے اس تصویر میں وہ کیا ڈھونڈنے لگیں۔

''صفائی کر لو تو یہ کپ اٹھا لینا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے جانا۔'' انہوں نے چادر اپنے اوپر لی اور اس تصویر کی طرف چہرہ کر کے سو گئیں جیسے کہ اس تصویر سے انہوں نے باتیں کرنی ہوں' چپکے سے سرگوشیوں میں۔

بلال بھائی کے جانے کے بعد ستارہ بھابی بہت اداس ہوگئی تھیں۔ ان کی وہ کھنکتی ہنسی' چھنکتی چوڑیاں' رنگ برنگے پراندے' سب کہیں کھو گئے تھے۔ سارا سارا دن وہ چپ رہتیں' اپنے کمرے میں بند رہتیں' کبھی کبھی کام کے لیے باہر آتیں ورنہ گھر میں ہی اداس سی پھرتی رہتیں۔

رات کا کھانا ان کو بنانا تھا' لیکن شاید انہیں نیند آ گئی تھی اس لیے غصے کے مارے بیگم صاحبہ نے دال پکانے چولہے پر رکھ دی تھی اور بازار سے نان بھی منگوا لیے' جس وقت ستارہ بھابی نیند سے جاگ کر باہر آئیں تو سب لوگ ٹیبل پہ کھانا کھا رہے تھے۔

''یہ کیا امی جان...... آپ نے کھانا بنا لیا' مجھے جگایا کیوں نہیں۔'' ستارہ بھابی شرمندہ سی ہوگئیں۔

''نہیں' نہیں بہو...... تم سو جاؤ...... تمہاری نیند زیادہ ضروری ہے' ہم لوگ چاہے بھوکے مر جائیں' ہمارا کھانا بنانا کوئی تمہاری ذمہ داری تھوڑی ہے۔'' بیگم صاحبہ نے طنز کے نشتر چلائے۔

''امی جان! ایسی کوئی بات نہیں۔ بچوں کو پڑھا کے ذرا سر دکھنے لگا تھا لیٹی تو نیند آ گئی۔'' ستارہ بھابی نے کمزور سا عذر پیش کیا۔

''بہو بیگم! ایک بات یاد رکھو' تمہاری شادی صرف بلال سے نہیں اس کے پورے گھر سے ہوئی ہے۔ یوں بے دلی سے' جان کا روگ سمجھ کے کام کرو گی تو مجھ سے برداشت نہ ہوگا' توبہ ہے ایک ہمارا زمانہ تھا۔ میاں شہر میں کام کرتا تھا' دو دو ماہ بعد آتا تھا۔ ہم اس کے ماں باپ' بھائیوں بھابیوں کی خدمت کر کے بچی کھچی کھا کے گزارا کرتے تھے اور ایک یہ ہیں آج کی دلہنیں۔ میاں دو پیسے کمانے ذرا باہر کیا گیا ان کے لیے تو پوری دنیا ویران ہوگئی۔'' تسنیم بیگم بڑبڑاتی ہوئی ستارہ بھابی کا دل جلاتی اپنے کمرے میں چلی گئیں اور ستارہ بھابی دل ہی دل میں روتی ہوئی کچن میں آ گئیں اور سنک کا پانی کھول کر فضول میں اپنے ہاتھ دھونے لگیں۔ سنک کے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ان کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ پانی گرتا رہا' اور میرے

دل میں تسنیم بیگم کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ ایک گھنٹہ سو کر کیا ستارہ بھابی نے گناہ کر دیا تھا کہ وہ ان سے اتنی خفا ہو گئیں اور اگر انہوں نے اپنے بچوں کے لیے خود کھانا بنالیا تو کیا تیر مار لیا۔

ستارہ بھابی کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو گرتے رہے اور میں ان کے آنسوؤں میں خود کو ڈوبتا سا محسوس کرنے لگا۔

☆

کسی پیرہن پر منقش ہوئی
کسی آئینے میں سجادی گئی
کسی گھر سے مجھ کو اٹھایا گیا
کسی گھر میں لا کر بٹھادی گئی
جہاں جی میں آیا ہے رکھا مجھے
جہاں سے بھی چاہا ہٹادی گئی

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ستارہ بھابی کی آنکھوں کے ستارے ماند پڑتے گئے۔ وہ دن بہ دن مرجھاتی گئیں۔ ایک ایسے پھول کی طرح جو کہ گل دان میں سجے سجے کمرے کی زینت تو بڑھا رہا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ کملا رہا ہوتا ہے۔ اس کی سانسیں ختم ہوتی رہتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ستارہ بھابی پوری دنیا سے کٹنے لگی تھیں۔

آج بھی ان کی طبیعت خراب تھی۔ دو دن سے شدید بخار انہیں نڈھال کیے ہوئے تھا۔ تسنیم بیگم نے دودھ گرم کر دیا اور مجھے پکڑا دیا کہ میں ان کے کمرے میں جا کر دے آؤں۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی شامیں تھیں۔ یوں لگتا تھا آسمان سے ٹھنڈ اتر کر ہر کسی کی شریانوں میں اتر آئی ہو۔ دروازے دیواریں' کھڑکیاں سبھی برف کی سل کی مانند یخ ہو جاتی تھیں۔ میں ستارہ بھابی کے کمرے میں آیا تو وہ پھول دار رضائی میں اپنا نازک سا وجود چھپائے سامنے رکھے ٹی وی سے کھیل رہی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل تبدیل کرتیں تو کبھی آواز بڑھا دیتیں۔ میں نے دودھ ان کے سامنے والی ٹیبل پر رکھا تو وہ میری جانب متوجہ ہوئیں۔

''سنی! کچھ دیر ادھر بیٹھ جاؤ۔'' ان کے لہجے میں عجیب سی ایک کسک تھی۔ اس وقت میرا عامیانہ وجود بھی انہیں بہت خاص لگ رہا تھا۔ اس وقت میری ان کے سامنے موجودگی گویا کسی خاص الخاص انسان کی سی تھی۔

''ہاں...... کچھ دیر یہاں بیٹھو' مجھ سے باتیں کرو' باہر بھی تو نہیں نکلی میں کل سے اور نہ ہی کوئی اندر آیا ہے۔'' وہ اسی کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولیں۔

''ستارہ بھابی! آپ باہر نہیں آتیں تو گھر بھی سونا سونا لگتا ہے۔ سچ میں اس گھر کی رونق آپ ہی سے ہے۔'' میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔

''چل جھوٹے...... یوں ہی مخول کرتا ہے میرے ساتھ۔'' وہ دھیمے سے مسکرادیں۔ میں کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

''سن...... امی مجھ سے ناراض ہوں گی؟ کچھ کہتی تو ہوں گی؟'' کہتی تو تسنیم بیگم بہت کچھ تھیں لیکن فی الحال میں ستارہ بھابی کو کچھ بھی بتا کے اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں...... نہیں ستارہ بھابی! کچھ بھی نہیں کہتیں وہ' اگر کہیں بھی تو آپ دل پہ نہ لیا کریں۔ مجھے دیکھیں میں بھی تو روز ان کی جھاڑ کھاتا ہوں' ہوا ہوں کبھی آپ کی طرح بیمار' وہ جی میرے ابا کہتے ہیں کہ دنیا والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فولادی روح کا ہونا ضروری ہے' ورنہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔'' میں نے اپنی طرف سے مفکرانہ بات کی۔ ستارہ بھابی نے ستائشی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

''یہ بتا...... روزانہ سبزی ترکاری لینے کون جاتا ہے؟'' وہ بولیں۔

''وہ...... وہ تو بیگم صاحبہ لسٹ بنا کر دے دیتی ہیں اور میں فضلو چاچا کے ساتھ جا کر لے آتا ہوں۔'' میں نے چہک کر کہا۔

''کل سے تیرے ساتھ میں بھی جایا کروں گی۔''

''آپ...... آپ؟'' میں نے بے یقینی سے آنکھیں پھاڑیں۔

''ہاں...... سوچ رہی ہوں گھر پہ پڑے پڑے تو بیمار ہی ہوتی رہوں گی۔ کسی بہانے باہر نکلوں تو کچھ ذہن تبدیل ہوگا۔ غلط تو نہیں ہے نا؟'' انہوں نے مجھ سے گویا رائے مانگی۔

''اونہیں جی...... کچھ غلط نہیں' آپ گھومو پھرو' گھر پہ آپ ٹھہریں گی تو بیگم صاحبہ آپ کو بھی اپنی طرح بڈھا کر دیں گی۔'' میری اس غیبت سے ستارہ بھابی نے کھل کر قہقہہ لگایا اور میں ان کے زرد چہرے پر بکھرتی ہلکی سی سرخی کو دیکھتا رہ گیا۔ آج سے میرا ان کے ساتھ رازداری کا ایک نیا رشتہ استوار ہوا تھا۔

بیگم صاحبہ کے اعتراض کے باوجود بھی ستارہ بھابی نے میرے ساتھ سبزی خریدنے کی ذمہ داری اٹھا لی۔ ہم روزانہ صبح نو بجے گھر سے نکلتے فضلو چاچا کے ہمراہ' جو کہ اس گھر کا پرانا ڈرائیور تھا۔ سبزی کی دکان سے سبزی' بیکری سے انڈے' ڈبل روٹی لیتے' واپسی پہ کبھی مالٹے تو کبھی گنڈیریاں کھاتے' ستارہ بھابی باتیں کرتیں اور میں سنتا۔ کبھی میں انہیں پکوڑے کھلاتا تو کبھی دہی بڑے۔ میری زندگی کی تو وہی صبحیں پر رونق تھیں۔ دل کرتا اسی طرح اس اجنبی شہر کے اجنبی راستوں پر ستارہ بھابی کے ساتھ گنڈیریاں کھاتا رہوں اور لطف اندوز ہوتا رہوں۔ یہ راستے' یہ دن کبھی ختم نہ ہوں اور یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ ہم اکثر سبزی خریدنے کے بعد کسی بازار کی طرف نکل جاتے' جہاں ستارہ بھابی کتنی دیر تک کپڑے دیکھتیں' زیوروں کی

قیمت دریافت کرتیں' جوتوں کے ڈیزائن دیکھتیں لیکن گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یونہی ضائع کرنے کے بعد خالی ہاتھ ہی واپس آ جاتیں۔ گھر آنے کے بعد وہ پہلے سبزی بناتیں اور پھر کچھ دیر ٹی وی پہ کوئی فلم دیکھ لیتیں۔ شام کو ان کے پاس پڑھنے والے بچے آ جاتے اور اس طرح وہ دن بھر مصروف رہتیں۔ اب ان کی اداسی ختم ہونے لگی تھی کیونکہ اب ان کے پاس اداس رہنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ وہ خوامخواہ اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈ لیتیں۔ رات دیر تک خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتیں اور جب تک ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل نہ ہو جاتیں تب تک وہ کام کرتیں۔ اکثر رات گئے اٹھ کر شوکیس کے برتن نکالتیں' انہیں صاف کر کے ان کی دوبارہ سیٹنگ کرتیں۔ کتنی دیر گھر کی بالکنی میں کھڑی چپ چاپ کچھ سوچتی رہتیں۔

تنہا تو وہ یقیناً تھیں......اور پھر کیسے نہ ہوتیں۔ ایک نو بیاہتا دلہن اس قدر تنہا زندگی گزار رہی ہو......تو وہ یقیناً ویسی ہی ہو جاتی جیسی ستارہ بھابی ہو گئی تھیں۔ ان کی تنہائی سے میرا دل کڑھتا تھا۔ میرے دل میں وہ احساس جاگتے جو پہلے کبھی نہ جاگے تھے۔ میں سوچتا کہ کاش میں عمر میں ان کے برابر ہوتا' ان کا ہاتھ تھام کر انہیں یقین دلاتا کہ آپ کے ہر دکھ کا مداوا میں ہوں' خدارا آپ تنہا نہ ہوں' کیونکہ آپ کے ساتھ میں ہوں' آپ کا اپنا میں ہوں' آپ کا دوست میں ہوں' لیکن اگر ایسا ہوتا تو کیا وہ میری دوستی میرا ساتھ قبول کرتیں؟ یقیناً نہیں کیونکہ میں' میری حیثیت' میری جگہ' بلال بھائی کا نعم البدل ہرگز نہ تھی۔

بلال بھائی کے ہفتہ بعد آنے والے فون کالز میں بھی اب کچھ ناغہ ہونے لگا جس کا اثر ستارہ بھابی نے کافی گہرائی سے لیا۔ دو دن وہ سبزی خریدنے بھی نہیں گئیں' تیسرے دن وہ میرے ساتھ نکلیں' سبزی خریدنے کے بعد انہوں نے ایک مخصوص کپڑے کے بازار کا رخ کیا۔ سلک' جارجٹ' سوتی' کاٹن' ساٹن' فلیٹ' شیفون' انہوں نے کئی طرح کے سوٹ خریدے۔ دکان دار سے کچھ باتیں کیں اور دو تین درزیوں کے پاس بھی گئیں۔

گھر آ کر انہوں نے گھر کے پچھواڑے بنے اسٹور روم کو میرے ساتھ مل کر صاف کیا۔ کئی فضول چیزیں باہر نکلوائیں اور اس جگہ کو بیٹھنے کے قابل بنایا۔ انہوں نے ایک نئی مصروفیت پالنے کا سوچا تھا' جس پر بھی تسنیم بیگم نے شور مچایا لیکن ستارہ بھابی کو کوئی پرواہ نہ تھی۔ انہوں نے سلمیٰ باجی کو بھی اپنے کام میں شامل کیا اور کاغذ پہ کپڑے ڈیزائن کرنے لگیں۔ اگلے دن سے دو عدد درزی ہمارے گھر آنے لگے اور اسٹور روم میں بیٹھ کر کاغذ پہ بنے ان ڈیزائنوں کو کپڑوں پر بنانے لگے۔ اس طرح تقریباً مہینہ بھر ہی میں کئی سارے ریڈی میڈ سوٹ تیار ہو گئے جنہیں ستارہ بھابی بڑی بڑی دکانوں پہ لے جا کر فروخت کرنے لگیں۔ گھر میں پیسے آنے لگے اور اس طرح اسی اسٹور روم کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرا بنایا گیا جہاں درزیوں کو بٹھایا جانے لگا اور نچلا حصہ 'پہناوا بوتیک' بن گیا۔

گھر چونکہ مین روڈ پر ہی تھا لہٰذا لوگوں کے متوجہ ہونے میں بالکل وقت نہیں لگا اور آہستہ آہستہ لوگ

اس جانب متوجہ ہوئے اور ستارہ بھابی کا یہ بزنس چل پڑا۔ وہ حد سے زیادہ مصروف رہنے لگیں۔ اب ان کے کسی فعل پر تسنیم بیگم کو کوئی اعتراض نہ تھا اور اگر کبھی اعتراض ہوتا تو ستارہ بھابی اس اعتراض کا منہ پیسوں سے بند کر دیتیں۔ اب گھر کے کئی خرچے ستارہ بھابی کے پیسوں سے پورے ہوتے' بلال بھائی کی بھیجی رقم زیادہ تر تسنیم بیگم بینک میں جمع کروا دیتیں۔

ان دنوں ستارہ بھابی کے نزدیک میری حیثیت پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ کورا گنوار تو میں پہلے بھی نہ تھا' پھر ستارہ بھابی نے کچھ پڑھایا تو میں حساب کتاب کرنے کے قابل ہو گیا۔ اب درزیوں' دکان داروں کا حساب میں بھی کر لیا کرتا تھا۔ تیرہ برس پورے کر چکا تھا' قد کاٹھ بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور تسنیم بیگم کے دیسی گھی میں پکے کھانوں نے وزن بھی کئی گنا بڑھا دیا تھا لہٰذا میں کہیں سے بھی گھر کا ملازم محسوس نہ ہوتا تھا۔ ستارہ بھابی مجھ پہ اعتماد کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے میرے سادہ سے حلیے کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ میلے کچیلے پرانے کپڑوں میں گھر کے شیشے اور باتھ روم صاف کرنے والا ثناء اللہ اب پینٹ شرٹ میں پھرنے والا سی بن چکا تھا۔ گھر پر بھی میں اب صرف کچن سنبھالتا تھا۔ صفائی وغیرہ کے لیے ستارہ بھابی نے لڑکی رکھ لی تھی۔ اب میرا دن کا زیادہ وقت بوتیک پر یا بوتیک کے کام کے سلسلے میں باہر گزرتا تھا۔ میں خوش تھا' میری قسمت یکا یک بدل چکی تھی۔ میرے نصیب میں ستارہ بھابی کی چوبیس گھنٹے کی رفاقت آ گئی تھی۔ اب مجھے بلال بھائی یا کسی سے بھی حسد محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

جیسے جیسے میری عمر بڑھتی جا رہی تھی ویسے ویسے ستارہ بھابی سے میری محبت پروان چڑھتی جا رہی تھی۔

محبت......کیا واقعی یہ محبت تھی؟

کیا محبت یک طرفہ ہو سکتی ہے؟

کیا محض آنکھوں کے رستے کسی کو اپنے اندر اتار لینے کو محبت کہا جا سکتا ہے؟

کیا کسی کو محسوس کرنا ہی محبت ہو سکتی ہے؟

شاید ہاں......لیکن ایسی محبت تو بندگی کہلاتی ہے......معبود کے نزدیک......کسی چار دیواری کے اندر رکھے کسی مٹی کے پتلے سے محبت کرنا بھی کچھ لوگوں کے نزدیک بندگی کہلاتی ہے' کیا وہ بندگی بھی محبت ہوتی ہے؟

یہ میں کن سوالوں کی غلام گردشوں میں الجھتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا تو صرف اتنا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں ستارہ بھابی کو پہلے سے کہیں زیادہ چاہنے لگا تھا۔ اب کبھی کبھی وہ مجھ سے اپنی تنہائی بھی بانٹنے لگی تھیں۔ کبھی کیش کاؤنٹر پہ بیٹھ کے کافی پیتے ہوئے' تو کبھی میرے کسی لطیفے پہ مسکراتے ہوئے۔ شاید میرے ساتھ ساتھ وہ خود بھی یہ بھول چکی تھیں کہ میں کون ہوں۔ شاید ان کو بھی یہ

احساس نہ تھا کہ میں ان کے گھر کا ملازم ہوں یا پھر شاید وہ ان تمام احساسات سے ماورائی کوئی شے تھیں۔
ان تمام بھید بھاؤ سے بالاتر......

بلال بھائی ہر سال کے آخر میں ایک ماہ کی چھٹی پر آتے تھے اور وہ ایک مہینہ جہاں ستارہ بھابی کی زندگی میں رنگ بھر جاتا' وہیں میری شامیں بے رنگ کر جاتا۔ وہ پورا مہینہ ستارہ بھابی کچھ نئے روپ اوڑھ لیتیں۔ اچھے اچھے ملبوس زیب تن کرتیں' پورا گھر پھر سے ان کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سے گونجتا' پھر سے ہر سو ان کی پازیب چھنکتی وہ اکثر وقت گھر پر رہتیں۔ بوتیک میں اور سلمیٰ باجی سنبھالتے۔

ان دنوں میں نے اپنی عمر کے پندرہ برس پورے کیے تھے اور ہر سال کی طرح اس سال بھی دسمبر آیا اور دسمبر کی خنک شاموں اور مختصر صبحوں کے ہمراہ بلال بھائی بھی آ گئے...... اور ایک بار پھر میرے سپنوں کے محل کی کرچیاں ہونے لگیں۔ سال کے انہی دنوں میں میرے دل میں شدت سے یہ احساس جاگتا کہ میں اس گھر کا ملازم ہوں۔ گاؤں سے آیا ہوا ایک ان پڑھ لڑکا...... میری حقیقت بھی حقیر ہے اور پہچان بھی ادنیٰ۔

ستارہ بھابی کا وقت' چاہت اور زندگی کم از کم میرے لیے نہیں...... ہرگز نہیں۔ کپکپاتی خنک راتوں میں گھر کے کسی کونے میں جب میں ستارہ بھابی اور بلال بھائی کو ہلکے ہلکے مسکراتے دیکھتا یا جب جاڑوں کی کومل دھوپ میں باتیں کرتے پاتا تو میری شریانوں میں آگ سی دوڑنے لگتی۔ میرا دل کرتا کہ بلال بھائی کو قتل کر دوں اور ستارہ بھابی کو مجبور کروں کہ وہ مجھے چاہیں' مجھ سے باتیں کریں' میرے ساتھ مسکرائیں' لیکن مجھے پتہ تھا کہ ایسا کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے اور نہ مجھ میں ایسا کرنے کی ہمت ہے۔

لیکن میرے یہ احساسات بھی وقتی تھے۔ بلال بھائی کے جاتے ہی جب ستارہ بھابی واپس پرانے طرز میں آتیں تو میں بھی سب کچھ بھول جاتا۔ اکثر سوچتا کہ بلال بھائی کو تو ستارہ بھابی کا ساتھ محض ایک مہینے کے لیے نصیب ہوتا ہے اور مجھے پورے گیارہ ماہ۔

ان دنوں گھر میں سلمیٰ باجی کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں' رشتہ منظور ہو چکا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی اور تیاریوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ تمام کپڑوں اور زیورات کی ذمہ داری تو ستارہ بھابی نے اٹھالی تھی۔ ان دنوں ہم نے باہر سے آرڈر لینے بند کر دیے تھے۔ رات گئے تک ہم بیٹھ کر نئے نئے ڈیزائن ڈھونڈتے' ڈسکس کرتے اور ان پر کام کرتے تھے۔

یہ انہی شاموں میں سے ایک شام تھی۔

ستارہ بھابی نیلے رنگ کے کاٹن کے ایک پیس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں کاغذ پر کچھ پرانے بلوں کو جمع کرنے میں گم تھا کہ اچانک ان پر میری نظر اٹھ گئی۔

''کیا کر رہی ہیں آپ؟'' میرے پوچھنے پر وہ کچھ چونکیں اور پھر مسکرا کر بولیں۔

''کچھ نہیں...... یہ بے بی بلیو کلر کا پیس بچ گیا ہے' سوچ رہی ہوں کہ اس سے کیا بنانا چاہیے۔''

اتنے چھوٹے سے پیس سے کیا بن سکتا ہے؟'' میرے سوال پر ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

''کسی بچے کا سوٹ تو بن سکتا ہے نا۔'' وہی شریری مسکراہٹ۔

''بچے کا سوٹ' لیکن ہم لوگ تو صرف لیڈیز گارمنٹس ہی بناتے ہیں۔'' میں نے گویا انہیں یاد دلایا۔

وہ چپ تھیں۔ متواتر چپ۔

''جانتی ہوں...... لیکن یہ میں اپنے بچے کے لیے بناؤں گی۔'' اچانک ان کی چپ کا قفل ٹوٹا۔

''پتہ ہے نی...... میں ماں بننے والی ہوں۔'' شاید ان کے اس راز کا پہلا شریک میں تھا یا پھر بلال بھائی۔

میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ آنکھیں اندھیرے سے دھندلانے لگیں۔ کاغذ پر لکھے حرف اچانک اوپر نیچے ہوتے محسوس ہوئے۔ یہ کیا ہونے والا تھا۔ ستارہ بھابی اور میری محبت کے بیچ ایک مستقل دیوار آنے والی تھی۔ ستارہ بھابی کی محبت کا ایک اور حق دار آنے والا تھا۔

بلال بھائی کی محبت اب بھی غالب تھی' ان کا وجود اب بھی قوی تھا۔ وہ اب بھی اپنی جیت کا جھنڈا گاڑے فاتح بنے کھڑے تھے۔

اور میں...... اتنا بدلنے کے باوجود بھی وہیں کھڑا تھا۔ خود کو کنول کے پھول کی مانند خوب صورت بنانے کے باوجود بھی کیچڑ ہی کی پیداوار تھا۔ میری اوقات بار بار میرے ہی قد کا آئینہ بن کر میرے سامنے آ جاتی اور مجھے میری حیثیت یاد دلاتی۔

پتہ نہیں کچھ لوگوں کی محبتیں ہر طرح کی شدتوں کے باوجود اتنی کھوکھلی کیوں ہوتی ہیں جیسے کہ بوسیدہ درختوں کے کھوکھلے بے کار بدنما تنے۔ بے وجود یا پھر شہد کی مکھیوں کو وہ چھتا کہ جس سے شہد کی مٹھاس نکال کر اسے بے کار سمجھ کر کہیں بھی پھینک دیا جائے۔

میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ خزاں کی بے قدر ہواؤں میں جس طرح مرجھائے زرد پتے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور ہوائیں انہیں در بدر لیے اڑتی پھرتی ہیں۔ میں بھی اسی طرح کا ایک زرد پتہ تھا۔

کبھی کبھی یونہی لیٹے لیٹے دل میں ایک خیال بار بار آتا صرف ایک بار میں ستارہ بھابی سے بس اتنا کہہ سکوں کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ عین اسی لمحے جب آپ اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھیں۔ بس اور پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جاؤں۔ کم از کم یہ گھٹن کا احساس تو ختم ہو جائے۔ یہ ہر وقت کی بے چینی' ہر وقت کا اضطراب تو کچھ کم ہو گا۔ یقین تو مجھے تھا کہ ستارہ بھابی کے دل اور زندگی میں

میرے لیے نہ تو کوئی جگہ تھی اور نہ کبھی بن سکتی تھی' لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا کہ جو انہی کے نام کی گردان کیے رہتا۔ اپنی ان آنکھوں کا کیا کرتا کہ جو جاگتے' سوتے انہی کا چہرہ دیکھتی تھیں۔

میرے اندر کے اس اضطراب نے مجھے غیر محسوس طور پر نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ اکیلے بند کمرے کے اندھیرے میں میں کئی طرح کے سائے' کئی طرح کے ہیولے دیکھنے لگا تھا۔ میرا ذہن پہلے سے کہیں زیادہ میچور ہو چکا تھا۔ مجھے کبھی کبھی لگتا کہ میں لیٹا ہوا ہوں اور اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور ستارہ بھابی اندر آئی ہیں اور ان کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور پازیب کی چھن چھن اس چھوٹی سی چار دیواری میں گونجنے لگی ہے۔ وہ چلتی میرے بستر تک آئی ہوں اور میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھتا لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا۔ ستارہ بھابی کا وجود بوتل کے جن کی طرح دھواں بن کر غائب ہو چکا ہوتا۔ کمرے میں رہ جاتی تو بس اس احساس کی خوشبو جو دیر تک رلاتی رہتی۔

کبھی کبھی میں بیٹھے بیٹھے ہی کئی طرح کی آوازیں سنتا رہتا۔ یوں لگتا کہ ستارہ بھابی کا کھنکتا ہوا قہقہہ میری سماعتوں میں بس گیا ہو یا پھر ان کی باتیں وقتاً فوقتاً میرے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ میں غیر محسوس طریقے سے پاگل اور دیوانہ ہوتا جا رہا تھا۔

ان دنوں سلمٰی باجی کی شادی کے فنکشن ہو رہے تھے۔ بلال بھائی کچھ دنوں کی چھٹیوں پر آئے ہوئے تھے۔ یہ مہندی کے فنکشن کی رات تھی۔ میں صبح ہی سے مصروف تھا۔ ستارہ بھابی نے دلہن کو جانے کے لیے خاص کرسی بنوائی تھی۔ اس وقت میں اسی پر پیلے کاغذی پھول سجانے میں مصروف تھا کہ تسنیم بیگم میرے پاس آئیں۔

''ارے او سنی...... اے ثناء اللہ کہاں مر گئے ہو تم۔'' وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولیں۔

''تم یہاں ہو...... طلال کہیں باہر نکل گیا ہے اور ستارہ پتہ نہیں کہاں ہے۔ ادھر وہ دولہا والے آنے والے ہیں۔ مہندی کے سجے تھال نیچے لانے ہیں۔ جا کر ستارہ کو بلاؤ۔'' تسنیم بیگم کے آرڈر پر میں نے جلدی جلدی پھولوں والا کام سمیٹا اور اوپر ستارہ بھابی کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ ان کے کمرے کے دروازے پر میں دستک دینے ہی والا تھا کہ مجھے بلال بھائی کی آواز آئی۔

''تم تو کسی بھی رنگ' کسی بھی پیراہن میں ہو...... سب سے ماورئی لگتی ہو...... تم کسی مخصوص رنگ کی محتاج تھوڑی ہو۔ یہ حسن تو یونہی ستارے بکھیرتا ہوا ہے۔''

''بلال...... آپ پرسوں پھر چلے جائیں گے...... اور پھر سے میں اکیلی رہ جاؤں گی۔'' ستارہ بھابی کی بہت افسردہ سی آواز آئی۔

''اکیلی کیوں...... بھائی اب تو ہم نے آپ کے اکیلے پن کا ساتھی آپ کو دے دیا ہے اب کیا اداسی۔'' بلال بھائی انتہائی محبت بھرے لہجے میں بولے۔

میں دروازے کے پٹ کو ہلکے سے کھول چکا تھا۔ سبز رنگ کے پردے کے دوسری طرف ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے ستارہ بھابی کھڑی تھیں اور ان کی کمر میں بانہیں حمائل کیے بلال بھائی...... پل بھر کے لیے میری شریانیں سلگ اٹھیں۔

''ہاں لیکن...... وہ آپ کا نعم البدل تو نہیں ہوگا...... بلال مجھے ہر لمحے' ہر وقت آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ آپ نہیں ہوتے تو میرا وجود بے وقعت اور بے کار ہے۔ آپ کے سوا مجھے دنیا اچھی نہیں لگتی۔'' ستارہ بھابی نے بھی وفا کا یقین دلایا۔

''بس...... صرف چند ماہ اور اس نئے مہمان کو تشریف لانے دو...... پھر ہم تینوں انشاء اللہ دبئی سیٹل ہو جائیں گے اور کیا میں رہ سکتا ہوں تمہارے بغیر۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ستارہ بھابی کی طرف جھکے۔ بس اب میری برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔ میں نے دروازے پر زور سے دستک دے دی۔ اس وقت مجھے لگا کہ میری مٹھی میں جتنی طاقت ہے میں نے وہ دروازے پر صرف کر دی ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو گئے اور میں اندر آ گیا۔

''ستارہ بھابی! بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں مہمان آنے والے ہیں' مہندی کے تھال نیچے بھجوائیں۔''

''اچھا...... تم یوں کرو سنی...... یہ دو تھال ابھی لے جاؤ۔ میں تیسرا اٹھا کر ابھی آتی ہوں۔'' وہ بولیں۔

میں نے وہ سجے سجائے تھال اٹھائے اور جانے لگا تو میری سماعتوں میں ایک اور جملہ اترا۔

''بلال جائیں آپ جا کر کپڑے بدل لیں۔ یہاں بیٹھ کر مجھے دیکھنے سے کچھ نہیں ملے گا۔''

''ارے کیا نہیں ملے گا ہمیں آپ کو دیکھ کر؟ اور پھر جو تاج محل صرف ہمارا ہو اس پر ہم اپنی آنکھیں کیوں نہ ٹکا دیں؟'' وہ پھر سے رومینٹک ہوئے۔ مجھے زور کا چکر آیا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں لڑکھڑانے لگا' تھال میرے ہاتھ سے گرنے ہی والے تھے کہ بلال بھائی نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا۔

''کیا ہوا ثناء اللہ۔'' ستارہ بھابی بھی دوڑی آئیں۔

''اسے تو بخار ہے ستارہ...... یہ دیکھو اس کا جسم کیسے تپ رہا ہے۔'' بلال بھائی کے کہنے پر ستارہ بھابی نے میری کلائی کو چھوا۔

''تم لوگ بھی ناں...... سارا دن بے چارے سے کام کرواتے ہو۔ کبھی اس کی طبیعت کا ہی خیال کر لیا کرو۔'' بلال بھائی نے ستارہ بھابی کو ڈانٹا۔

''جاؤ سنی...... تم اپنے کوارٹر میں جا کر آرام کرو۔ میں یہ تھال نیچے رکھوا دیتی ہوں۔ فنکشن دیکھنا ہو تو باہر آ جانا لیکن کام وام مت کرنا۔ میں امی جان کو بھی کہہ دیتی ہوں جاؤ۔'' میرے ہاتھ سے تھال لے کر ستارہ بھابی بولیں۔

ان کے کہنے پر میں واقعی اپنے کوارٹر میں آ گیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا لیکن کتنی دیر تک ان جملوں کی بازگشت میرے کانوں میں گونجتی رہتی۔

تم تو کسی رنگ و پیراہن میں ہو......سب سے ماورائی ہو......

مجھے ہر لمحے ہر وقت آپ کی موجودگی اور ساتھ کی ضرورت ہے......

جو تاج محل صرف ہمارا ہو اس پر آنکھیں کیوں نہ ٹکائیں......

آپ کے سوا مجھے دنیا اچھی نہیں لگتی......

جو تاج محل صرف ہمارا ہو......صرف ہمارا......

میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بلند آواز سے۔ پھر میں نے اس خیال سے کہ کہیں میری آواز باہر نہ جائے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اسے منہ میں دبا لیا' لیکن کتنی دیر تک آنسوؤں کا اور میرا ساتھ نہ چھوٹا۔

اس چھوٹے سے' بے نظم سرونٹ کوارٹر میں ایک بے امان اور نامراد محبت تنہا جھٹپٹاتی رہی...... بلکتی......روتی رہی لیکن اس بدنصیب محبت کا علم کسی کو نہ تھا۔ اس کو بھی نہیں جس سے یہ وابستہ تھی یا جس کے لیے تھی۔

☆

بخار نے میرے اندر نقاہت اور کاہلی پیدا کر دی تھی۔ مجھے نہ علم تھا کہ یہ بخار مجھ پر کیوں طاری ہوا تھا۔ کام کے بوجھ کی وجہ سے یا ذہنی بوجھ کی وجہ سے۔ جب سے میں بلال منزل میں آیا تھا' بہت کم ہی بیمار ہوا تھا۔ شاید یہاں کا صاف ستھرا ماحول اور بہتر خوراک میری صحت کی اصل وجہ تھی اور جب بھی کبھی ہلکا پھلکا زکام یا بخار ہوا تو تسنیم بیگم کے کاڑھے اور ستارہ بھابی کی میٹھی باتوں کے علاج سے میں بہت جلد بھلا چنگا نظر آنے لگتا' لیکن اس بار جانے کیا ہوا تھا۔ ہفتہ بھر گزرنے کے بعد بھی میں پہلے کی طرح نارمل نہ ہو پایا تھا۔ ستارہ بھابی شادی اور مہمانوں کی بھاگ دوڑ کے باوجود بھی روزانہ میرے کوارٹر میں بلاناغہ آتیں اور مجھے دوا دے جاتیں یا تھرمامیٹر سے میرا بخار چیک کرتیں۔

شادی گزر گئی۔ بلال بھائی واپس دبئی روانہ ہو گئے۔ زندگی اچانک اٹھے شور و ہنگامے کے بعد واپس اسی ٹھہراؤ پر آ گئی۔ بوتیک کا کام پھر سے شروع ہو گیا۔ ستارہ بھابی اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھال نہ پاتی تھیں' اوپر سے تسنیم بیگم پر اب بڑھاپا اپنا سورج طلوع کرنے لگا تھا لہٰذا گھر بھر کی ذمہ داری بھی انہی پر آ گئی تھی۔

لیکن میں......میں اپنی محبت کے ایک اور پڑاؤ پر آ گیا تھا۔ شدتیں تو میری محبت نے پہلے ہی اختیار کر لی تھیں لیکن اب ان شدتوں کی موجودگی مجھے بے چین کرنے لگی تھی۔ میں اندر کی اس گھٹن سے بے حد

مضطرب تھا۔ دل کرتا تھا کہ کسی دن یا تو ستارہ بھابی کو اغوا کر کے کہیں لے جاؤں یا پھر اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلا دوں۔

پہلے جب بھی میں زیادہ اداس ہوتا تو اپنے گاؤں چلا جاتا لیکن اس بار میرا گھر جانے کو بھی دل نہ کر رہا تھا۔ مجھے اپنے گھر کے ماحول کا تصور کر کے ہی گھن آ رہی تھی۔ گائے بھینس کے گوبر میں ہاتھ ڈالتی میری ماں۔ چالیس پچاس روپے کی دہاڑی پر مزدوری کرنے والے میرے بابا۔ میرا بھائی غلام رسول جس کی خواہشیں بھی میرے ماں بابا کی طرح محدود تھیں۔ دو وقت کی روٹی کھانے کو مل جائے اور زندگی گزرتی چلی جائے۔ گھر کے ہر طرف گند کرتے' روتے دھاڑتے میرے چھوٹے بہن بھائی۔ مجھے ان سب کا سوچ کر ہی اپنے آپ سے بھی کراہیت سی محسوس ہوتی کہ کس ماحول کی پیداوار تھا میں اور یہ ماحول...... یہاں کا شہر کا ماحول' جس کو بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ میں نے دیکھا تھا۔ چاہے نوکری کی جگہ پر رہ کر ہی لیکن یہ ماحول میں نے اپنایا تو تھا۔

ریشم کی طرح کے گداز قالینوں والے فرش' مہنگے مہنگے پلنگ اور ان پر مخملی بچھونے' اعلیٰ طرز کی آسائشات' کہاں یہ سب اور کہاں میرا گھر......اس کا اور اُس کا بھلا کیا موازنہ اور میں پیداوار تھا اس گندے ماحول کی اور ستارہ بھابی اس ماحول کی' محبت ہوئی بھی تو کہاں...... جہاں مطابقت کا' میل کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ جہاں رضامندی کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔

ان دنوں میں نے دل کی بے چینی کے زیر اثر سگریٹ پینا شروع کر دیا تھا۔ محلے کے چند ہم عمر لڑکوں سے دوستی بھی کر لی تھی۔ یہ راہ فرار کا ایک نیا طریقہ تھا۔ اس سے یہ ہوتا کہ دو ایک گھنٹے میں گھر سے باہر رہتا اور کم از کم اس محبت کی قسمت پر افسوس کرنے سے بچا رہتا۔

تسنیم بیگم کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی رہی۔ ان کی فطرت اب بہت بدل گئی تھی۔ وہ غصہ اور اکھڑ پن کہیں کھو چکا تھا۔ اب تو وہ اپنے پوتی یا پوتے کا چہرہ دیکھنے کو زندہ تھیں اور ان کا یہ خواب بہت ہی جلد تعبیر بن کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ستارہ بھابی ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن چکی تھیں۔ اب ان کی کل کائنات وہ بچہ بن گیا۔ وہ بوتیک کے کام' گھر کی آرائش اور پوری دنیا کو فراموش کر کے اس بچے میں مگن ہو گئی تھیں۔

دانش کے کپڑے دھو دیے نی۔

دانش رو رہا ہے۔ دانش سو رہا ہے۔

دانش دودھ مانگ رہا ہے۔ دانش کے لیے جھولا خریدنا ہے۔

دانش یہ دانش وہ۔

بلال بھائی کا وجود میرے لیے کم اذیت ناک تھا اور اب یہ دانش' دانش کی گردن۔ مجھے ہر اس چیز

سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی جس سے ستارہ بھابی کو محبت تھی یا جس سے ان کی وابستگی تھی۔ ننھے دانش کے معصوم خدوخال بھی مجھے نہایت نفرت آمیز محسوس ہوتے تھے۔ ستارہ بھابی کے چوبیس گھنٹے اسی کے کام کرتے اور اسی کا سوچتے گزرتے۔ گویا انہیں دنیا سے تعلق کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ساری چاہتیں، ساری وابستگیاں بس اسی سے منسوب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس حالت میں جب وہ مجھے نظر انداز کرتیں یا کبھی کبھار جھڑک دیتیں تو میں گھر سے نکل آتا اور جب تک سگریٹ کا ایک پیکٹ نہ پھونک لیتا، تب تک سکون نہ پاتا۔

انہی دنوں میرے دوست وحید نے مجھے افیم بھری سگریٹ پلائی۔ پہلے پہل تو اس کا ذائقہ مجھے ناگوار لگا لیکن پھر اگلے ہی پل یہ موہوم سی ناگواری عجیب سرور کے احساس میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ اجنبی ذائقہ عجب مٹھاس دینے لگا۔ اس مخصوص مہک اور دھویں میں مجھے ستارہ بھابی کا تخیل ڈولتا نظر آیا۔ وہ دھواں فضا میں پھیلنے کے ساتھ ساتھ ستارہ بھابی کا وجود بنتا جا رہا تھا اور میں کھلی آنکھوں سے ان کا تصور کر رہا تھا۔ انہیں دیکھتا رہا جی بھر کے اس طرح نہیں جس طرح گھر میں چوری چھپے دیکھتا تھا وہ میری طرف دیکھتیں تو میں آنکھ چرا لیتا۔ اب مجھے افیم کی عادت ہو گئی تھی۔ افیم کی ایک سگریٹ ستارہ بھابی اور میرے مابین ایک دریچے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک کش کے ساتھ ہی وہ دریچہ وا ہو جاتا اور میں ستارہ کو دیکھ سکتا، تصور، تصور میں ان سے باتیں کرتا، ان کا لمس محسوس کرتا۔

بلال منزل کی رنگ بدلتی زندگی کا میں بھی حصہ تھا۔ کتنی عرصے سے یہ میری پناہ گاہ تھی۔ بچپن میں یہاں آیا تھا اور یہیں جوان ہوا تھا۔ یہیں سارے طور طریقے سیکھے تھے۔ یہیں محبت کی بھول بھلیوں میں کھویا تھا۔ یہیں رہ کر خواہشوں کے جال مجھ پر تن کے کپڑوں کی مانند تنگ ہوئے تھے۔ ان دنوں بلال منزل پر ایک اور رنگ آیا۔ سوگواری کا رنگ۔

اس رات تسنیم بیگم پر شدید دل کا دورہ پڑا جو ان کی جان لے کر ٹلا۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے جانے کا دکھ بھی کو تھا۔ مجھے بھی...... کہ جو اس گھر کا ملازم ہونے کے باوجود بھی ایک فرد کی طرح تھا۔

ان کے جانے کے بعد گھر بہت سونا ہو گیا۔ طلال بھائی بزنس ایڈمنسٹریشن کے سلسلے میں ملک سے باہر جا رہے تھے اور سننے میں آیا کہ بلال بھائی بھی ایک ماہ بعد آ کر ستارہ بھابی اور دانش کو اپنے ساتھ دبئی لے جائیں گے۔ بلال منزل کو فروخت کرنے کا سوچا گیا اور 'پہناوا بوتیک' ستارہ بھابی دبئی شفٹ کرنا چاہتی تھیں باقی رہ گیا میں...... تو میں تو ایک ملازم تھا۔ ایک حقیر غلام۔

کاش میں ان کے گھر کا فرد ہوتا...... جسے وہ اپنے ساتھ لے جاتیں......
یا پھر ان کی بوتیک کا کوئی کپڑا...... جسے وہ ضائع نہ کرتیں......

اور کچھ نہیں تو ان کے گھر کا فرنیچر یا کوئی سامان......
جسے جانے سے پہلے وہ کسی محفوظ ہاتھ میں تو دے جاتیں۔

لیکن افسوس میں ان میں سے کچھ بھی نہ تھا...... میں تو وہ نوکر تھا، جس نے اپنی نوکری کی تھی اور اس کے بدلے تنخواہ لی تھی، برتن دھونے، صفائی کرنے اور کھانا بنانے کا معاوضہ لیا تھا، لیکن اس تنخواہ، اس معاوضے کا کیا کہ جو میں نے محبت کے بدلے میں مانگی تھی۔ ان گنت خوابوں، خواہشوں کے لیے مانگی تھی کتنی ہی مضطرب صبحوں اور شاموں کے لیے مانگی تھی۔

بوتیک کی اور گھر کی پیکنگ شروع ہو چکی تھی۔ سامان سمیٹے جا رہے تھے۔ اس دن ستارہ بھابی میرے پاس آئیں اور مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"سنی...... ایک بات پوچھوں یہاں سے کام چھوڑ کے تم کہاں جاؤ گے؟ کسی دوسرے گھر میں یا پھر کسی اور جگہ؟"

آج پہلی بار ان کے جملے کی نوعیت نے مجھے احساس دلایا کہ میری حیثیت کیا ہے، میری آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی نم ہو گئیں۔

"میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہاں سے چھوڑ کے کہیں جاؤں گا۔" میری آواز روہانسی تھی۔ وہ میرے قریب آئیں اور مسکرا کے میری آنکھوں میں دیکھنے لگیں۔

"اگر بات کسی قریبی شہر کی ہوتی تو سنی تو میں تم کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی لیکن...... ابھی تو یہ ممکن نہیں ہے نا۔"

"میں آپ کے بنا نہیں رہ سکوں گا۔" یہ جملہ سراسر میری محبت کے اظہار کا عکاس تھا، لیکن ستارہ بھابی نے اسے بھی معمولی ہی جانا۔

"تو ہم کیا رہ پائیں گے...... ہمیں بھی تو کتنی عادت ہو گئی ہے تیری پگلے...... یہ تم کیا جانو۔ کتنا سکھ، کتنی آسانی دی ہے تم نے ہمیں۔ میں تمہیں اپنا نمبر دیتی جاؤں گی کبھی کبھار فون تو کر سکو گے نا۔" وہ بہت پیار سے بولیں۔ اب میں اپنی آنکھوں پر قابو نہ پا سکا اور دل کھول کر رو دیا۔ وہ کتنی دیر تک میرے بالوں میں اپنے ہاتھ پھیر کر مجھے چپ کراتی رہیں۔ میں چاہ کر بھی ایک مرتبہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ ہاں ستارہ بھابی...... میرے دل کی ہر ہر دھڑکن سے پوچھیے میرے دل، میری سانسوں سے...... میں نے تقدیر سے صرف اور صرف آپ کو مانگا ہے۔

اس رات میں نے بہت نشہ کیا۔ میں اپنے آپ کو نشے کے پردے میں غرق کر کے ستارہ سے جدا ہونے کے احساس کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ پہلے کچھ بھی تھا، وہ میری آنکھوں کے سامنے تو تھیں۔ میں انہیں دیکھ تو سکتا تھا۔ ان کے اور میرے مابین کوئی فاصلہ تو نہ تھا اور اب یہ صدیوں، زندگیوں پر محیط فاصلے

رکاوٹیں......

تمام رات میں افیم پی کر جب گھر آیا تو مجھے دنیا کی کوئی خبر نہ تھی' میں بے ہوش ہو کر سو گیا۔

اگلی صبح جدائی کی صبح تھی۔ بلال بھائی ستارہ بھابی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور لے جا رہے تھے۔

ایئرپورٹ کی طرف جانے والی کار میں سامان رکھنے کے بعد ستارہ بھابی میرے پاس آئیں اور بولیں۔

''تم بھی اپنا سامان سمیٹ لو سنی...... اور آج ہی اپنے گاؤں چلے جاؤ اور ہاں یہ لو میری طرف سے۔'' وہ ایک سبز لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''یہ تمہاری محبت' تمہاری خدمت کی قیمت نہیں ہمارا پیار ہے۔ اسے رکھ لو۔'' انہوں نے اس لفافے کو میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں اس وقت بھی کچھ نہ کہہ سکا کہ اب کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اب وقت گزر چکا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھیں اور گاڑی چلنے لگی...... وہ گئیں...... دور...... بہت دور۔ اس دن...... اسی وقت میں بلال منزل سے نکلا۔ بنا کسی سامان کے' صرف سگریٹ کا پیکٹ اٹھائے اور سامان اٹھاتا بھی تو کیا کیا اٹھاتا۔ اس گھر کی چار دیواری میں میری ناکام محبت' میرے عشق لاحاصل کی کتنی بے رونق شامیں' کتنے خوابیدہ لمحے دفن تھے۔ کتنے خواب' کتنے ارمان پوشیدہ تھے۔ میں کس کس کو اپنے ساتھ لیتا۔ میں سگریٹ پیتا رہا۔ اپنے غم کو دھویں میں اڑاتا رہا۔

اپنے عشق لاحاصل کی قسمت پر آنسو بہاتے بہاتے میں ایک شاہراہ پر آ گیا جہاں میرے جیسے اور کتنے ہی بدنصیب اپنے آپ کو نشے میں غرق کیے لیٹے تھے۔ وہ لوگ مجھے بہت اپنے بہت قریبی لگے۔ میں بھی وہیں کہیں بیٹھ گیا اور ایک نئی سگریٹ سلگا لی۔ سگریٹ جلتی رہی...... نشہ میرے رگ و پے میں اترتا رہا۔

ستارہ کا تخیل سگریٹ کے دھویں کے ساتھ اترنے لگا۔ زندگی ایک نیا موڑ لینے لگی۔ عشق ایک نئے مقام پر پہنچنے لگا بندگی بننے لگا۔

یہاں بیٹھے ہر میرے جیسے نشہ کرنے والے کے پاس ایک کہانی ہے' ایک محبت ہے' ایک ستارہ ہے اور اسی محبت کی ناکامی اور اسی عشق کے لاحاصل ہونے کے باعث ایک سگریٹ ہے اور اس سگریٹ کے دھویں میں ایک تخیل ہے۔

لوگوں کے نزدیک نشہ موت ہے' لیکن ہم جیسے ناکام لوگوں کے نزدیک ہوش میں رہ کے اپنی ناکامی کا تصور کرنا موت ہے اور ہوش سے بے گانہ ہو کر اپنے صنم کا تصور کر کے اسے پوجنا زندگی۔

سو آج سے...... میں زندہ رہنے لگا تھا۔

* * *

گستاخ اکھیاں کتھے جالڑیاں

اتنی شدت سے میرے قریب آ کر
تم نے میرے احساس کو ایک نیا موڑ دیا ہے
میں اپنے اندر
اعتبار کا ایک تازہ موسم دیکھ رہا ہوں

''مجھے...... مجھے آپ سے محبت ہے۔''

''کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟'' ان کے چہرے پر ایک لمحہ کو مسکراہٹ دوڑی۔ ایسی مسکراہٹ جو کہ تمسخرانہ تھی' جس میں طنز کی آمیزش تھی۔

''جانتی ہوں' ہمیشہ سے جانتی ہوں۔ تب سے جب سے میرے جاننے کی عمر بھی نہ تھی لیکن میں نے جاننا شروع کر دیا کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ ہاں ذوالفقار! میں آپ کو چاہتی ہوں۔'' میں نے اپنی

پوری ہمت جمع کر کے زندگی میں پہلی بار ان سے کہا۔

''کیا کہا؟ ذوالفقار؟ زلفی چچا سے میں اب صرف ذوالفقار بن گیا۔ جانتی نہیں ہو کہ میں تمہارے ہونے والے شوہر کا چچا ہوں اور تمہارے والد کا قریبی دوست۔ تمہاری اور میری عمر میں دنوں کا نہیں سالوں کا فرق ہے۔ بائیس سال بڑا ہوں میں تم سے' تمہیں یہ کہتے ہوئے کچھ تو شرم کرنی چاہیے وزنہ!'' انہوں نے قدرے جھنجلاہٹ سے میری بات کا جواب دیا۔

''زلفی! یہ عمروں کے بھید بھاؤ' یہ سالوں کے فرق کم از کم محبت میں جائز نہیں۔ محبت تو وہ بے لوث جذبہ ہے جو اس طرح کے تفرقات کو پاؤں تلے روند کے آگے چلا جاتا ہے۔ اگر ان فاصلوں کو محبت گنتی تو شاید دنیا میں کہیں بھی اس کا وجود نہ ہوتا۔'' میں اور میرا تیقن بھرا لہجہ ذوالفقار کا امتحان لے رہا تھا۔ وہ پہاڑ کی مانند مضبوط انسان' بلند قامت سراپا اور دلفریب نین نقش رکھنے والا شخص پل بھر کو کمزور پڑتا دکھائی دیا۔

''وزنہ تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ تم میرے لیے بیٹیوں کی طرح ہو۔''

''بیٹی تو نہیں ہوں نا اور آپ کا اور میرا کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ آپ سے نکاح کی اجازت ہے مجھے ذوالفقار!'' میرا اعتماد اب پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔

''شٹ اپ وزنہ! بند کرو یہ بکواس۔'' وہ چلائے۔

''زلفی مجھے آپ سے محبت ہے۔'' میں نے پھر اقرار کیا۔

''چپ ہو جاؤ۔'' یہ ان کے ضبط کا گویا امتحان تھا۔

''آئی لو یو زلفی! آئی لو یو۔'' میں پہلے سے بلند آواز میں چیخی۔

''تڑاخ' تڑاخ' تڑاخ۔'' تین زوردار تھپڑ میرے گالوں پر پڑے تھے۔ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں اپنے ہی بیڈ پر موجود تھی۔ میرے کمرے میں لگی کھڑکی صبح کی موہوم روشنی سے جھلملا رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے وہ جو کچھ بھی دیکھا وہ ایک خواب تھا اور پھر انسان وہی کچھ تو خواب میں دیکھتا ہے جو وہ سوچتا ہے۔ کبھی چاہتیں' کبھی ارمان' تو کبھی محرومیاں اور تلخیاں' لیکن آج جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ کیا تھا؟

وہ بھی وہی کچھ تھا جو میں سوچتی تھی لیکن یہ خواب سراسر میرے اندر کا ڈر تھا۔ ایک خوف کی جھلک تھی جو آٹھ سال کی عمر سے میرے اندر جڑ پکڑ چکی تھی اور اب ایک تناور شجر کا روپ دھار چکی تھی۔ مجھے ذوالفقار احمد سے محبت تھی۔ آج سے نہیں پچھلے دس سال سے' جب میں صرف آٹھ سال کی تھی تب سے ذوالفقار احمد کی محبت نے میرے دل کی کچی مٹی میں ایک کونپل کھلائی تھی اور وہ کونپل اتنے سالوں میں اگر مرجھائی ہے تو میں نے اسے پھر سیراب کیا ہے۔ ٹوٹی ہے تو میں نے اسے پھر سے جوڑا ہے اور اب تو یہ کونپل ایک چھاؤں دار درخت کا روپ بھر چکی ہے' جس کی دلفریب چھاؤں میں میری پوری زندگی کے

سائبان جیسی ہے' جس میں ہر دکھ' ہر تکلیف چھپ جائے۔

میں وزنہ علی اپنے پورے ہوش و حواس میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے ذوالفقار احمد سے محبت کی ہے۔ صداقت پر مبنی محبت' لازوال' انمٹ محبت' بے شک وہ عمر میں مجھ سے بائیس سال بڑا ہے۔ بے شک اس نے مجھے ہمیشہ بیٹی کی طرح دیکھا ہے اور بے شک اس کے بھتیجے انوش احمد سے میری بات پکی ہو چکی ہے ہر حقیقت سے بالاتر' ہر سچ سے اوپر اٹھ کر ایک سچ ہے کہ میں' میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ آج سے نہیں ابھی سے نہیں ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک کرتی رہوں گی۔ اسے صرف ذوالفقار یا زلفی کہہ کر نہیں بلا سکتی تھی۔ چچا نام کا دم چھلا ہمیشہ مجھے استعمال کرنا پڑتا تھا۔

''ہاں وزنہ! کیسی ہو تم! آج اتنی صبح صبح کیسے فون کر لیا؟'' وہ مسکرائے تھے۔

''بس آپ کی یاد ہی اتنی آئی۔ تین دن سے نہ آپ آئے اور نہ ہی فون کیا۔ میں کتنی اداس تھی آپ کے بغیر۔'' میں نے اپنی اداسی واضح بیان کر دی۔ اس پر وہ ہنسے تھے یا شاید مجھ سے اس طرح کے شکوے شکایت سننے کی اب انہیں عادت پڑ چکی تھی۔

''کتنا لڑتی ہو تم ونی۔ وہ اصل میں ایک دو ضروری سرجری کرنی پڑی تھیں اور شمیل کو بھی کل سے بخار ہے۔ ویسے تمہیں شمیل بہت یاد کر رہا ہے۔ آ جاؤ آج گھر۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح آفر کی۔

''کیسے آؤں میں' ڈرائیور دوپہر کو مجھے کالج سے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور ماما مجھے شام کے وقت گاڑی چلانے نہیں دیتیں۔'' میں نے جان کر بہانہ بنایا۔

''پھر ایسا کرو انوش کو فون کر دو۔ وہ تمہیں لے آئے گا۔'' ہمیشہ کی طرح ان کے دل میں پہلے اپنے لاڈلے بھتیجے کا خیال ہی آیا۔ یہ موصوف بھی لفظ چچا کی طرح زلفی کا دم چھلا ہی تھے۔

''جی نہیں مجھے اس کے ساتھ آ کر بور نہیں ہونا ہے۔ ایسی بات ہے تو رہنے دیں میں پھر کبھی آ جاؤں گی۔'' میں نے روٹھنے کی ایکٹنگ کی۔

''ایک تو تم ناراض بھی بڑی جلدی ہو جاتی ہو۔ اچھا ایسا کرو شام چھ بجے تیار رہنا۔ میں کلینک سے جلدی فارغ ہو کر تمہیں گھر سے لیتا جاؤں گا۔ بھابی کو بھی تیار کر لینا۔'' انہوں نے ایک اور آفر پیش کی۔

''نہیں نہیں ماما کی طبیعت بہتر نہیں۔ میں البتہ تیار رہوں گی۔'' مجھے اپنے ساتھ کم از کم کوئی دم چھلا لگانے کی خواہش نہ تھی۔ اوکے کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔

شام کو وہ حسب سابق ایک گھنٹہ لیٹ تھے۔ سات بجے کے قریب ان کی گاڑی ہمارے گھر کے گیٹ کے آگے رکی۔ میں اپنے کمرے کی ٹیرس میں کھڑی ان کی منتظر تھی۔ وہ گاڑی گیٹ کے اندر پارکنگ پورچ میں کھڑی کر کے اترے اور صدر دروازے سے اندر آ گئے۔ میں نے بھی جلدی جلدی اپنا سراپا

شیشے میں دیکھا۔ دوپٹہ کاندھے پر نفاست سے سجایا اور اپنے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ڈھیروں پرفیوم سے ایک دلفریب مہک والی پرفیوم نکالی اور اپنے اوپر چھڑکی۔ آج میں نے جان بوجھ کر فیروزی پرنٹڈ شیفون پہنا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ اسکائی کلر زلفی کا پسندیدہ کلر ہے اور پنک اور اسکائی کلر کا کنٹراسٹ ان کا فیورٹ کنٹراسٹ۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے کمرے کے کارپٹ اور پردوں میں بھی اسکائی بلیو ہی استعمال کروایا ہوا تھا۔ میں نے خود پر ایک آخری نظر ڈالی۔ میں آج کی ملاقات کے لیے بالکل ٹھیک لگ رہی تھی بلکہ بہت خوب صورت بھی۔

میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو وہ ماما سے محو گفتگو تھے۔ پاپا کے جانے کے بعد ماما کے خیرخواہوں میں جو کہ پاپا کی طرف سے ہوں' صرف ذوالفقار ہی تھے۔ وہ پاپا کے ساتھ اسکول کے زمانے سے تھے' پھر اکٹھا میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا اور بعد میں دونوں نے ہی سرجری میں اسپیشلائزیشن کیا۔ پاپا نے کالج کے ختم ہونے سے پہلے ہی اپنی کزن فرحانہ سے شادی کر لی جب کہ ذوالفقار کی زندگی میں پہلی بار انبساط آنٹی آئیں' جب وہ ایم بی بی ایس فائنل ایئر میں تھے۔ انبساط آنٹی یقیناً ایسی تھیں کہ انہیں پسند کیا جائے۔ گندمی رنگت' کھڑے کھڑے نین نقش' بھرپور سراپا' لیکن مجھے وہ کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی تھیں کیونکہ جب ذوالفقار نے انبساط آنٹی سے شادی کی تب میں گیارہ سال کی ہونے والی تھی اور زلفی کو میں تب بھی پسند کیا کرتی تھی یا پھر شاید کچی مٹی میں محبت کی کونپل کی جڑ رکھی جا چکی تھی لیکن سال بھر میں ہی انبساط آنٹی کی ڈیتھ ہو گئی۔ اپنے پہلے بیٹے شمیل کی پیدائش کے بعد۔ ان کی موت نے جہاں شمیل کو اکیلا چھوڑ دیا تھا وہاں ذوالفقار بھی بکھر گئے تھے ایسے میں انہیں پاپا ہی سنبھال پائے تھے لیکن پاپا بھی زیادہ دن انہیں سنبھالنے کے لیے زندہ نہ رہے۔ ایک دن ایک ظالم حادثہ انہیں بھی ہم سے بہت دور لے گیا۔ ایسے میں میرا' ماما اور فائزہ باجی کا کوئی نہ تھا۔ ہم تینوں اکیلی بے سہارا عورتیں کہاں جاتیں۔ ایسے میں ذوالفقار اپنا غم بھلا کر ہمارے ہی ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے پاپا کے اسپتال کو بند نہیں ہونے دیا بلکہ خود پاپا کی جگہ وہاں کے مین ڈاکٹر بن گئے۔ نئے اسٹاف کے لوگ لے آئے اور ماما کو ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم فراہم کرتے رہے۔ فائزہ باجی نے گریجویشن کیا تو دو سال قبل انہی کی پسند سے ان کی شادی عمر بھائی سے ہو گئی اور میری تعلیم کا سہرا بھی ذوالفقار ہی کے سر جاتا ہے۔ میں میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں تھی۔ انٹری ٹیسٹ کی تیاری بھی انہوں نے ہی مجھے کروائی اور اب بھی میری تھوڑی بہت ہیلپ کر دیا کرتے ہیں۔

''آجایئے محترمہ! دیکھیے ہم لینے آ گئے۔ اب تو ناراضگی نہیں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح اپنی جادوئی مسکراہٹ بکھیر کے بولے۔ اس عمر میں بھی وہ کتنے جاذب نظر لگتے تھے۔ متناسب جسم' کشادہ چہرہ' بھرپور مسکراہٹ' کچھ کالے کچھ سفید بال' چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں جن کی وجہ سے میں انہیں کبھی کبھی

چائنیز مین بھی کہا کرتی تھی۔

''آپ سے تو ناراض ہونا ہی چاہیے۔ دیکھیں ناں ماما اتنے اتنے دن گزر جاتے ہیں ہماری خبر بھی نہیں لیتے۔ جانتے بھی ہیں کہ ہم کو ان کی کتنی عادت ہے۔'' میں نے شکوہ کیا تو ماما مسکرا دیں۔

''ہاں بھئی زلفی! ہماری تو طبیعت بھی خراب ہو جاتی ہے اگر تم نہ آؤ۔ جانتے ہو دو دن سے ونزہ کے سر میں مسلسل درد ہو رہا ہے اور بے وجہ چڑچڑاہٹ بھی طاری رہی ہے۔'' ماما نے میری فیور میں چند الفاظ کہے۔

''اچھا نبض دکھاؤ۔'' انہوں نے فوراً ہی میرا ہاتھ پکڑا اور میری کلائی پر انگلی ٹکا دی۔ پل بھر کو میرے پورے جسم میں کرنٹ سا دوڑا۔ مجھے کچھ ہونے لگا۔ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے میں نے فوراً ہی اپنی کلائی ان کے ہاتھ سے چھڑا لی۔

''اپنی یہ ڈاکٹری رہنے دیں اور چلیں۔ واپس آ کے مجھے اپنے ٹیسٹ کی تیاری بھی کرنی ہے۔ پہلے ہی آپ لیٹ ہیں۔''

''بھابی! اگر میں دو منٹ اور یہاں رہا تو شاید کل سے ڈاکٹر نہیں مریض کہلاؤں۔ چلو پھولن دیوی!'' انہوں نے پیار سے میرے بالوں کو بکھیرا اور ماما بھی مسکرا دیں پھر میں ذوالفقار کے ساتھ ان کی گاڑی تک آئی۔ فرنٹ سیٹ پر بڑی شان سے بیٹھی۔ ماما نے گیٹ کھولا اور ذوالفقار نے گاڑی باہر نکال لی۔

''ہاں اب بتاؤ کہ کالج کیسا جا رہا ہے؟'' انہوں نے ڈرائیونگ سے دھیان ہٹا کے مجھے مخاطب کیا۔

''اچھا جا رہا ہے' بس ذرا پریکٹیکلز مشکل ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔ دو دن پہلے انوش سے بھی میری بات ہوئی اسے بھی اپنے انجینئرنگ کالج کے پریکٹیکلز ہی پریشان کر رہے ہیں۔ تمہاری بات ہوئی انوش سے؟'' وہ پھر بولے۔

''نہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''کر لیا کرو بات بے چارے سے۔ تمہارا مستقبل ہے وہ اور سناؤ فائزہ کیسی ہے۔''

''ٹھیک ہوں گی۔ کافی دن ہو گئے ہیں ملاقات نہیں ہوئی۔'' مجھے بوریت ہو رہی تھی دوسروں کی باتیں کر کے۔

''بھابی کا خیال رکھا کرو ونزہ! اتنا ہائی بلڈ پریشر اچھا نہیں ان کے لیے۔'' وہ اپنائیت سے بولے۔

''آپ مجھ سے ہمیشہ دوسروں کے بارے میں ہی بات کیوں کرتے ہیں' میرے بارے میں' اپنے بارے میں باتیں نہیں ہو سکتیں۔ انوش' فائزہ باجی' ماما میں بھی کچھ ہوں کہ نہیں۔'' میں نے جھنجلاہٹ سے کہا۔

''اوہو ایک تو تمہارا تھرمامیٹر کا پارہ ہائی رہتا ہے۔ اچھا بابا اب بتاؤ تم کیسی ہو تمہاری صحت کیسی ہے؟

اتنی دبلی کیوں ہو رہی ہو؟'' وہ منانے کی کوشش کرنے لگے۔

''اصل میں بات پتا کیا ہے؟ آپ کی انوش سے' فائزہ باجی سے' ماما سے ایک دوستی ہے۔ ایک فرینڈ شپ کا بونڈ ہے جو کہ میرے ساتھ نہیں ہے اس لیے آپ کو ان سب کا خیال رہتا ہے۔ میرا نہیں رہتا۔'' میں نے ان کو کچھ باور کرانا چاہا۔

''پاگل لڑکی! ایسی سوچ کیوں رکھتی ہو۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ میں سب سے زیادہ تم ہی سے اٹیچ ہوں۔ میری انڈر اسٹینڈنگ تمہارے ہی ساتھ ہے۔'' ذوالفقار کا چہرہ پل بھر کے لیے حیران ہوا پھر مسکرا اٹھا۔

''اچھا مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ ہمارے درمیان نہ دوستوں جیسی باتیں ہوتی ہیں اور نہ ہی دوستوں کی طرح کی ملاقاتیں۔ آپ ابھی تک مجھ سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے کہ میں ابھی تک دس بارہ سال کی ہوں۔ مجھے یہ سب پسند نہیں ہے زلفی!'' پتا نہیں میرے منہ سے نکلا تھا یا میں نے جان کر کہا تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پل بھر کو مجھے خود بھی ان کو اس طرح زلفی پکارنا عجیب لگا لیکن اس پر وہ حیرت زدہ ہو گئے۔

''کیا کہا تم نے؟''

''ہاں تو دوست بنایا ہے تو پہلا اصول دوستی میں بے تکلفی کا ہوتا ہے۔ نو سوری' نو تھینکس' نو فارملٹی' جسٹ فرینڈ شپ۔'' میں نے اعتماد سے کہا تو انہوں نے مسکرا کے اوکے کہہ دیا۔

میں نے کیسٹ پلیئر آن کیا تو کسی گلوکارہ کی مدھر آواز گونجی۔ وہ شاید کوئی غزل تھی جس کے بول تھے۔

''میری سانسوں کو جو مہکا رہی ہے
یہ پہلے پیار کی خوشبو
تیری سانسوں سے شاید آ رہی ہے
میری سانسوں کو جو مہکا رہی ہے''

''کیا بور گانے لگاتے ہیں آپ!'' میں نے منہ بنا کے کہا۔

''بھئی عمر کا تقاضا ہے میرا۔ چالیس زینے پھلانگ چکا ہوں۔ آدھی عمر تو گزر گئی۔ اب اسی طرح کے شوق ہیں۔ غزلیں سننا' لوگوں میں زندگی بانٹنا۔'' اس وقت وہ اپنے اندر بھرپور زندگی سمو کے بولے۔

''پہلا پیار' زلفی' پہلے پیار کی خوشبو کیسی ہوتی ہے؟'' پتا نہیں کیوں میں نے یہ سوال کیا تھا۔ میرے اس سوال پر وہ پل بھر چپ رہے پھر لمبی آہ بھر کر بولے۔

''کیا تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟ پہلا پیار کہ جس کی مہک تا عمر سانسوں میں جگمگاتی رہتی ہے جس کی خوشبو تمام جیون کو معطر کر کے رکھتی ہے۔ یوں تو ہر چیز اپنی جگہ پر ہوتی ہے لیکن پیار ہر احساس کو

ایک نیا زاویہ دیتا ہے' ایک نیا رنگ دیتا ہے۔'' وہ پیار کی لمبی وضاحت کرنے کے موڈ میں تھے۔ ان کا یہ روپ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

''کبھی پیار ہونے کے بعد آسمان کی طرف دیکھنا وزہ! کتنے خواب اتر آتے ہیں ستاروں میں' کتنے رنگ لیے آتی ہیں بارشیں۔ ہجر کے درد کس طرح ہے بانٹتا ہے تنہا چاند۔ ملن کی تڑپ کس قدر بڑھا دیتی ہے ڈھلتی دھوپ' پیار ہونے کے بعد کبھی گلاب کی طرف دیکھنا وزہ! اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ کتنے دن ہوتی ہے۔ ڈالی پہ ہو تو چند دن' ڈالی سے بچھڑے تو کچھ نہیں لیکن ایک پیار ہی ہے جو اسی گلاب کو کتابوں کے گھر میں برسوں تک زندہ رکھتا ہے' اس کی خوشبو کو یادوں میں سینچتا ہے۔'' انہوں نے بھرپور لہجے میں کہا۔

''آپ اتنے رومینٹک ہیں مجھے علم نہ تھا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''آج ہی تو دوستی کی ہے۔ آہستہ آہستہ سب علم ہو جائے گا۔''

☆

موبائل فون پر کتنی دیر سے بیل بج رہی تھی لیکن عالم غنودگی میں فون اٹینڈ کرنے کا میرا موڈ ہی نہ ہوا لیکن جب فون کرنے والے نے بھی ڈھیٹ پن کا ثبوت دیتے ہوئے ٹرائی کرنا بند نہ کیا تو مجھے مجبوراً فون اٹھانا پڑا۔ انوش کا موبائل نمبر اسکرین پر جھلملا رہا تھا۔ پہلے تو میں نے فون آف کر دینا چاہا لیکن پھر میں نے بنا کچھ سوچے یس کا بٹن پش کر دیا۔

''بولو انوش! کیوں فون کیا؟'' میں نے بے زاری ہی ظاہر کی۔

''اف اللہ کچھ آداب محبت بھی ہوتے ہیں اور اگر محبت نہیں تو آداب تمیز بھی ہوتے ہیں۔ بھئی فون سنتے وقت ہیلو' سلام دعا' ہائے وغیرہ کہنا ممنوع نہیں ہے۔'' انوش نے حسب سابق اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''وقت ضائع کیے بغیر بات کرو۔ میرے پاس فرصت نہیں۔ تمہارے پاس صرف دس سیکنڈ ہیں۔ ایک.....'' میں نے گنتی شروع کر دی۔

''رکو' رکو' کہنا یہ تھا کہ کل زلفی چچا کی سالگرہ ہے۔ میں انہیں شام کو ان ہی کے گھر پر ایک سرپرائز پارٹی دینا چاہتا ہوں تم بھی آ جانا۔'' اس نے یہ کہہ کر سانس لی۔

''اس کا مطلب یہ کہ تم انہیں نہیں بتاؤ گے کہ تم انہیں پارٹی دے رہے ہو؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''آف کورس' میں نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی تم انہیں بتاؤ گی کہ میں نے ان کے لیے کوئی سرپرائز پارٹی ارینج کی ہے۔'' وہ چہک کر بولا۔

"اوکے۔" میں نے بھی مسکرا کے ہامی بھر لی لیکن انوش کا فون بند ہوتے ہی میرے دل میں عجیب سا خیال آیا۔ پچھلے کتنے سالوں سے میں زلفی کو اس کی برتھ ڈے وش کرتی آئی تھی لیکن اسی طرح' کبھی انوش کے ساتھ تو کبھی ماما پاپا کے ساتھ انہیں سرپرائز پارٹی دے کر' کتنے سالوں سے میں ان سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ ہی نہ پائی۔ اس کے پیچھے اور چاہے کتنی بھی وجوہات ہوں اولین وجہ یہ تھی کہ دوسروں کی موجودگی میں ذوالفقار سب کے ہوتے ہیں لیکن کم از کم میرے نہیں ہوتے لیکن اس بار میں چاہتی تھی کہ وہ میرے ہوں۔ صرف میرے' اس لیے میں اس بار ان کے ساتھ اور کسی کی بھی موجودگی نہیں چاہتی تھی۔ کسی صورت نہیں۔ میں نے بیٹھے بٹھائے ہی ایک پلاننگ کی اور اگلے ہی لمحے اس پر عمل کرنے کے لیے میں ذوالفقار کے گھر پہنچ گئی۔ میں ذوالفقار کو ان کی پسند کا برتھ ڈے گفٹ دینا چاہتی تھی اور ان کی پسند جاننے کے لیے میرے لیے شمیل بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ شمیل ذوالفقار چھ سالہ شراتی سا بچہ تھا جو کہ نہ صرف ذوالفقار کو بلکہ سبھی کو یہاں تک کہ مجھے بھی بہت پسند تھا۔ وہ تھا ہی ایسا' گول مٹول سا اپنی عمر سے دس سال بڑی بڑی باتیں کرنے والا۔

"ہیلو شمیل! کیسے ہو؟" میں گھر پہنچی تو وہ ویڈیو گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔

"ارے وزنہ باجی آپ۔ پاپا تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ تو اسپتال میں ہیں۔" وہ فوراً میری طرف متوجہ ہوا۔

"لیکن میں تو آپ سے ملنے آئی ہوں شمیل! آپ کے پاپا سے تو میں مل لیتی ہوں کبھی کبھی۔" میں بھی اس کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی جہاں وہ اپنی ویڈیو گیم سے کھیل رہا تھا۔

"اچھا آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔" اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا۔

"جی ہاں۔" میں نے زور سے اسے پکڑا اور اسے گال پر پیار کیا۔ اس سے میں بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ کچھ ضروری کچھ غیر ضروری۔ کسی کارٹون فلم کے کیریکٹر کے بارے میں تو کبھی کسی گیم کے متعلق۔ میں انہی فضول باتوں کے ذریعے کچھ ضروری باتوں کی کھوج لگانا چاہتی تھی۔

بہت دیر بیٹھنے اور باتیں کرنے کے بعد میں نے اسے ذوالفقار کے کمرے میں چلنے کو کہا اور اس نے فوراً ہامی بھر لی۔

زلفی کا کمرہ تھا۔ اس میں ان کی مانوس مہک تھی اور اس مہک میں غیر ارادی طور پر میں ان ہی کو محسوس کر رہی تھی۔ ان کے خال وخد' ان کی باتیں اور ان کی محبت میرے اندر شور مچاتی محسوس ہوئی۔ ذوالفقار اور ان کا وجود اور اس وجود سے منسلک ہر چیز کتنی مقدس تھی میرے لیے' کتنی اہم اور کتنی خوب صورت لیکن المیہ تو یہ تھا کہ اتنے سالوں سے وہ اس محبت کی بھنک بھی حاصل نہ کر پایا تھا۔ اس محبت کے وجود سے واقف ہی نہ تھا۔ کیسے کہہ پاتی میں اسے کہ جب وہ ہی اسے تسلیم نہ کر پاتا۔

میرا ہر خواب میرے سچ کی گواہی دے گا
وسعتِ دید نے' تجھ سے تیری خواہش کی ہے
میری سوچوں میں کبھی دیکھ سراپا اپنا
میں نے دنیا سے الگ تیری پرستش کی ہے

پورے ماحول پر آسمانی رنگ حاوی تھا۔ آسمانی پردے اور ان کے اوپر گلابی پھول۔ پھولوں والی بیڈ شیٹ اور سائیڈ لیمپ کے اوپر بھی پردوں والا ہی کپڑا چڑھا تھا۔ بیڈ کے اوپر ذوالفقار اور انبساط آنٹی کی شادی والی تصویر جس میں دونوں ہی خوش لگ رہے ہیں۔ کتنے مکمل لگ رہے تھے دونوں وہاں۔ پل بھر کو میں نے خود کو انبساط آنٹی کی جگہ پر رکھ کے دیکھا۔

زلفی کے کمرے میں مجھے اس کے وجود کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں مگن ہونے کے باوجود میں شمیل کا پتا ہی نہ لگا پائی۔ وہ تو اپنے پاپا کے کمرے کے نرم بستر پر سو چکا تھا۔ یہ بچوں کی دنیا بھی عجیب خوابوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب جہاں جیسے دل کیا سو گئے جب چاہا جاگ گئے۔

ذوالفقار کی رائٹنگ ٹیبل پر میں بیٹھی کچھ کھوج رہی تھی۔ شاید کچھ مل سکتا تھا۔ ان کی پسند ناپسند کے متعلق کچھ سراغ یا پھر کوئی نشان۔ ایک دراز کھولی تو اس میں فائلیں تھیں۔ چھوٹی بڑی' کئی فائلیں۔ دوسری دراز بھی کئی الم غلم چیزوں سے بھری تھی۔ کئی سارے پین' کاغذ' وزیٹنگ کارڈز' دعوت نامے وغیرہ وغیرہ۔ تیسری دراز میں میڈیکل کی کچھ کتابیں تھیں۔ میں نے جھنجلا کے دراز بند کر دی پھر دوبارہ کھولی۔ دوسری والی دراز میں اندر تک ہاتھ ڈالا تو کوئی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی۔ شاید کوئی کتاب نما چیز۔ میں نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ وہ کوئی ڈائری تھی۔ میں نے اسے کھولا تھا اس میں سے چند تصاویر کارپٹ کے اوپر گر گئیں۔ میں نے انہیں اٹھا کے غور سے دیکھا تو وہ انبساط آنٹی کی تصاویر تھیں۔ شاید پریگنینسی کے وقت کی۔ میں نے وہ تصویریں اس ڈائری میں اور ڈائری اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دی۔ نہ جانے کس خیال کے تحت لیکن میں یہ کر چکی تھی پھر میں وہاں زیادہ رکی نہیں اور کام والی کو بتا کے واپس گھر آ گئی۔

☆

"انبساط میری زندگی میں جتنی خاموشی سے آئی تھی اتنی ہی خاموشی سے وہ واپس لوٹ گئی۔ دور بہت دور۔ تاریکیوں میں' خلا کی وسعتوں میں' جہاں نہ میں پہنچ سکتا ہوں اور نہ میرا تخیل۔ اس نے جتنی سادہ زندگی بسر کی اتنی ہی سادگی سے وہ موت کو بھی اپنا گئی۔ وہ عورت جس کا وجود میری روح کے لیے باعث مسرت تھا وہ عورت جو میرے لیے محبت کا زندہ و سالم سراپا تھی۔ وہی عورت آج میرے سامنے اپنی سانسیں توڑ گئی۔ اتنی خاموشی سے اس کی روح ہمارے چھوٹے سے گھر کے در و دیوار سے پرواز کر گئی کہ خود میں بھی جان نہ پایا۔ اس نے اس گھر کو خود اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ اس گھر کو جسے وہ اپنی ننھی سی

جنت کہا کرتی تھی۔ اس گھر سے اس کی روح پرواز کر گئی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اس کی روح اس گھر کے در ودیوار میں تحلیل ہو چکی ہے جو تا عمر یہاں سے جا نہیں سکتی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ یہ گھر اور اس گھر کے حصار بھی اسے روک نہ پائیں گے۔

تنہائی کا احساس اس قدر گہرا ہے کہ زندہ رہنا بھی عجیب لگتا ہے لیکن انبساط کو میری تنہائی کا مجھ سے زیادہ خیال تھا اسی لیے تو اپنے جانے سے قبل وہ مجھے شمیل دے گئی جو اس کا نعم البدل تو نہیں البتہ میری زندگی کی واحد امید ضرور ہے۔"

زلفی کی ڈائری کا یہ ورق اور یہ تحریر میری پلکیں بھگو گئیں۔ وہ باہر سے کتنے بھی بہادر بننے کی کوشش کرتے ہوں لیکن ان کا دل بہت نرم ہے۔ پل بھر کو مجھے انبساط آنٹی پہ رشک آیا کہ ان کی زندگی میں کتنے اچھے انسان کا ساتھ ملا انہیں جو ان سے اتنی گہرائی سے محبت کرتا ہے اور پل بھر کو مجھے ان سے جلن بھی ہوئی کہ آخر اتنی محبت زلفی نے کسی اور سے' مجھ سے کیوں نہیں کی۔

اسی طرح ملے جلے جذبات کے زیراثر میں نے ڈائری کے چند اوراق آگے پلٹے۔

"پتا نہیں زندگی نے مجھ سے امتحان لینے کا سلسلہ شروع کیوں کر دیا ہے۔ آج ندیم نے بھی اپنا راستہ مجھ سے بلکہ پوری دنیا سے الگ کر لیا۔ انبساط کے جانے کے بعد ایک وہی تو سہارا تھا میرا۔ میرا بازو' میرا رونے والا کندھا۔ میرے درد کا درماں' آج وہ درماں بھی مجھ سے میرے خدا نے لے لیا۔ شکایت کس سے کروں کہ یہ معاملہ تو خدا کا ہے۔ انبساط نے میرے لیے شمیل کو چھوڑا اور ندیم نے میرے لیے فائزہ اور ونزہ کو۔

سچ کہوں تو میں بہت بکھر گیا ہوں لیکن اگر میں بکھر گیا تو فائزہ اور ونزہ کا کیا ہوگا۔ فائزہ تو پھر بھی سمجھ دار ہے' فرحانہ بھابی کا سہارا بنی ہوئی ہے لیکن ونزہ! میں جب بھی اس کے معصوم نین نقش دیکھتا ہوں اور اس کی آنکھوں میں پنہاں تشنگی پاتا ہوں تو تڑپ اٹھتا ہوں۔ یقیناً اس نے نہ صرف اپنا باپ بلکہ ایک دوست بھی کھویا ہے لیکن میں ونزہ کے ساتھ رہوں گا۔ میں اس کی اس تشنگی کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس کا دوست بنوں گا۔ اس کی زندگی میں حائل ہر رکاوٹ کو دور کر کے اسے نئے منزلیں دکھاؤں گا۔"

اپنے بارے میں زلفی کے اتنے اچھے خیالات پڑھ کر میں پل بھر کو جھوم اٹھی۔ آگے ایک اور ورق میرا منتظر تھا۔

"انوش ونزہ کو پسند کرتا ہے۔ اسے اپنانا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں بہت نازک جذبات رکھتا ہے۔ مجھے اس کی یہ بات بے حد پسند آئی اور فائزہ کی بارات والے دن میں نے فرحانہ بھابی سے بات بھی کی۔ انہوں نے یہ خوشی اپنی رضامندی ظاہر کر دی لیکن پرسوں جب انہوں نے ونزہ کو بتایا تو وہ

پریشان ہو گئی ہے اور بقول اس کے وہ انوش سے پیار نہیں کرتی۔

"پگلی بچی ہے نا اس لیے لیکن مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ وہ سمجھ جائے گی سب کچھ"

ذوالفقار کی لکھی یہ تحریر حالانکہ مجھے کچھ زیادہ اچھی نہ لگی تھی لیکن اطمینان مجھے ایک چیز کا تھا کہ ہاں' میں کچھ ہوں' ان کی نظر میں' ان کے دل میں میری اہمیت بھی ہے اور چونکہ انہیں میری فکر ہے اس لیے مجھ سے منسلک ہر چیز کی انہیں فکر ہے۔ اسی طرح کی سوچوں کے زیراثر میں نے کل کی پلاننگ کی اور کل کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں اور آرام سے کمرے میں جا کے سو گئی۔

☆

میں ان کے کلینک کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ آج مجھے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی' اٹھنے کے بعد مجھے درزی کے پاس جانا پڑا۔ وہ سوٹ لیا جو کہ میں نے اسپیشلی آج کے دن کے لیے بنوایا تھا۔ فیروزی کلر کا جارجٹ کا سوٹ اور چائنا سلک کا گلابی اور فیروزی شیڈ کا دوپٹہ۔ تیار ہونے کے بعد میں نے ماما سے اجازت لی اور سیدھا شفاء نرسنگ ہوم پہنچ گئی جس کا سنگ بنیاد میرے پاپا نے ہی رکھا تھا۔ ذوالفقار کے ڈیوٹی آورز دس سے ایک بجے صبح اور شام چھ سے نو تک تھے۔ میں بارہ بجے ان کے کلینک پہنچ چکی تھی۔ آج شاید میری قسمت اچھی تھی کہ مریضوں کی تعداد کافی کم تھی۔ پندرہ منٹ باہر انتظار کیا اور پھر ان کا دروازہ ناک کر کے اندر آ گئی۔ انہوں نے دیکھا ایک بھرپور نظر ڈال کر' کچھ کچھ حیرانی سے' کچھ کچھ خوشگوار سے احساسات سے اور ان کی آنکھیں...... مجھے ایک عجیب سے احساس میں گرفتار کر گئیں..... احساس ایک ماورائی کا' پل بھر کو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں دنیا کی سب سے اہم شخصیت ہوں۔ پتا نہیں ان کی آنکھوں میں ایسا سحر کیوں تھا؟

"ارے ونزہ تم۔ حیرت ہوئی۔" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آئے۔ کلینک کے اندر کا ماحول بھی خواب ناک تھا۔ ویل کارپیڈ کمرہ اے سی کی خنک ہوا۔

"آؤ' آؤ' بیٹھو" انہوں نے مجھے صوفے پر بٹھایا۔

"آج تو بالکل شہزادی لگ رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے آج تم نے میری پسند کا رنگ پہنا ہے۔" انہوں نے میرے دونوں گالوں پر پیار سے ہاتھ رکھے۔ ایک عجیب سے احساس نے مجھے گھیر لیا۔

"اچھا عجیب اتفاق ہے۔ ویسے مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ آپ کا بھی پسندیدہ کلر ہے۔" میں نے صفائی سے ایک جھوٹ گھڑ لیا۔

"یہ بتاؤ اس طرح اچانک کیسے آنا ہوا۔" وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے ٹیبل تک گئے اور فون اٹھایا۔

"ہاں سلمان یہ بتاؤ کتنے مریض باقی ہیں۔ تین' اچھا کوئی ایمرجنسی تو نہیں۔ تو پھر ایسا کرو ڈاکٹر

شازیہ سے کہو کہ انہیں اٹینڈ کر لیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون رکھا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

''آپ کو پتا ہے کہ آپ کو آج کا سارا دن میرے ساتھ گزارنا ہے۔'' میں نے ان سے پوچھا نہیں انفارم کیا تھا۔

''اچھا وہ کس خوشی میں؟'' وہ مسکرائے۔ میں صوفے سے اٹھی اور ان کی کرسی کے نزدیک گئی۔ ان سے بہت قریب آ کے میں مخاطب ہوئی۔

''وہ اس خوشی میں آج کا دن آپ کا جنم دن ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' میں نے انہیں کے سے انداز میں کہا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔

''او ہو بھئی تمہیں تو یاد ہے۔'' ان کی خوشبو مجھے اپنی سانسوں کو معطر کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''مجھے یاد نہیں ہو گا تو کسے یاد ہو گا۔ مجھ سے زیادہ نزدیک اور کون ہے آپ کے؟'' میں نے والہانہ پن سے اپنی آنکھیں ان پر ٹکائیں لیکن انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

''انوش نے بھی اس بار وش نہیں کیا۔'' پھر اس دم چھلے کا ذکر آ پہنچا۔

''آج آپ کو اپنے سارے پروگرام کینسل کرنے پڑیں گے۔ نو کلینک' نو پیشنٹ' نو میٹنگ۔ میں نے پورا پروگرام بنا لیا ہے۔ ابھی ہم لنچ کرنے کسی ریسٹورنٹ میں جائیں گے۔ لنچ کے بعد ہم آپ کے گھر چلیں گے اور آپ کی پرانی تصویریں کھول کر دیکھیں گے۔ اس کے بعد شام کو ہم ساحل سمندر پر جائیں گے اور وہیں سے ڈنر کرنے کے بعد ہم گھر واپس آئیں گے۔'' میں نے یہ پروگرام سوچ سمجھ کر بنایا تھا کیونکہ ذوالفقار کی ڈائری میں ایک ایسی ہی سالگرہ کی شام کا ذکر تھا جسے انہوں نے انبساط آنٹی کے ساتھ ٹھیک اسی طرح بنایا تھا۔ میرا بنایا ہوا یہ پروگرام سن کر وہ کچھ لمحے خاموش رہے۔ حیرانی اور اضطراب کے ملے جلے تاثرات تھے ان کے چہرے پر۔ جیسے کہ برسوں بعد کسی کھوئی ہوئی چیز کے مل جانے پر ہوتے ہیں۔ کچھ کچھ خوشی کے کچھ کچھ حیرانی کے۔

''کیا ہوا؟ میرا پروگرام پسند نہیں آیا کیا؟''

''ارے نہیں بس ویسے ہی۔ چلو آج تمہارے پروگرام پر ہی عمل کریں گے۔ ویسے ونزہ' آج سالوں بعد مجھے لگا ہے کہ مجھے جاننے والا کوئی ہے۔'' انہوں نے پیار سے کہا۔ میرے دل میں پھول کھل اٹھے اور ہم دونوں پھر کلینک سے نکل کر لنچ کرنے ریسٹورنٹ گئے۔

ریسٹورنٹ میں آج میں نے جان کر باقی چیزوں کے ساتھ بون لیس ہانڈی بھی منگوائی تھی کیونکہ یہ ڈش ذوالفقار کی فیورٹ تھی۔ انبساط آنٹی سے بنوا کے وہ کھایا کرتے تھے اور جب میں نے ان کے لیے منگوائی تو وہ بہت حیران ہوئے۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں' پہلی محبت' پہلے پیار کی خوشبو انہیں کے لیے محسوس کرتی ہوں۔ لیکن ان سے باتیں

کرتے کرتے میں ہمت ہی نہیں کر پاتی۔ کیوں' آخر کیوں؟ میں اپنے اندر کی ڈرپوک لڑکی کو مار نہ سکی' کیوں میں کہہ نہیں پاتی یہ کوئی اتنا مشکل تو نہیں۔ انوش کتنی آسانی سے مجھے آئی لو یو کہتا رہتا ہے۔ پھر میں پچھلے دس سال سے ایک مرتبہ بھی نہیں کہہ پائی' آخر کیوں؟ بے شک پہلے میں بچی تھی لیکن اب بچی نہیں ہوں۔ اب تو بالغ ہوں۔

ریسٹورنٹ سے نکلنے کے بعد ہم زلفی کے گھر آئے۔

خلافِ توقع شمیل گھر پر نہیں تھا' کام والی نے بتایا کہ وہ انوش کے ساتھ گیا ہے۔ شکر ہے' ورنہ اس کی موجودگی میں ذوالفقار کم از کم مجھ پر توجہ ہی نہیں دے سکتے تھے۔

ہم زلفی کے ہی کمرے میں بیٹھے نیچے کارپٹ پر۔

انہوں نے پرانے فوٹو البمز کے ڈھیر لگا دیئے اور خود میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کام والی چائے لے آئی تو وہ میرے سامنے بیٹھے چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے لگے۔ کتنی تصویریں تھیں ان کی کلیکشن میں۔

کالج کی...... یونیورسٹی کی...... میرے پاپا کے ہمراہ...... گریجویٹ بن جانے پر...... ان کی شادی کی...... ہنی مون کی...... شمیل کی پیدائش وغیرہ وغیرہ' ہر تصویر میں ایک الگ ذوالفقار ہر تصویر میں کچھ الگ زاویئے ان کی شخصیت کے۔ میں نے چند ساعتوں بعد محسوس کیا کہ وہ بجائے میرے ساتھ تصاویر دیکھنے کے کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔

''آپ تصویریں کیوں نہیں دیکھ رہے؟'' میں نے کہا' وہ جیسے چونک گئے۔ یقیناً میں انہیں ماضی کی دوریوں سے واپس حال میں کھینچ لائی تھی ان کے چہرے پر حسرت و یاس کے تاثرات اس بات کے گواہ تھے کہ وہ اس وقت میرے ساتھ مکمل طور پر نہیں بیٹھے بلکہ کہیں اور تھے کسی اور کے ساتھ۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ متوجہ ہوئے۔

''میں نے یہ کہا کہ آپ کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تصویریں کیوں نہیں دیکھ رہے۔'' میں نے ہلکا پھلکا ہونے کی کوشش کی۔

''گڑے مردے اکھارنے سے تکلیف ہی ہوتی ہے۔ پتا نہیں ونزہ' میں اپنے ماضی میں ذرا بھی جھانکتا ہوں تو بہت اداس ہو جاتا ہوں۔ یوں تو ہر کسی کے ماضی میں کڑواہٹ ہوتی ہے لیکن میرا ماضی بہت حد تک خوشگوار ہونے کے باوجود بھی مجھے اداس کر دیتا ہے۔ ونزہ میں پھر سے اکیلا ہو جاتا ہوں۔ یہ ساری تصاویر دیکھ کے' یقیناً ذوالفقار کے چہرے پر تشنگی کے وہ سائے تھے جو میں پہلے کبھی بھی نہ دیکھ پائی تھی۔

''چلیں چھوڑیں۔ ہم مزید تصویریں نہیں دیکھتے۔''

میں نے البمز پرے ہٹائے۔

''ارے نہیں نہیں' دیکھو تم' یہ تو پہلے سے طے تھا۔ میں تو بس یوں ہی ڈسٹرب ہوگیا تھا۔ بوڑھا ہو رہا ہوں ناں اس لیے۔'' انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''ایک بات پوچھوں' بتائیں گے؟'' میرے کہنے پر انہوں نے مثبت جواب دیا۔

''انبساط آنٹی ابھی تک یاد آتی ہیں آپ کو؟'' یہ پوچھنا تھا کہ زلفی کے چہرے پر ڈھلتی شام کے سائے اترنے لگے۔ تنہائیوں کی ان گنت شامیں ان کی آنکھوں میں زندہ ہوگئیں۔ وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑے لگنے لگے تھے۔

''ونزہ! یاد تو ان کی آتی ہے ناں' جن کو پل بھر کے لیے بھی فراموش کیا جاسکے جو لوگ دل کی گہرائیوں تک اتر چکے ہوں' انہیں چاہ کر بھی کوئی کس طرح بھلا پائے۔ کیا کبھی سمندر کی کوئی موج سمندر کے اندر بسی ہوئی دولت کو کنارے پر پھینک سکی ہے۔ لاکھوں کروڑوں سیپیوں کے موتی کیا کبھی کسی لہر نے سمندر سے باہر گرائے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ونزہ۔ کوئی انسان چاہ کر بھی کسی کے یاد کے موتی دل کے سمندر سے نکال نہیں پاتا۔ اگر نکال سکے تو انسان کہاں سے کہلائے۔ انسان تو بہت انوکھی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی' جس کا دل وفا' محبت' نرمی' احساسات' پاکیزگی اور جانے کن کن جذبوں سے ملا کر بنایا گیا ہے۔'' وہ بہت تفصیل سے' بہت وضاحت سے بولے۔ اپنے دل کا درد قطرہ قطرہ منتقل کرتے رہے میرے دل میں' میرے محبت بھرے دل میں۔

''آپ اپنی یہ تنہائی ختم بھی تو کرسکتے ہیں۔ انبساط آنٹی کے بعد آپ کو کبھی دوسرے ساتھی کا خیال نہیں آیا؟'' میں آہستہ آہستہ اپنے جذبوں کے زیر اثر آرہی تھی۔

''ونزہ! زندگی میں اہمیت صرف پہلی چیز کی ہوتی ہے۔ پہلا پیار پہلی شادی' پہلا بچہ' پہلا لمس' بعد کی باقی چیزیں صرف ڈھارس ہوتی ہیں اپنے دلوں کو جھوٹا اطمینان دلانے کے لیے۔'' وہ عجب بے دلی سے بولے۔

''لیکن پھر بھی کوئی تو نعم البدل۔'' میں بھی گویا بضد تھی۔

''نہیں ونزہ نہیں۔ انبساط محبت کی تکمیل تھی۔ وہ ایک بھرپور عورت تھی۔ جو کہ جتنی اچھی دوست تھی' اتنی ہی اچھی عورت تھی۔ اس کا وجود ہر لمحہ ایک نیا رنگ ہوتا تھا۔ یکسانیت سے بہت دور۔ میں جب کبھی بیمار ہوتا تو وہ ایک ماں کی طرح میرے لیے فکرمند ہوتی تھی۔ کسی ٹینشن کے وقت' وہ ایک دوست کی طرح مجھے فریش کرتی۔ کبھی مجھے چھوٹے چھوٹے لطیفے سنا کر ہنساتی تو کبھی اپنی اداسی بے کم وکاست مجھ سے شیئر کرتی۔ وہ مکمل عورت تھی اور پھر جب شمیل کی آمد کی نوید ملی تو میری تکمیل گویا معراج پر پہنچ گئی۔ ایک مکمل گھر' ایک اچھی بیوی' قدرت کی دی ہوئی بے پناہ عزت اور اب اولاد کی نوید۔ اس وقت ذوالفقار احمد

بہت مغرور ہوگیا تھا ونزہ۔ جب میں اپنے دونوں بازوؤں میں انبساط کو تھام کے کہتا کہ ''میں اس دنیا پر حکومت کرتا ہوں۔'' تو میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہتی کہ ذوالفقار اللہ سے ہمارے ساتھ کی دعا مانگو اور میں غرور سے کہتا کہ اتنی مشکل سے تمہیں پایا ہے۔ اب تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا اور شاید میرا یہی غرور قدرت کو برا لگا اور صرف ایک ہی پھونک سے میرا پورا کا پورا گھروندا زمین بوس ہوگیا اور میں تاعمر اکیلا رہ گیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس ٹھوس انسان کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں اور میں خاموشی سے انہیں سنتی رہی۔ وہ پہلی مرتبہ اس کی باتیں میرے سامنے کر رہے تھے لیکن میں پتا نہیں کیا محسوس کر رہی تھی۔ کچھ عجیب احساس' کبھی جیت کے تو کبھی ہار کے۔

''انبساط کی جگہ کوئی عورت نہیں لے سکتی ونزہ۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کے بولے۔

میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ میں ان کی جگہ لے کے دکھاؤں گی۔

ساحل سمندر پر کچھ دیر ہوا آنے اور ڈنر کرنے کے بعد میں گھر پر ہی اتر گئی۔ واپس زلفی کے گھر جانے اور انوش کی سرپرائز پارٹی انجوائے کرنے کا میرا موڈ نہیں تھا۔ اسی لیے میں گھر آگئی۔ اور وہ گفٹ جو میں نے زلفی کے لیے خریدا تھا وہ بھی اپنے ہینڈ بیگ میں ہی بھول گئی۔ نیو بلیو کلر کی ٹائی جس کے اوپر سلور اسٹرائپس بنے تھے۔ یہ ان کے لیے میرا پہلا تحفہ تھا۔ میرے نشیمن کا پہلا تنکا۔

میرے محبت کے گھروندے کی پہلی سل۔ ابھی تو مجھے پورا گھروندا بنانا تھا اور ابھی بہت تنکے جمع کرنے تھے مجھے۔

''کیسی رہی تمہاری کل کی شام' بلکہ پورا دن۔'' ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی ماما نے سوال کیا۔

''شروعات تو اچھی ہوئی تھی۔ اینڈ بوریت والا ہوا۔''

میں گرما گرم پراٹھا کھاتے ہوئے بولی۔

''ونزہ! تم کسی ناول یا فلم کی بات کر رہی ہو کیا؟ شروعات اچھی ہوئیں اینڈ غلط۔'' ماما مسکرادیں۔

تبھی وہ دم چھلے صاحب تشریف لے آئے۔

''ارے انوش بیٹا' کیسے ہو کہاں ہو اتنے دنوں سے؟'' ماما اسے دیکھ کر ہی خوش ہوگئیں۔

''السلام علیکم آنٹی' میں تو ادھر ہی ہوں لوگ پتا نہیں کیوں عید کا چاند ہوگئے ہیں۔ دعوتوں پر بھی نہیں آتے۔'' وہ یقیناً میری جانب ہی اشارہ کرکے بولا۔

''دعوت' کیسی دعوت بیٹا؟'' یقیناً یہ ماما کے لیے نئی خبر ہی تھی۔

''بس آنٹی جانے دیں۔ پچھلی رات کا درد دوبارہ نہ جگائیں۔'' وہ میری طرف گھور کے بولا۔

''کیسا درد بیٹا؟'' ماما پریشان ہوگئیں۔

''کل میں نے زلفی چچا کی سرپرائز برتھ ڈے پارٹی رکھی تھی۔ ان محترمہ مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ کو بھی

دعوت دی تھی لیکن یہ موصوفہ خود تو نہیں آئیں زلفی چچا کو بھی ڈنر کے لیے لے اڑیں۔ ادھر میں اور شمیل اور فائزہ باجی چار گھنٹے انتظار کرتے رہے۔ نہ زلفی چچا کلینک پر تھے نہ اسپتال میں اور نہ ان کا موبائل فون آن تھا۔ رات کو ونزہ صاحبہ کو گھر چھوڑنے کے بعد وہ اسپتال گئے تو کوئی ایمرجنسی سرجری نکل آئی۔ کسی سات سالہ بچی کے اپینڈکس کا آپریشن کرنا پڑا اور وہ رات دو بجے گھر آئے ہیں۔ ہمارے سارے سرپرائز کا بیڑہ غرق ہو گیا اور ان محترمہ نے ان کو بتایا بھی نہیں۔'' انوش نے انتہائی مظلومانہ طریقے سے روداد سنائی۔ میں وہاں سے اٹھی اور صوفے کے ساتھ رکھے فون پر ایک نمبر پش کیا۔

''پوچھیں پوچھیں آنٹی اس سے کیوں' کیوں کیا اس نے ایسا؟'' وہ روہانسا ہونے لگا میں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

''بولو ونزہ کیوں کیا تم نے ایسا؟'' ماما نے بھی مصنوعی خفگی ظاہر کی۔ میں نے فون رکھا اور اٹھی۔

''ماما! اس سے پوچھیں کہ اس نے مجھے چپ رہنے کا کہا کہ نہیں' پوچھیں۔ وعدہ لیا تھا اس نے مجھ سے کہ نہیں۔ اگر اتنا ہی خیال تھا اپنی سرپرائز پارٹی کے فیل نہ ہونے کا تو پہلے ہی بتا دیتا ناں سب کو۔ میں تو ویسے ہی اتفاق سے انہیں وش کرنے چلی گئی۔'' میں نے شان بے نیازی سے کہا۔ اس پر وہ خود بھی چپ ہو گیا۔ ہونہہ بڑا آیا مجھے چپ کرانے والا۔ میں نے اپنا گاؤن فائل اور ہینڈ بیگ اٹھائے اور جانے لگی۔

''ماما! آج اشرف بہت لیٹ ہو گیا ہے۔ میری کلاس کا وقت ہونے کو ہے۔ میں چلتی ہوں۔ آج میرا پریکٹیکل ہے دیر ہو سکتی ہے۔''

''لیکن بیٹا کیسے جاؤ گی؟ اتنی دھوپ میں ایسا کرو انوش کے ساتھ چلی جاؤ۔'' ماما نے انوش کی طرف دیکھا۔

''پلیز ماما! میں رکشہ والے یا ٹیکسی والے کے ساتھ جانا پسند کروں گی۔'' میں نے انوش کو گھور کے کہا۔

''ونزہ جاؤ انوش بیٹا' اسے کالج چھوڑ آؤ' کتنی دور ہے میڈیکل کالج یہاں سے۔'' ماما کے کہنے پر موصوف فوراً اٹھے اور مجھے بھی مجبوراً اس کے پیچھے چل کے جانا پڑا۔

''یہ بتاؤ تم میرے ساتھ ایسے کیوں سلوک کرتی ہو جیسے کہ مجھ سے انجان ہو' مجھ کو بالکل نہیں پہچانتیں۔'' وہ بڑے مزے سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا میں نے ڈھٹائی دکھائی۔

''میں ایسا اس لیے کرتی ہوں کہ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور صحیح طرح سے پہچانتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کبھی کبھی ایسا کیوں لگتا ہے کہ ونزہ کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔'' اس کی نظریں ونڈ اسکرین پر تھیں مگر سماعتیں میری جانب۔

''کیونکہ ایسا ہی ہے۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔'' یہ سچائی میں اسے کئی دفعہ بتا چکی تھی مگر وہ پتا نہیں کیوں اڑا ہوا تھا' ایک ہی نقطے پر نہ جانے کیوں؟

''تو سیکھو ناں محبت کرنا' اتنا برا نہیں ہوں میں۔'' وہ بہ ظاہر سنجیدہ تھا۔

''محبت کوئی ٹانسلز یا اپینڈکس کا آپریشن ہے کہ جسے سیکھا جائے۔ نیچرل چیزیں نیچرل ہی رہتی ہیں مسٹر۔ جو آپ ہی آپ ہو جائیں۔ بادلوں کو اللہ تعالیٰ کسی ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نہیں بھیجتا کہ برسنا سیکھ آؤ۔ ان کا وجود بنایا ہی بارش کے لیے ہے۔ اس طرح محبت بھی کسی حکم کی تابع نہیں ہوتی۔ محبت کرنا سیکھ لو۔'' میں نے منہ چڑا کر اس کی نقل اتاری۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔

''پتا نہیں کس طرح گزارا کرو گی میرے ساتھ ونزہ ندیم علی' میں اس قدر شوخ اور رومینٹک اور تم اس قدر سڑیل اور بور۔ یا اللہ یہ تم نے کس طرح محبت کروادی ہے آسمان کو زمین سے۔'' وہ گاڑی کو شفاف سڑک پر تیزی سے اڑانے لگا۔ باقی کا راستہ میں چپ ہی رہی۔

اس کی فضول باتوں کا نہ میرے پاس کوئی جواب تھا اور نہ ہی وقت۔ کالج آیا تو میں خاموشی سے اتر گئی لیکن آخر میں گاڑی کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

☆

میرے فرسٹ ایئر کے پیپر ہونے لگے تو میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئی۔ دن رات پڑھنا' کبھی کسی کلاس فیلو کے ساتھ جوائنٹ اسٹڈی کرنا تو کبھی رات رات بھر جاگ کر تھیوری کی تیاری کرنا' ایسے میں نہ کھانے کا ہوش رہتا اور نہ سونے کا۔ کہاں میں رات کو نیٹ پر بیٹھ کے ایف ایم 100 کے گانے سننے والی اور کہاں یہ سخت ترین روٹین' خدا خدا کر کے کسی طرح سے پیپر ختم ہوئے۔ آج میں آخری پیپر کر کے گھر جا رہی تھی۔ بارش بھی شروع ہو چکی تھی اور میں نے گھر سے کوئی چھتری بھی نہیں لی تھی۔ صبح ہلکے ہلکے بادل ہی چھائے تھے۔ اس طرح کی بارش کا تو نشان بھی نہ تھا لیکن اب اس طرح۔

کالج کی بلڈنگ سے گیٹ تک آتے ہوئے میرے کپڑے کافی بھیگ چکے تھے اور میرے جسم سے چپکے جا رہے تھے۔ باہر آئی تو میرا غصہ مزید تیز ہو گیا کہ آج مجھے لینے باہر کوئی بھی نہ آیا تھا۔ گاڑیوں کی قطاروں میں ہماری گاڑی کہیں نہ تھی۔ میں روڈ کے کونے پر لگے کینوپی کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ یہ کینوپی میڈیکل کالج کے ان اسٹوڈنٹس کے لیے بنائی گئی تھی جو سخت دھوپ اور بارش میں پوائنٹ کا انتظار کرتے ہیں۔

آہستہ آہستہ ساری گاڑیاں جانے لگیں۔ ہر اسٹوڈنٹس اپنی مطلوبہ گاڑی پر بیٹھتا اور چلا جاتا۔ اس طرح انتظار کرنے سے مجھے کوفت ہو رہی تھی اور اس قدر تیز بارش میں مجھے کوئی رکشہ بھی نظر نہیں آیا۔ سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی گاڑیاں بھی اب قدرے کم ہو گئی تھیں۔ میری جھنجھلاہٹ مزید گہری

ہونے لگی اور بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ آگے بڑھ کر کوئی بس یا رکشہ لوں کہ ایک گاڑی چرچراہٹ کے ساتھ آن رکی۔ گاڑی میں زلفی تھے میں دوڑ کر ان کی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کتنی دیر ہم دونوں خاموش رہے تھے۔ پھر انہوں نے ہی بات کی شروعات کیں۔

''اشرف کی والدہ فوت ہوگئیں کل رات کو۔ اسی لیے اس نے آج چھٹی کی۔ انوش بھی کالج گیا ہوا تھا پھر فرحانہ بھابی نے مجھے فون کیا۔ میں کلینک سے جیسے ہی فارغ ہوا تو نکل پڑا لیکن راستے میں پانی اتنا تھا کہ میری گاڑی پھنس گئی۔'' وہ وضاحت دیتے ہوئے بولے۔ میں بدستور چپ تھی۔

انہوں نے گاڑی بجائے میرے گھر لے جانے کے اپنے گھر کے گیٹ کے باہر کھڑی کی۔ میں بھی بنا کوئی سوال کیے اتر گئی۔ وہ خاموشی سے مجھے اپنے کمرے میں لے آئے۔ کچھ دیر کے لیے باہر گئے۔ جب اندر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک بلیو کلر کا کاٹن کا سوٹ تھا۔

''یہ لو ونزہ۔ اپنے گیلے کپڑے چینج کر لو۔ یہ تمہاری انبساط آنٹی کے کپڑے تھے۔ تمہارے لیے زیادہ دیر بھیگنا اچھا نہیں' بیمار پڑ سکتی ہو۔''

میں نے خاموشی سے وہ کپڑے لیے جب میں وہ کپڑے چینج کر کے اپنے بال خشک کرتی واپس آئی تو ذوالفقار چائے بنا کے لا چکے تھے اور میری جانب انتہائی محبت سے مسکرا کے دیکھ رہے تھے۔

''اگر آج آپ نہ آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔'' میں نے ان کے احسان کے بدلے میں کچھ بولنے کی سعی کی۔

''بھول جاؤ سب کچھ۔ ہاں مگر آئندہ اس طرح نہ ہو۔ یہ خیال رکھنا۔ بارش سے بچنا تمہارے اپنے ہاتھ میں بھی ہے۔'' انہوں نے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''پتا ہے آج تم انبساط کی طرح لگ رہی ہو۔ بہت فریش بہت خوب صورت۔'' انہوں نے میرے گیلے بالوں کی بھیگی لٹ کو اپنی انگلی سے میرے چہرے پر سے ہٹایا اور میں ان کے اس جملے پر اندر تک سرشار ہوگئی۔

*

آج ہم سب پکنک پر گئے ہوئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھے جا رہی تھی اور اپنے خدا سے دعا کیے جا رہی تھی کہ مجھے وہ موقع جلد ہی نصیب ہو کہ جب میں اپنا زلفی کے سامنے بنا کسی ڈر بنا کسی جھجک کے کھول دوں۔ اپنا حال دل اس کے حوالے کر دوں' لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا گو کہ عمروں کا تضاد میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن پھر بھی ایک ایسے شخص کو اپنا محبوب کہنا جس کے لیے آپ ہمیشہ بچے کی مانند ہی رہے ہوں شاید اتنا آسان نہ تھا۔ میں کھڑکی سے اندر کمرے میں آئی

تو سبھی لوگ آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فرش پر چادر بچھی تھی اور چادر پر کھانے کی چند ڈشز رکھی تھیں۔ سب مجھے ہی دیکھ کے ہنسے جا رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی۔

''کیا ہوا ہے۔ سب لوگ اس طرح ہنس کیوں رہے ہیں؟'' میں بھی مسکرا دی۔

''بھئی ہم دیکھ رہے تھے کہ مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ کس طرح کھڑکی میں کھڑی ستاروں سے باتیں کر رہی ہیں۔'' یہ فائزہ باجی تھی۔

''بھئی یہ کام شاعروں کے ہوتے ہیں' مسیحاؤں کے نہیں۔'' عمر بھائی نے بھی کمنٹ دیا۔

میں نے انہیں گھورا۔

''بھئی لوگوں کی یہ حالت تو محبوب کی جدائی میں ہوتی ہے لیکن آپ کا محبوب تو آپ کے ساتھ ہے آپ کو کیوں یہ روگ لگ گیا۔'' انوش نے اپنے خیالات ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔

''تم جیسا محبوب ہو تو قربت میں بھی ہجر محسوس ہوگا۔ بے چاری ونزہ۔'' یہ عمر بھائی ہی تھے۔

''عمر بھائی! آپ مجھے پہلے یہ بتائیں کہ آپ نے مسیحا کسے کہا؟'' میں نے پھر دہرایا۔

''آپ کو۔'' وہ بھی ڈھیٹ تھے۔

''لیکن آپ تو نیم حکیم ہو' خطرہ جان ہو۔ پورے حکیم تو یہ ہیں مشہور حکیم سرجری والے حکیم ذوالفقار احمد۔ جو دل' جگر' گردہ اچھی سے طرح سے کاٹتے ہیں۔'' عمر بھائی نے جس انداز سے کہا تھا مجھ سمیت سبھی کھلکھلا کے ہنس دیئے اور ذوالفقار نے کشن اٹھا کر سیدھا عمر بھائی کو مارا۔ شام کو میں اور ذوالفقار گھومنے اکیلے ہی چل پڑے تھے۔ باقی سب اپنی تھکن اتارنے ریسٹ ہاؤس میں ہی مقیم تھے۔ ایک میں تھی' ایک میری محبت۔

''تم انوش سے ناراض ہو ونزہ؟'' زلفی نے بات شروع کی۔ اس سے پہلے بھی وہ بات کر رہے تھے لیکن میرا جواب ان کو کم ہی ملتا۔ میں نے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔

''دیکھو ونیا میں انوش کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔'' وہ بہت نرمی سے بولے۔

''لیکن میں اچھی لڑکی نہیں ہوں زلفی۔ میں اسے خوش نہیں رکھ پاؤں گی۔ وہ یقیناً اچھا لڑکا ہے اور اس کی شادی کسی اچھی لڑکی سے ہونا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ونزہ پاگل ہو تم۔ تین سال پہلے بات طے ہوئی ہے تم لوگوں کی اور وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔'' وہ پھر اسی نرمی سے بولے۔

''جب بات طے ہوئی تھی اس وقت میری مرضی نہیں پوچھی گئی تھی۔ میری رائے جو انوش کے بارے میں تب تھی وہی آج بھی ہے۔''

''لیکن ونزہ! وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہے۔'' انہوں نے میرے یخ ٹھنڈے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''وہ مجھ سے یک طرفہ محبت کرتا ہے لیکن میں تو اس سے محبت نہیں کرتی۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''زندگی صرف محبت سے نہیں جی جاتی۔ محبت جواب میں بھی محبت مانگتی ہے۔ بے بنیاد بے تکے رشتے' جن کی کوئی سمت نہ ہو' پائیدار نہیں ہوتے۔ میں خود کو مجبور نہیں کر سکتی۔ انوش سے محبت کرنے کے لیے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پتا نہیں کیا کہنا چاہتے تھے مجھ سے۔

''کیا تمہیں کسی اور سے محبت ہے ونزہ! کوئی کلاس فیلو' کوئی دوست۔'' ان کا سوال اس کا جواب یقیناً وہی تھا جو آج مجھے کہنا تھا۔ یہی تو وقت تھا۔ یہی وہ گھڑی' وہی لمحہ' ہاں اسی وقت مجھے اپنے تمام خواب' ہر ارمان اس شخص کے سپرد کرنے تھے۔ یہی لمحہ اظہار کا تھا' اقرار کا تھا۔

''بتاؤ مجھے ونزہ کیا کوئی ہے تمہاری زندگی میں۔'' وہ میرے جواب کے منتظر تھے۔

''جی میری زندگی میں کوئی ہے۔ مجھے' مجھے کسی سے محبت ہے۔ بہت پہلے سے۔'' میرا لہجہ آپ ہی آپ بہت جذباتی سا بن گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں زلفی کے چہرے پر گاڑ دیں۔'' میرا یہ جواب سن کر زلفی بھی منجمد ہوئے۔ یوں لگتا تھا کہ اردگرد بکھرے ہوئے تمام ماحول نے ان کے وجود کو جکڑ لیا ہو۔

''کون ہے وہ؟'' بہت دیر بعد ان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''آپ ہیں؟'' میرے ہونٹ کس طرح ہلے مجھے کچھ پتا نہیں۔

''کیا؟'' انہوں نے بھی میری آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں ذوالفقار! مجھے محبت ہے آپ سے' بہت محبت کرتی ہوں میں آپ سے صرف آپ سے۔ آپ کے علاوہ کسی اور شخص کا تصور کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ آئی لو یو' آئی لو یو زلفی۔'' میں نے اپنے اندر کی تمام ہمت کو اکٹھا کر کے کہا اور وہ بنا پلک جھپکائے میری آنکھوں میں دیکھے جا رہے تھے۔ میری آنکھیں شدت احساس سے نم ہونے لگیں۔

''آپ نے کہا تھا ناں کہ پہلے پیار کی خوشبو انسان کے روم روم کو معطر کر دیتی ہے۔ میں نے پہلا اور آخری پیار آپ ہی سے کیا ہے۔ انوش کی محبت سے پہلے' انبساط آنٹی کی محبت سے قبل۔'' میں نے انہیں اعتبار دلانے کی کوشش کی یا اندھیرا زیادہ پھیل رہا تھا یا میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ان کا شفاف چہرہ تاریک ہوتا محسوس ہوا۔

''ونزہ! تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' بہت ڈوبی ڈوبی آواز تھی ان کی' ہزاروں فٹ نیچے کسی کنویں کی گہرائی سے آتی ہوئی پکار کی طرح۔

''جو میں آج کہہ رہی ہوں اسے میں سالوں سے جانتی ہوں زلفی۔ بے شک آپ مجھ سے محبت نہ

کریں' بے شک آپ مجھے نہ اپنائیں' لیکن مجھے اور میری محبت کو تسلیم ضرور کریں۔ میں آپ ہی کے لیے جینا چاہتی ہوں ور آپ ہی کی بن کر مرنا چاہتی ہوں' مجھے کسی اور کی بننے پر مجبور مت کریں۔ میں تاعمر آپ سے محبت کرتی رہوں گی۔ ازل تا ابد۔'' میں نے کہا اور ٹھہرے ٹھہرے قدموں واپسی کا رستہ لیا۔ ٹھنڈی یخ سڑکوں پر چلتی چلتی میں واپس ریسٹ ہاؤس کے اندر آ گئی۔ مجھے خوشی تھی کہ آج سالوں بعد میں اپنی بے زبان محبت اسے سونپ آئی تھی۔ اسے کچھ بتا پائی تھی۔ اپنے گرم بستر میں سوتے وقت میں ذہنی طور پر مطمئن تھی کہ آج میں نے بارہ سال پہلے اٹھایا ہوا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔

واپسی کے سفر کے دوران زلفی مجھ سے دور دور ہی رہے۔ نہ مجھ سے بات کرتے' نہ نظریں ملتے لیکن میں اپنے اندر بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ مجھے اپنے کیے پر کوئی پریشانی یا پشیمانی نہیں تھی۔ آج نہیں تو کل' جب انوش اور میری شادی کی بات چلتی تو مجھے یہ انکشاف ان کے سامنے کرنا ہی پڑتا اور شاید تب بھی ان کا یہ رویہ ہوتا۔ کچھ اسی طرح کی ناراضگی دکھاتے۔ اسی طرح سے گریز کرتے اسی طرح انجانا پن روا رکھتے لیکن یہ ہونا تھا۔

واپس آنے کے بعد بھی ان کا یہ احتجاج جاری رہا۔ میں فون کرتی تو جواب نہ دیتے' ملنے جاتی تو بہانہ بنا دیتے۔ ابھی تک وہ مجھ سے ناراض تھے۔ پھر ان کی ناراضگی کو میں نے بھی مائنڈ کیا اور میں بھی ان کو فون کرنے سے گریز کرنے لگی۔ میرا پڑھائی میں دل بھی بہت کم لگتا۔ سرجری کے پریکٹیکلز میری سمجھ میں نہ آتے۔ مجھ پر عجب چڑچڑاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ نہ کسی دوست کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوتی اور نہ ماما یا فائزہ باجی کے ساتھ وقت گزارتی میں کتنی تنہا ہو گئی تھی ذوالفقار کی محبت میں۔

کچھ دن تو اسی حالت میں گزر گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انوش کے والد والدہ ذوالفقار کے ہمراہ ہمارے گھر آئے۔ میں تو اسے معمول کی کارروائی سمجھی تھی لیکن یہ یقیناً کوئی معمول کی کارروائی نہ تھی۔ کچھ ہی دیر میں فائزہ باجی اور عمر بھائی بھی شارق کے ہمراہ آ گئے۔ میں ان سے ملنے باہر لاؤنج میں آئی تو سبھی نے میری آمد پر تالیاں بجائیں۔ میں یقیناً حیران تھی۔

''خیر ہے۔ سب اس طرح سے کیوں میرا استقبال کر رہے ہیں۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''کیونکہ آج کا دن آپ ہی کا ہے' نٹی گرل۔''

فائزہ باجی نے مجھے پیار سے وش کیا۔ تب میرے ذہن میں آیا۔ آج تو میری سالگرہ تھی۔ چھبیس دسمبر کی تاریخ میں نے پہلی بار فراموش کی تھی۔

''مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''تو ہم کس لیے ہیں۔ چلو ونزہ کو اس کا تحفہ دے دو۔'' ماما نے کہا۔ پھر انوش چل کر میرے پاس آیا اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ انوش کی والدہ نے اسے ایک انگوٹھی پکڑائی اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے انگوٹھی

نرمی سے میری انگلی میں ڈال دی۔عمر بھائی نے یہ لمحہ کیمرے میں قید کر دیا سبھی نے ایک پھر تالیاں بجائیں۔

''منگنی مبارک ہو ونزہ۔مبارک ہو انوش۔'' شاہین آنٹی نے ہمیں کہا میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔یہ سب کیا تھا۔یہ کیا ہو رہا تھا۔کیا کوئی خواب' کوئی تصور کوئی خیال' یا پھر کوئی سازش' کوئی پلان کوئی ترتیب دی ہوئی پلاننگ۔میری نظریں ایک لمحے میں کونے میں بیٹھے ذوالفقار پر چلی گئیں جو کہ سپاٹ چہرے کے ساتھ مجھے دیکھے جا رہے تھے۔اس جلد بازی میں یقیناً انہیں کا ہاتھ تھا۔وہ ڈرتے تھے' مجھ سے' میری سچائیوں سے' میری محبت سے۔

میں نے ایک نظر انوش کو دیکھا پھر اس جگمگاتی نازک سی انگوٹھی کو' سبھی لوگ خوش تھے اس سازش میں' کیونکہ یہ سبھی کی ملی جلی پلاننگ تھی' تمام ذہنوں کی پیداوار ایک سفاک فیصلہ۔

''بھئی سرپرائز پارٹی تو ہر کوئی دیتا ہے' لیکن سرپرائز رنگ...... ہماری ہی ہوگی۔'' انوش نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی۔

''کیسا لگا تحفہ ونزہ بیٹے۔'' انکل آفتاب نے مجھے پیار سے دیکھا۔میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔گول گول بے رنگ دائرے ہر طرف اڑتے محسوس ہوئے۔وہاں مزید رکنا مجھے سوہان روح محسوس ہوا۔میں وہاں سے اٹھی اور فوراً اپنے کمرے میں آ گئی۔کمرے میں آ کر دوپٹے کو اتار کر زور سے پھینکا اور اپنے بیڈ پر ڈھے گئی۔نہ جانے کتنی دیر تک میں اپنے بستر کو بھگوتی رہی تھی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو دھوپ میرے کمرے کے کونے کونے میں اپنا آپ بکھرا چکی تھی۔رات دیر تک روتے رہنے کی وجہ سے میرا سر بھاری اور آنکھیں درد سے بوجھل بوجھل تھیں۔میں نے اٹھتے ہی اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر اپنی پیشانی کو چھوا۔مجھے احساس ہوا حرارت کا۔لیکن ٹمپریچر اور سردی کے باوجود بھی میری پیشانی ٹھنڈے پسینے کے قطروں سے بھری تھی۔اچانک میری نظر انگوٹھی پر جا ٹھہری جو کہ صرف کسی انمول دھات سے بنی ہوئی نازک سی انگوٹھی ہی نہ تھی' ایک رشتہ تھی' ایک بے وجود بے سمت کھوکھلا رشتہ۔ایک یک طرفہ رشتہ۔ایک بار پھر میرے دل دماغ پر وہی اشتعال چھا گیا جو کہ پچھلی رات چھایا تھا۔

میں اپنے بستر سے اٹھی۔باتھ روم میں گئی اور جلدی جلدی تیار ہوئی۔اپنے کمرے سے باہر آئی تو فائزہ باجی شارق کو ناشتا کروا رہی تھیں وہ شاید رات کو یہیں رک گئی تھیں۔انہیں اور ماما کو نظرانداز کر کے میں ماما کے کمرے میں گئی۔ان کے دراز سے گاڑی کی چابی نکالی اور باہر آئی۔''کہاں جا رہی ہو ونزہ بیٹے' میں صبح آئی تو تم سو رہی تھیں۔'' ماما نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔

''پلیز ماما مجھ سے کوئی سوال مت کریں آپ۔'' میں نے انتہائی جھنجھلاہٹ سے کہا۔

''لیکن بیٹا کیا ہے۔کیوں تم اتنے غصے میں ہو؟'' ماما ابھی تک انجان بنی ہوئی تھیں۔میں نے کئی بار سوچا کہ کیسی ماں ہیں وہ۔وہ اپنی بیٹی پر گزرنے والی ہر حالت سے بے خبر ہیں۔اپنی بیٹی کے ارمانوں' اس کے خوابوں' اس کے آنسوؤں سے بے خبر ہیں۔مائیں تو اپنی اولاد کی تکلیف ان کے لہجوں ان کی آنکھوں سے پڑھ لیتی ہیں۔پھر آخر میری ماما کیوں ایسی تھیں۔کیا وہ جان کر انجان بنے کا ڈرامہ کیے ہوئے ہیں یا پھر واقعی وہ انجان ہیں۔

''ماما آپ مجھ سے پلیز کچھ مت پوچھیں اور ویسے بھی آپ نے پہلے کچھ پوچھنے کی زحمت کی ہے کیا مجھ سے۔جب دل میں آیا جس سے چاہا منگنی کر دی۔اسی طرح کسی دن میری سرپرائز میریج بھی کروا دیں گی۔ماما آپ کو اپنے بچوں کی خوشیوں کی کوئی فکر نہیں۔'' میں سفاکی سے یہ کہتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی اور پیچھے ماما کی آوازوں نے دور تک تعاقب کیا۔

''ونزہ! ونزہ بات سنو میری' کہاں جا رہی ہو تم؟''

میں گاڑی میں بیٹھی اور تیزی سے ڈرائیو کرتی گاڑی میں انوش کے گھر لے آئی۔اگلے ہی پل میں شاہین آنٹی کے سامنے تھی۔

''مجھے انوش سے ملنا ہے آنٹی۔'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے۔جاؤ جا کے مل لو''

شاہین آنٹی نے ہمیشہ کی طرح پیار سے کہا۔

''نہیں آنٹی آپ اسے نیچے بھیجیں میں گاڑی میں ہوں مجھے اس کے ساتھ کہیں جانا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔یہ کہہ کر میں رکی نہیں اور چلتی ہوئی واپس اپنی گاڑی تک آ گئی۔کچھ ہی دیر میں انوش نیچے آ گیا۔مجھے دیکھ کر ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔

''خیر ہے؟ آج منگیتر صاحبہ صبح ہی صبح۔رات کو تو شرما کر بھاگ گئی تھیں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بولا۔

''گاڑی میں بیٹھو انوش' ہمیں کہیں جانا ہے۔'' میں نے لیے دیئے لہجے میں کہا۔

''کہاں جانا ہے؟'' وہ گاڑی میں بیٹھ تو گیا مگر سوال بھی کر لیا۔میں نے بنا اسے جواب دیئے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اڑنے لگی۔

''کہاں لے جا رہی ہو مجھے ظالم حسینہ بتاؤ تو؟ شادی سے پہلے ہی مار دو گی کیا؟'' وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔میں گاڑی مصروف سڑکوں پر دوڑاتی شفا نرسنگ ہوم لے آئی اور اسے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔میں تیز رفتاری سے چلتی ذوالفقار کی کلینک کے اندر آ گئی۔مجھے نہیں پتا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں یا کیا کرنے جا رہی ہوں۔مجھے پتا تھا تو صرف اتنا کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے جس کا بدلہ مجھے ہر حال میں اتارنا ہے۔اپنی محبت کے پرچم کو بلند کرنا ہے۔

مجھے اور انوش کو ایک ساتھ دیکھ کر ذوالفقار بھی پل بھر کو حیران ہوئے۔ انہوں نے اپنے مریض کو جلدی جلدی فارغ کیا اور کلینک کا اندرونی دروازہ بند کر کے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

''کیا ہوا ہے انوش' وزنہ....... بھابی کا فون آیا تھا مجھے کہ تم گھر پر بنا بتائے ہی نکلی ہو۔''

''ہاں میں بنا کسی کو بتائے ہی نکلی ہوں۔ جب آپ بنا بتائے میری قسمت کے فیصلے کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتی کچھ بنا بتائے۔ کیا آپ میری قسمت کے بنانے والے ہیں؟ کیا آپ میری تقدیر لکھنے والے ہیں؟'' میں ذوالفقار پر برس پڑی تھی۔

''کیا ہوا ہے وزنہ؟ صاف صاف بتاؤ۔'' یہ انوش تھا۔ ذوالفقار اب چپ تھے یا شاید اسی۔ ری ایکشن کی توقع کیے ہوئے تھے۔

''میں آپ دونوں کو آپ کے دیئے ہوئے تحفے لوٹانے آئی ہوں۔'' میں نے اشتعال انگیز لہجے میں یہ کہا اور انگوٹھی اتار کو انوش کے ہاتھ پر رکھی۔

''یہ لو انوش اپنا دیا ہوا تحفہ۔'' اور انوش کو بازو سے پکڑ کے ذوالفقار کی طرف دھکیلا۔ ''اور یہ آپ لیں' آپ کا دیا ہوا تحفہ۔''

وزنہ۔'' وہ تڑپے۔

''میں آپ دونوں کے دیئے ہوئے تحفوں کو ٹھکراتی ہوں۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ان کھوکھلے رشتوں کی۔ انوش تو بے خبر تھا' اسے کچھ علم نہ تھا لیکن ذوالفقار میں آپ سے پوچھتی ہوں کیا آپ کو علم نہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ کیا آپ میری چاہت سے بے خبر تھے۔'' میری آنکھیں ڈھیروں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''وزنہ! تماشا مت بناؤ۔''

''تماشا تو آپ سب نے بنایا ہے میرا۔ میں کوئی مٹی کی بنی ہوئی پتلی نہیں کہ جسے آپ اپنے من چاہے شوکیس سے سجا سنوار کر رکھ لیں۔ انوش! میں ذوالفقار سے محبت کرتی ہوں اور ان کے علاوہ اور کسی سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' میں انوش سے مخاطب تھی اور وہ پتھر کا بت بنا کبھی میری طرف تو کبھی ذوالفقار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی اور وہ ہاتھ دونوں گویا برف کی سل کی مانند جم گئے تھے۔

''اور آپ یاد رکھیں کہ اگر میں آپ کی نہیں بنی تو زندہ بھی نہیں رہوں گی۔'' انہیں یہ کہہ کے میں وہاں سے روتی ہوئی نکلی اور واپس گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آنسو پہلے سے زیادہ رفتار سے بہہ رہے تھے اور آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ مجھے پتا نہ تھا کہ میں کہاں گاڑی لے جا رہی تھی مجھے کسی سمت' کسی منزل کا ادراک نہ تھا۔ مجھے کسی پگڈنڈی کسی پڑاؤ کی خبر نہ تھی۔ میں تو اپنی محبت کی بے بسی پر نوحہ کناں تھی۔ اپنے خوابوں کی

توہین پر نالاں تھی۔ کون تھا مجھے سمجھنے والا میرا چارہ گر' میرا اپنا' بھری دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ بھی نہیں جسے میں نے اپنی زندگی سمجھ کر چاہا ہے۔ وہ مجھے اپنی زندگی کا حصہ سمجھ کر چاہنے کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ کتنی بدنصیب تھی میں۔

میں بے خیالی میں ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسپیڈ بھی کبھی ساٹھ پر پہنچ جاتی۔ اچانک ایک مصروف پل کے ختم ہونے پر میری گاڑی آگے والی گاڑی سے ٹکرانے والی تھی' میں نے بریک پر زور سے پاؤں رکھا' مگر بریک لگ نہ سکا۔ پھر جلدی سے میں نے اسٹیئرنگ وہیل موڑا۔ میری گاڑی پل کے بنے ریلنگ کے اس پار جا گری۔ میرا سر اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا اور پتا نہیں کس لمحے میں ہوش کی دنیا سے دور جانے لگی' سر میں اٹھتی درد کی ٹیسیں دھندلاتی آنکھیں اور دل کی نہاں و عمیق گہرائیوں میں جگمگاتا ذوالفقار کا چہرہ میں موجود دنیا سے بہت دور جا رہی تھی۔

☆

نہ جانے کتنے وقت سے موندی ہوئی آنکھیں میں نے کھولیں۔ میری آنکھوں کے سامنے اس وقت ماما تھیں' فائزہ باجی تھیں' اور ذوالفقار تھے۔ وہ ذوالفقار جن سے میں نے محبت کی ہے۔ بہت عجیب ہی محبت' جس کو آج تک سوائے میرے کسی نے قبول ہی نہیں کیا' جس کو سوائے میرے آج تک کوئی جان ہی نہیں پایا' جو ایک بے روح کی طرح دنیا کے کھنڈروں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔

میری آنکھیں دوبارہ بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے انہیں کھولنے کے لئے اپنی تمام تر قوت آزمائی۔ میرا دماغ بھاری تھا۔ شاید اس پر پٹی بندھی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے سر کو چھونے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ بھی بھاری تھا۔ درد کی ایک ٹیس سی اٹھی۔ دوسرے ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ایک درد کی اور ٹیس میرے دماغ کی شریانوں میں جاگی۔

''آہ۔'' میں نے ایک آہ بھری۔

''وزنہ بیٹے اٹھنے کی کوشش مت کرو۔ تم ابھی ٹھیک نہیں ہو۔'' یہ ماما تھیں جن کا چہرہ اس وقت مجھے کسی زرد پتے کی مانند لگا کچھ کچھ کملایا سا کچھ کچھ روٹھا روٹھا سا۔

''نئی زندگی مبارک ہو۔'' فائزہ باجی نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میں نے ایک نظر ذوالفقار پر ڈالی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ پچھلا منظر دوڑ گیا جس کے بعد ابھی ابھی ہوش میں آئی تھی۔ وہ دن' وہ باتیں' وہ ایکسیڈنٹ۔

''اب درد تو نہیں ہو رہا وزنہ۔'' زلفی میرے بیڈ کے قریب آئے اور میری نبض پر ہاتھ رکھا۔

''بہت میجر ایکسیڈنٹ تھا۔ ہاتھ کا فریکچر' سر پر گہری چوٹیں' جانتی ہو تمہارے بازو کی سرجری ہوئی ہے۔ جسے میں نے کیا ہے۔'' اس وقت وہ صرف ایک ڈاکٹر ہی معلوم ہو رہے تھے۔ ذمے دار سنجیدہ

ڈاکٹر۔

"آج دو دن بعد تم ہوش میں آئی ہو ونزہ!" ماما نے مجھے اطلاع دی۔ کتنے دن ماما، ذوالفقار اور فائزہ باجی نے میری تیمارداری کی۔ کتنے دن مجھے دوبارہ صحت یاب کرنے کے لئے وہ لوگ کوشش کرتے رہے۔ روزانہ زلفی گھر آتے اور میرے زخم کی ڈریسنگ چینج کرتے۔ ماما ہر طرح کا پرہیزی کھانا اور فروٹ وقت پر کھلاتیں، جس کے نتیجے میں، میں ایک مہینے کے اندر اندر ٹھیک ہوگئی اور دوبارہ کالج جانے کے لائق بھی ہوگئی۔

میں نے دوبارہ کالج جوائن کیا۔ گزری باتیں، لگتا تھا جیسے ہوئی ہی نہ تھیں۔ نہ انوش مجھ سے ملنے آیا اور نہ کسی نے اس کا ذکر میرے سامنے کیا۔ بلکہ پچھلی کسی بھی بات کا کوئی ہلکا سا تذکرہ بھی نہیں ہوا تھا میرے سامنے۔

اس دن کالج سے سرجری کا پریکٹیکل اٹینڈ کرنے کے بعد اپنی دوست ثانیہ کے ہمراہ اس کے گھر چلی گئی۔ اس کے گھر بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی تو اسی نے مجھے گھر تک ڈراپ کروایا۔ میں گھر کا گیٹ عبور کر کے لان میں آئی ہی تھی کہ لان کی کرسیوں پر ماما کے ساتھ ذوالفقار کو بیٹھے پایا۔ پتا نہیں دونوں کے درمیان کیا موضوع گفتگو تھا میرے آنے کے بعد تقریباً ختم ہی ہوگیا۔ دونوں کے چہرے بھی ایک عجب افسوس ناک سنجیدگی لیے ہوئے تھے۔

"آؤ ونزہ کیسی ہو؟ صحت کیسی ہے؟" ذوالفقار نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے بھی جواب میں مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

"اچھا بھابی مجھے کلینک پہنچنا ہے میں چلتا ہوں۔"

وہ کچھ ہی دیر بعد اٹھے ماما نے بھی ہمیشہ کی طرح انہیں روکنے کی کوشش نہ کی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ماما سے پوچھا۔

"یہ اس طرح اچانک کیسے آئے تھے۔"

ماما نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور میری طرف ایک کارڈ بڑھایا۔

"انوش کی شادی کا یہ کارڈ دینے آئے تھے۔" ماما نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"انوش کی شادی۔" مجھے حیرت ہوئی۔

"ہاں انوش اپنی کسی کلاس فیلو سائزہ سے شادی کر رہا ہے پرسوں نکاح ہے۔" ماما نے لیے دیے انداز میں کہا۔

"اچھا" میں نے بے یقینی سے کارڈ اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

"تو اور کیا۔ تم پر دنیا ختم تو نہیں ہو جاتی۔ تم نے اس کی محبت، اس کی انگوٹھی کو ٹھکرایا۔ اپنا فیصلہ سنا کر

اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ وہ بھی لڑکا ہے۔ ضد میں آ کر اس نے بھی جلد از جلد کسی سے بھی شادی کا فیصلہ سنا دیا اور ویسے بھی کوئی بھی مرد کس طرح یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی ہونے والی بیوی اس سے نہیں بلکہ اس کے سگے چچا سے محبت کرتی ہو۔ وہ تو خود زلفی بھائی سے بدظن ہوگیا ہے اور تب سے اب تک ان سے بات بھی نہیں کی۔ وہ زلفی بھائی جن کے بغیر انوش اپنے سبجیکٹ سلیکٹ نہیں کرتا تھا۔ اس نے ان سے بلکہ کسی سے بھی پوچھے بغیر شادی کا فیصلہ لے لیا۔ اتنی جلدی میں۔ اس طرح اچانک۔" ماما کے لہجے میں میرے خلاف نفرت ہی نفرت تھی۔ یقیناً انہیں ہر بات کا علم تھا۔ لیکن اتنے دنوں تک وہ مجھ سے چھپائے ہوئے تھیں۔ وہ اپنی نشست سے اٹھیں اور اندر جانے لگیں۔ میں کارڈ اٹھا کر عجیب سے محسوسات کے زیر اثر اسے دیکھنے لگی۔ ماما جاتے جاتے مڑیں۔

"اور ہاں زلفی بھائی کہہ رہے تھے کہ تم ان سے شادی کے فیصلے پر کچھ دن مزید سوچ لو۔ دل سے نہیں دماغ سے اور اگر پھر بھی تمہارا فیصلہ وہی ہے تو وہ تم سے شادی کرنے کو تیار ہیں کیونکہ انہیں تمہاری زندگی عزیز ہے۔" ماما یہ کہہ کر واپس جانے لگیں۔ شاید وہ رو رہی تھیں لیکن میری سماعتوں میں ان کے آخری جملے ہی گونجنے لگے۔

"اگر تمہارا فیصلہ وہی ہے تو وہ تم سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ یعنی واقعی ذوالفقار مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ وہ مجھے شریک زندگی بنانے کو تیار ہیں۔"

میں حیرت، خوش گمانی اور بے یقینی جیسی سوچوں میں گھری اوپر اپنے کمرے تک آئی اور لائٹ آف کیے دیر تک کچھ سوچتی رہی۔



میں کہاں تک تیری یادوں کے تعاقب میں رہوں
میں جو گم ہوں تو کبھی میرا پتا لے تو بھی
اپنے احساس کو کر میرے حوالے تو بھی

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی لیکن کوئی فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ پہلے میں ذوالفقار کا سیل فون نمبر ٹرائی کر چکی تھی جو کہ آف تھا پھر مجبوراً مجھے ان کے گھر کا نمبر ملانا پڑا کہ شام کے اس وقت وہ یقیناً گھر پر ہی ملیں گے۔ چھ گھنٹیوں کے بعد فون خود ذوالفقار نے ہی اٹھایا۔

"میں ونزہ!" میں نے مختصراً کہا۔

"کہو ونزہ! کیسی ہو؟" ان کی آواز نیند کی غنودگی سے بوجھل بوجھل تھی۔

"آپ سو رہے تھے۔ ڈسٹرب کیا میں نے۔"

"سو تو رہا تھا لیکن تم نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ آج رات انوش کی شادی ہے تو شاید سونے کا وقت نہ

ملے۔ میری طبیعت بھی کچھ بہتر نہیں اب۔ بلڈ پریشر کافی ہائی رہنے لگا ہے۔ تم چلو گی ونزہ! انوش کی شادی میں؟'' وہ اپنی بات ختم کر کے بولے۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ میں نے تو اس لیے فون کیا تھا کہ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کچھ بات کرنی تھی۔'' میرے یہ کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہے۔

''اچھا ایسا کرنا کل صبح چھٹی ہے تو گھر آ جانا۔ آرام سے بات ہو جائے گی۔'' اتنے عرصے بعد ان کے لہجے کی یہ اپنائیت دیکھ کر مجھے بہت اچھی فیلنگ ہوئی۔ ابھی میں فون بند کر کے باہر ٹیرس میں ہی گئی تھی کہ فائزہ باجی آ گئیں۔ وہ بھی مجھ سے بڑے عرصے بعد پیار سے ملی تھیں۔ وہ ٹیرس میں ہی آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئیں۔

''ملک شیک پیو گی ونزہ! پائن ایپل کا۔ عمر کل فریش پائن ایپل لائے تھے۔ ایک ڈبا میں لائی بھی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے گئیں اور ملک شیک کے دو بھرے گلاسوں کے ساتھ واپس آئیں۔

''میں آج صرف تم سے ملنے آئی ہوں ونزہ!'' وہ شیک پیتے پیتے میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں ان کے لہجے کے پس منظر کو کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔

''ونزہ! میں آج تم سے تمہارے کیے ہوئے فیصلے کے متعلق بات کرنے آئی ہوں۔ تمہیں نہ صرف ایک بڑی بہن بلکہ ایک دوست کی حیثیت سے سمجھانے آئی ہوں۔ تم جانتی ہو ونزہ! ہمارے پاپا ماما کی شادی زلفی چچا نے اپنی آنکھوں کے سامنے کروائی تھی۔ پاپا کے سگے بھائی کی طرح انتظام کیے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ پاپا کی اولاد کو ہمیشہ اپنی اولاد سمجھا۔ پاپا کے بعد ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ ہمیں اپنا سمجھ کر ہمیں اپنا مان کرا اور ونزہ! کیا تم اس طرح کی شفقت کو فقط اپنی ایک نادان ضد کی وجہ سے کھونا چاہتی ہو۔ تم ان کو ایک لمحے پاپا کی جگہ پر رکھ کر تو دیکھو۔'' فائزہ باجی کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

''کیوں رکھوں میں ان کو پاپا کی جگہ پر باجی! پاپا کی اپنی جگہ تھی اور زلفی کی اپنی جگہ ہے۔ کیا آپ پاپا اور عمر بھائی کا موازنہ کر سکتی ہیں بولیں۔'' میرا وار انہی پر تھا۔

''ونزہ! کیا عمر میں اور ذوالفقار میں کوئی فرق نہیں۔ میں انہیں لفظ چچا کے بغیر بلاؤں تو عجیب لگتا ہے۔'' ان کا لہجہ عجیب افسوس ناک تھا۔

''فائزہ باجی! عمر بھائی میں اور ذوالفقار میں کوئی فرق نہیں۔ عمر بھائی سے آپ نے محبت کی تھی۔ ان کے بغیر آپ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں اور ٹھیک اسی طرح میں نے ذوالفقار سے محبت کی ہے اور میں بھی ان کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتی۔'' میں نے ڈھیٹ لہجے میں کہا۔

''فرق ہے ونی! ہماری محبت دوطرفہ تھی۔ ہمارے دلوں کے زاویے ایک سے تھے۔ ہمارے مزاج، ہماری عمریں، ہماری ذہنی سوچ ایک تھی۔ ہم کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھے۔ نہ عمر کی زندگی میں کوئی شمیل تھا اور

نہ کوئی انبساط آنٹی ونزہ! خوابوں میں اور پریکٹیکل لائف میں بہت فاصلہ، بہت فرق ہوتا ہے۔ بتاؤ کیا تم اپنی محبت بانٹ سکتی ہو انبساط سے، شمیل سے؟'' وہی سفاک لہجہ تھا ان کا۔

''آپ بھی تو اپنی محبت بانٹتی ہیں فائزہ باجی! شارق سے، عمر بھائی کی ماں، ان کی بہنوں اور ان کے تمام خاندان کے افراد سے۔'' میں نے ضدی پن سے کہا۔

''پاگل لڑکی! وہ اور بات ہے۔ عمر کی زندگی میں کوئی عورت نہ مجھ سے قبل تھی اور نہ میرے بعد آئے گی۔''

''ٹھیک اسی طرح فائزہ باجی اسی طرح ذوالفقار کی زندگی میں اب صرف اور صرف ونزہ ہو گی اور ونزہ کے بعد کوئی بھی نہیں آئے گی۔'' میں نے کمال یقین سے کہا پل بھر کو فائزہ باجی نے میرے چہرے کی جانب غور سے دیکھا۔ کچھ نفرت سے کچھ ہمدردی سے اور کچھ کچھ پیار سے۔ شاید میرے اس جواب کے آگے ان سے کچھ بولا نہ گیا۔ انہوں نے شیک کے خالی گلاس اٹھائے اور جانے لگیں۔

''تمہاری ضد اپنی جگہ ونزہ...... لیکن میری یہ بات یاد رکھنا۔ زندگی کہانیوں، خوابوں اور حسرتوں پر مبنی نہیں ہوتی۔ ستاروں کی چھت اور پھولوں کا فرش، رنگوں کی دیواریں اور نظموں کے بستر حقیقی زندگی میں نہیں ہوتے اور ہر لڑکی کو خوابوں کے سوداگر بھی نہیں ملتے۔ پریکٹیکل زندگی میں آتے ہی زندگی کی دشواریوں اور سفاکیوں کا احساس ہوتا ہے اور جہاں تک محبت کا تعلق ہے تو ونزہ! ندیم علی...... محبت کہتے ہی اس کو ہیں جو دلوں میں رنگ بھر دے۔ اگر دونوں میں سے ایک بھی دل بے رنگ ہو تو وہ بے رنگی زندگی کو بھی بے رنگ بنا دیتی ہے۔ میں تمہیں آخری بار سمجھانے آئی تھی، لیکن تم تو شاید اپنی تمام کشتیاں جلا کے آگ کی دلدل میں گر چکی ہو۔ تم یکطرفہ محبت کی اندھی راہوں پر چل پڑی ہو۔ تمہاری ضد، تمہیں تمہارا مقصد تو دے دے گی لیکن آگے، آگے تمہاری اپنی قسمت۔'' فائزہ باجی یہ کہہ کے چلی گئیں اور ان کی باتیں رات بھر میری سماعتوں میں گونجتی رہیں۔ آج رات بھر مجھ پر ایک بے قراری سی چھائی رہی۔ آج انوش کی شادی بھی تھی۔ ایک اور جلد بازی میں کیا ہوا فیصلہ۔ میرے دل میں پل بھر کے لیے پشیمانی کی ایک لہر کوندی۔ میں نے انوش کے ساتھ غلط کیا۔ میں نے اس کا دل دکھایا، وہ بھی تو مجھ سے محبت کرتا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح مجھے زلفی سے محبت ہے، یکطرفہ لیکن اگر کیا زلفی میرے ساتھ اس طرح کرتا تو میں خوش رہ پاتی۔ کیا میری محبت اس کو معاف کر پاتی۔ شاید نہیں...... تو پھر انوش کیسے خوش رہ سکتا ہے، اس طرح اپنی یکطرفہ محبت کو دل میں دبا کے، پہلی بار میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔ صداقت آشنا، وفاؤں سے بنا، لیکن میں بھی کیا کرتی۔ میں بھی تو اسی کی طرح مجبور تھی اپنی یکطرفہ محبت کے زیر اثر۔

میں نے نماز ادا کی اور دل سے پہلی بار انوش کے لیے دعا مانگی کہ اس کا جیون ساتھی اسے اس کی محبت

بھلانے میں مددگار ثابت ہو۔ اس کے درد کا چارہ گر ٹھہرے۔

اگلی صبح میں دس بجے زلفی کے گھر تھی۔ پہلی بار اس گھر کو میں نے ''اپنے گھر'' کی نظر سے دیکھا اور پہلی بار مجھے یہ گھر بہت خوب صورت لگا۔ مجھے کام کرنے والی نے لاؤنج میں بٹھایا اور زلفی کو بلانے چلی گئی۔ اسی نے مجھے بتایا کہ رات دیر سے گھر آنے کے سبب زلفی اور شمیل دونوں سو رہے ہیں۔

تقریباً بیس منٹ کے انتظار کے بعد شمیل کے ساتھ ہی زلفی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ سفید رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس بہت کھلے کھلے، بہت نکھرے نکھرے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دیے اور شمیل ہمیشہ کی طرح دوڑ کے میرے گلے آ لگا۔

''وزنہ! ناشتا کرو گی؟'' ان کے پوچھنے پر میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''شمیل! بیٹا جا کے اماں سے بولو کہ سیب اور اورنج ساتھ میں جوس بھی لے آئے۔ ہم باہر لان میں بیٹھے ہیں۔'' شمیل فرمانبردار بچے کی طرح دوڑ کے چلا گیا اور زلفی مجھے ساتھ لے کر باہر لان میں آ گئے۔

ہم کونے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''کل انوش کی شادی تھی، اچھا فنکشن تھا۔ انوش کی دلہن بھی اچھی لڑکی ہے۔ انجینئرنگ کر چکی ہے، انوش کے ساتھ خوش بھی لگ رہی تھی...... بس، انوش کچھ بجھا بجھا سا تھا، منتشر سا، بکھرا بکھرا سا۔'' ان کے لہجے میں ایک خلا تھا اور ساتھ میں انوش کے لیے پنہاں محبت۔ میں آنکھیں جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

''انسان سوچتا کیا ہے اور ہو کیا جاتا ہے۔ انسان رشتے بنانا چاہتا ہے لیکن رشتے کبھی کبھی ٹوٹ جاتے ہیں۔'' پھر وہی اداسی تھی۔ ''کل اتنے دنوں بعد انوش نے مجھ سے مختصراً بات کی اور کہا کہ اس نے جس کو ہمیشہ اپنی دلہن کے روپ میں چاہا تھا، مانگا تھا وہ اب اس کی نہیں میری دلہن بنے گی۔ بہت خفا ہے وہ مجھ سے لیکن مجھ سے زیادہ اپنی قسمت سے ناراض ہے۔'' فروٹ اور جوس آ چکا تھا، جسے وہ کاٹتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ میں متواتر چپ ہی تھی، کہتی بھی کیا۔ موضوع گفتگو تو اب بھی میں ہی تھی۔

''مجھے امید ہے کہ تم نے اپنے فیصلے پر غور کیا ہوگا وزنہ!'' وہ جوس کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو وزنہ! میں ایک ڈاکٹر ہوں، میں نے ہمیشہ زندگی بانٹنے کی کوشش کی ہے۔ محبتیں تقسیم کرنی چاہی ہیں لیکن میں نہیں چاہوں گا کہ میں تمہیں کسی بھی صورت موت دوں، تکلیف دوں...... اس دن جب تم نے اپنی گاڑی مار کر خودکشی کی کوشش کی، اسی دن میں نے اپنا فیصلہ بدلا تھا اور تمہیں زندگی دینے کا عہد کیا لیکن یقین کرو وزنہ! تم جسے اپنی زندگی سمجھ کر اپنانا چاہتی ہو وہ زندگی نہیں اذیت ہوگی تمہارے لیے۔ میری روٹین، میرا لائف اسٹائل، میری ترجیحات، میری عمر کے مطابق ہیں جنہیں میں تمہارے خوابوں کے مطابق نہیں ڈھال سکتا، چاہنے کے باوجود بھی نہیں۔ میں عمر کے جس حصے میں ہوں

وہاں میری لیے میری اولاد، میرا فرض اور میرے ہاتھ سے زندگی پانے والے مریض ہی سب کچھ ہیں۔ اب میں چاہ کر بھی کسی سنہرے آنچل کے سائے تلے زندگی نہیں گزار سکتا اور پھر تم تو جانتی ہو کہ مجھے ابھی تک انبساط سے کتنی محبت ہے۔'' وہ مجھے باور کراتے ہوئے بولے۔

''تم اپنی تعلیم مکمل کرو وزنہ! ڈاکٹر بن جاؤ، اپنی پسند کے کسی ینگ لڑکے سے شادی کرو، اپنی زندگی انجوائے کرو۔ ایک بوڑھا، کم زور، بیمار آدمی تمہیں کیا دے سکتا ہے سوائے تنہائی کے۔ تمہارے اور میرے بیچ سالوں کا فاصلہ ہے، ایک جنریشن گیپ۔ میں ایک پرفیکٹ انسان نہیں ہوں۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے میرے جواب کے منتظر تھے۔

''مجھے پرفیکشن کی کوئی ضرورت نہیں زلفی! مجھے تو ایسی محبت کی ضرورت ہے جو تنوع پر مبنی ہو، جس میں، میں اپنی مرضی سے کچھ نہ کچھ گھٹاتی بڑھاتی رہوں۔ مجھے پرفیکشن کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے فیصلے پر اپنے پاؤں مضبوطی سے ٹکا لیے ہیں۔ اب موت ہی مجھے اس فیصلے سے ہٹا سکتی ہے۔'' میں نے تیقن آمیز لہجے میں کہا۔ وہ خاموش تھے، شاید وہ توقع کیے بیٹھے تھے کہ ان کے سمجھانے سے میں سمجھ جاؤں گی لیکن اس پتھر میں وہ ضرب لگا نہیں پائے تھے۔

میں اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ مجھے ان کے جواب کی امید نہ تھی۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور جانے لگی۔

''رکو وزنہ! اگر تمہاری یہ ضد ہے تو مجھے تمہاری یہ ضد منظور ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ تم مجھ سے کوئی توقع نہیں رکھو گی۔ تمہیں مجھے بنا کسی شرط کے اپنانا ہوگا۔ میرا گھر، میری زندگی تمہیں ویلکم کریں یا نہ کریں، تمہیں ہر چیز کو ویلکم کرنا ہوگا۔'' وہ اسی جامد سے لہجے میں بولے۔ میرے ساکت ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یقیناً یہ زلفی کی زبان سے محبت کی پہلی رضامندی تھی، پہلا اقرار، یعنی کہ واقعی اس طرح وہ مجھے اپنانے کو تیار ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا شریکِ زندگی بنانے کو تیار ہیں۔

مجھے ان کی کسی شرط کی پروا نہیں تھی کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ میری محبت انہیں بدل دے گی۔ ان کے لہجے کی کرختگی، ہر سختی کو مٹا دے گی۔ میری منزل میرے سامنے تھی اور سفر کی تمازت بھی دور ہو گئی تھی۔ وہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئے اور گھر تک کا سارا سفر میں نے فتح کے احساس کے زیرِ اثر طے کیا۔

※

میرے تھرڈ ایئر کے ایگزامز کے بعد ہمارے نکاح کی تاریخ رکھی گئی۔ ماما کی بول چال مجھ سے کافی عرصے سے بند تھی۔ وہ میرے آنے کے وقت سونے چلی جاتیں، شام کو اٹھتیں اور بنا مجھ سے بات کیے اپنے کام کاج میں مشغول رہتیں۔ گھر میں ہم دو ہی فرد تھے اور دونوں ایک دوسرے سے ناراض۔

نکاح کی تقریب زلفی کے کہنے پر سادہ ہی رکھی گئی۔ کوئی بھی شامل نہ تھا سوائے عمر بھائی، فائزہ باجی،

میری سہیلیوں اور زلفی کے چند دوستوں کے۔ کتنی بے رونق اور کتنی روکھی روکھی شادی تھی۔

ہر لڑکی کے اپنی شادی کے متعلق چند خواب ہوتے ہیں، سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ، چوڑیوں کی کھن کھناہٹ، سیج کے پھولوں کی شادابیاں، عروسی لباس کی رعنائیاں، شہنائی کا شور، بینڈ باجے کی آوازوں میں باراتیوں کا سواگت، سہاگنوں بزرگوں کی طرف سے ملنے والی دعائیں، صندل سے بھیگی مانگ کی خوشبو، ابٹن کی مہک میں نہایا روم روم لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ نہ تھا۔ ماما نے میرے لیے کوئی جہیز تیار نہ کیا۔ فقط چند جوڑے اور زیور۔ ساتھ میں شفا ہاسپٹل اور پاپا کے خریدے ہوئے پلاٹ کے کاغذات جو کہ میرے نام تھے دے دیئے۔ دے کیا دیئے، گویا منہ پہ مار دیئے۔

فائزہ باجی نے سرخ رنگ کا جوڑا جو کہ عموماً دولہا والوں کی طرف سے ہوتا ہے اور چند گفٹس دیئے باقی میری سہیلیوں کے تحفے اور دعائیں تھیں۔

نکاح ہو گیا اور میں چند ہی لمحوں میں ذوالفقار سے منسوب ہو گئی۔ میری تیرہ سالوں پر محیط محبت فقط چند منٹ میں منزل پا گئی۔ تقدیر کا یہ فیصلہ کتنا اچھا تھا۔

نکاح اور رخصتی کے وقت بھی ماما میرے پاس نہ آئیں۔ فائزہ باجی مجھے گاڑی تک لائیں جسے ذوالفقار خود ہی ڈرائیو کر کے اپنے گھر لے آئے۔ ہمارے ساتھ شمیل بھی تھا جو کہ اصلی صورت حال سے بے خبر ہمیشہ کی طرح اپنے پاپا سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد ذوالفقار اور شمیل تیزی سے گھر کے اندر چلے گئے اور میں اپنے سرخ عروسی لباس اور ہزاروں حسرتیں تھامے کتنی دیر باہر کھڑی رہی۔

میرے جیون ساتھی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے گھر کی دہلیز پھلانگنے میں بھی مدد نہ کی تھی۔

کسی ماں، کسی بہن نے میرا سواگت پھولوں اور پیار بھرے بوسوں سے نہ کیا تھا۔ کسی بھابی نے کوئی کھن کھناتا جملہ میری سماعتوں کے سپرد نہ کیا تھا لیکن شاید اس سب کی توقع مجھے پہلے ہی کر لینی چاہیے تھی اور بقول زلفی کے مجھے اس سے کوئی بھی شرط نہیں رکھنی ہے۔ کوئی سوال نہیں، کوئی خواہش نہیں، کوئی امید، کوئی توقع نہیں لیکن، بہت جلد ذوالفقار خود ہی مجھے اپنا لیں گے۔ ہاں بہت جلد، یہ ارادہ مضبوط کر کے میں خود ہی گھر کے اندر اور پھر لاؤنج پھلانگ کر زلفی کے کمرے میں آئی جس کے بستر پر خلاف توقع گلاب کی پتیاں بچھی تھیں۔ مجھے ایک اچھی سی، نٹ کھٹ سی، خوش گوار سی فیلنگ بھی ہوئی کہ زلفی نے اپنی سہاگ رات کی کچھ تو تیاری کی ہے لیکن اگلے ہی پل میری یہ فیلنگ غلط ثابت ہوئی کہ جب وہ باتھ روم سے اپنا سلیپنگ سوٹ پہن کے آئے۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے جسے صبح فائزہ زبردستی سجانے آئی تھی۔ شمیل کو اکیلے سونے کی عادت نہیں، میں اس کے کمرے میں سوؤں گا۔ تم اے سی آن کر کے آرام سے سو جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے اور میں اس خوب صورت، پرآسائش کمرے کے سجے سجائے بستر پہ اپنی شادی کی پہلی رات ہی تنہائی اوڑھ کے سو گئی۔

مجھے اس کمرے کے فیروزی پھولوں والے پردے خوب صورت پینٹنگ اور ہر چیز خود پر ہنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ اپنے لیے تو میں نے فتح کا ایک جھنڈا گاڑا تھا لیکن خود کو تنہائیاں سی سونپ دی تھیں۔

اگلی صبح مجھے جاگنے میں کافی دیر ہو گئی۔ کیوں کہ رات کو دیر تک روتے روتے اور اپنے مقدر کی سفاکیوں پر سوچتے سوچتے سوئی تھی۔ میں نے پہلے دیر تک شاور لیا اور پھر ایک سادہ سا کاٹن سوٹ نکالا اور اسے پہن لیا۔ چوڑیاں اور زیور ایک دن کی دلہن ہونے کے ناتے پہنے رکھیں۔ میں باہر آئی تو کام والی کو کچن میں کام کرتے ہوئے پایا۔

''سلام علیکم دلہن بی بی! شادی مبارک ہو جی۔'' وہ مسکرا کے بولی، اس سے میری تھوڑی بہت پہچان تو تھی لیکن تفصیلی گفتگو کبھی نہ ہوئی تھی۔

''خیر مبارک۔ تمہارا نام کیا ہے؟'' وہ تقریباً فائزہ باجی کی عمر کی تھی، سانولی رنگت، اونچا قد، کمزور سا لاغر جسم۔

''میرا نام جی چھپا ہے۔ اماں نے تو کوئی اور نام رکھا تھا لیکن سبھی چھپا چھپا بلاتے ہیں۔'' اسے شاید تفصیلی اور غیر ضروری گفتگو کرنے کی عادت تھی۔

''دلہن بی بی! ناشتا کر لو۔ صاحب کہہ گئے تھے کہ بی بی جی کو ناشتا کروا لینا۔''

''تمہارے صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے شمیل کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو پوچھا۔

''صاحب تو صبح ساڑھے نو بجے ہاسپٹل کے لیے نکل چکا ہے اور شمیل بابا اسکول کے لیے۔ اب تو صاحب لنچ ٹائم پر ہی آئے گا۔'' وہ گرما گرم پراٹھا توے سے اتار کر بولی۔

میں ڈائننگ ٹیبل تک آ گئی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ذوالفقار کم از کم دو دن تو چھٹی کر سکتے تھے زیادہ نہیں تو دو دن ہی مجھے وقت دے دیتے۔ پہلے تو وہ مجھے اس طرح نظر انداز نہیں کرتے تھے پھر اب کیوں؟

''تم یہاں کب سے کام کرتی ہو چھپا!'' میں نے ناشتا کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''بی بی جی! مجھے تو چھ مہینے ہی ہوئے ہیں یہاں لیکن اس سے پہلے میری اماں یہاں کام کرتی تھی۔ اب اماں کو فالج ہو گیا ہے، اس کے خرچے پانی نکالنے کے لیے میں یہاں کام کرتی ہوں۔ بھائی تو کوئی ہے نہیں جی، دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں جی، میرا بھی ایک بچہ ہے پھر جی شوہر نے دوسری شادی کر لی اور میں اماں کے گھر آ گئی۔'' وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوئی اپنی داستان سنانے لگی لیکن میں بظاہر تو ہوں ہاں کر رہی تھی لیکن میرا ذہن سارا زلفی پہ تھا۔ میں نے ناشتا ختم کیا اور پھر کارڈلیس فون اٹھا کے واپس کمرے میں آئی۔ ذوالفقار کے سیل فون کے نمبرز پش کر چکی تھی۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف وہی بے حس انسان تھا' جسے میں اپنا آپ دے چکی تھی۔

''آپ مجھے بنا بتائے ہی چلے گئے اور آج کے دن جانا کیا ضروری تھا۔ کتنا اکیلا محسوس کر رہی ہوں میں!'' میں نے بیوی کا حق جتاتے ہوئے شکایت کی۔

''یہ بات شاید تمہیں پہلے سے ہی پتہ ہے کہ میں ساڑھے نو بجے گھر سے نکل جاتا ہوں اور اپنے مریض بے وجہ چھوڑنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ اسی کرختگی سے بولے۔

''کل ہی تو ہماری شادی ہوئی ہے اور آج ہی آپ چلے گئے۔'' میں روہانسی ہوئی۔

''ان فضول باتوں کو چھوڑو اور تم بھی اپنے کالج چلی جاؤ اور ہاں آج میں لنچ پہ نہیں آؤں گا۔ شمیل کو اسکول سے لے کر میں انوش کے گھر جاؤں گا' رات کو انوش اپنی بیوی کے ساتھ لندن جا رہا ہے' اسے ایئر پورٹ چھوڑ کر پھر رات کو ہی گھر آؤں گا۔'' انہوں نے ایک نیا دھماکہ کیا۔

''میں بھی ساتھ آؤں۔'' میں نے ایک آخری کوشش کی۔

''نہیں۔ اپنی محبت کو اپنی ہی چچی کے روپ میں نہیں دیکھ پائے گا وہ بیچارہ۔'' بہت نفرت آمیز لہجہ تھا ان کا اور میں اس سے آگے کچھ کہہ نہ پائی۔ آواز گویا گلے میں رندھ گئی' فون ڈسکنیکٹ ہو چکا تھا۔

زندگی ان دنوں کتنی عجیب سی ہو گئی تھی۔ محسوس تو یہ ہوتا تھا کہ جیسے میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ پہلے ہی کی طرح روزانہ صبح کالج جانا' واپس آنا اور پہلے ہی کی طرح اکیلے زندگی گزارنا مگر نہیں' فرق تھا...... کہیں نہ کہیں' میں نے سوچا تھا کہ ذوالفقار کو اپنا جیون ساتھی بنا کر میں اسے جکڑ لوں گی۔ اپنی محبت کے حصار میں قید کر لوں گی لیکن کتنی غلط تھی میں۔ میں تو خود ہی اپنی انا کے حصار میں قید ہو کے رہ گئی تھی اور وہ نشیمن جسے میں نے تنکا تنکا جوڑنا چاہا تھا اس کا تو تنکا تنکا بکھر رہا تھا۔ اکثر میں اپنی زندگی کی انتہا سوچتی۔ کرختگی تو شاید میرے مقدر میں تھی اور کرختگی کی یہ حد' شاید میرے مقدر کی انتہا۔

میرا زادِ راہ ہی مجھ سے چھن گیا تھا۔ کیا ملا مجھے زلفی کو اپنا کے۔ دنیا کے الزام' صعوبتیں' زلفی کی بے رخی اس کی سفاکی' اس کا انجان رویہ' ماما کے دل سے نکلتی نفرت' فائزہ باجی کی آنکھوں میں چھپی ناراضگی اور تو اور شمیل بھی مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔ آج جب وہ صبح ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کر رہا تھا تو میں اس کے پاس گئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر کیسے ناگوار احساس ابھرے تھے۔

''مجھ سے ناراض ہو شمیل!'' میں نے ہمیشہ کی طرح اسے پیار سے مخاطب کیا۔ وہ چپ رہا۔ ''میں جب سے تمہارے گھر آئی ہوں تم مجھ سے بولے ہی نہیں۔ پہلے تو تم مجھے جانے ہی نہیں دیتے تھے یہاں سے۔ اب کیا ہو گیا ہے؟''

وہی چپ......

''دیکھو شمیل! اب میں نہ صرف تمہاری دوست ہوں' تمہاری ماما بھی ہوں۔ تم چاہو تو مجھے بلا لو' ماما'

ممی' ماں یا پھر امی۔ ہاں مگر اماں مت کہنا۔'' میں نے اس کے گال کو چھوا تو اس نے نفرت سے میرے ہاتھ کو جھٹکا۔

''نہیں ہیں آپ میری ممی! میری ممی کو اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا ہے اور آپ مجھ سے میرے پاپا کو چھیننے آئی ہیں۔'' وہ چلایا۔

''نہیں بیٹا! میں آپ سے آپ کے پاپا کو چھیننے نہیں آئی ہوں۔ میں تو آپ کی فیملی کا ایک حصہ بننے آئی ہوں۔'' میں نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ فوراً اٹھا اپنی کتابوں والا بستہ اٹھایا۔

''نہیں' آپ جھوٹ بولتی ہیں' جب سے آپ آئی ہیں میرے پاپا رات کو دیر تک گھر سے باہر رہتے ہیں' صبح جلدی نکل جاتے ہیں۔ مجھ سے پہلے جیسا پیار بھی نہیں کرتے اور نہ ہی مجھے باہر لے جاتے ہیں۔ آپ نے ان کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔ آئی ہیٹ یو' نفرت ہے مجھے آپ سے۔'' یہ کہہ کے وہ چلا گیا اور میں سوچتی رہی کہ اس نو سالہ بچے کے ذہن میں بھی میرے لیے اس قدر نفرت ہے' اتنا زہر' اتنی حقارت ہے' اس چھوٹے سے بچے کے لیے بھی میں قابل احترام نہیں ہوں۔ احترام' عزت' ہاں شاید ہر رشتے کی بنیاد یہی ہوتی ہے۔ محبت کی حیثیت بھی ثانوی ہی ہے' عزت اگر نہ ہو تو اور پھر اس شخص کے دل میں میری کتنی عزت ہے جس کی بن کے میں اسی کے گھر کے سائبان تلے زندہ ہوں۔ اسی کے نام سے پہچانی جاتی ہوں۔ اب تو میں' میں خود اپنی نظروں میں بھی بہت چھوٹی ہو گئی تھی۔

آج میں نے کالج کے بعد ماما کے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا' روٹھی ماں کو منانے کا فیصلہ کیا تھا' مجھے یقین تھا کہ وہ مان جائیں گی کیوں کہ وہ ماں ہیں' باپ نہیں کہ جس کا دل ٹھوس و جامد ہو۔

میں گھر پہنچی تو گھر مجھے بہت ویران لگا۔ بے رنگ' بے رونق' کسی صحرا کی طرح۔ میں سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آئی تو لاؤنج کے صوفے پر ماما کو نیم دراز پایا۔ ان کی آنکھیں چھت پہ ٹکی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ وہ بھی مجھے بہت ویران سی لگیں۔ بے رنگ' بے رونق سی۔ صحرا میں لگے کسی اکیلے پودے کی طرح۔

میں اپنی ذات سے کسی کو فائدہ' کسی کو آرام نہیں دے پائی شاید اسی لیے میرے اردگرد کی دنیا صحرا بن گئی اور اس دنیا کے باشندے بھی صحرا ہی کی طرح ویران بن گئے۔

''ماما......'' میں نے ان کے بہت قریب پہنچ کر انہیں آواز دی۔ وہ میری آواز پہ چونک پڑیں' ان کی آنکھیں نم تھیں۔ شاید وہ بہت روئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھرے۔ کچھ محبت کے' کچھ خفگی کے' کچھ ممتا کے' تو کچھ ناراضگی کے۔ وہ پیار اور ناراضگی کا عجب امتزاج سا لگیں۔

''ماما! میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔ مجھے آپ کی بہت یاد آئی۔'' میں ان کے پاس ہی صوفے پر

بیٹھ گئی۔ انہوں نے اپنا منہ موڑ لیا۔ شاید یہ ناراضگی کا اظہار تھا' وہ کچھ نہ بولیں۔

''ماما! کیا میں نے کوئی ایسا گناہ کر لیا ہے جو کہ قابل معافی نہ ہو۔ ماما! کیا والدین اتنے سخت دل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کی غلطیوں کو معاف نہ کر سکیں۔'' میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''کیا وہ اولاد سخت دل نہیں ہوتی جو اپنے والدین کی خوشی اور عزت کی پروا کیے بغیر ہی اپنے فیصلے کر لیتی ہو۔ چاہے وہ فیصلے ان کے حق میں غلط ہی کیوں نہ ہوں۔'' ماما کا لہجہ بھی ان کی آنکھوں ہی کی طرح بھیگا بھیگا تھا۔

''ماما! آپ مجھے معاف کر دیں ماما! میرے گناہوں کی سزا مجھے اس طرح سے نہ دیں' ماما! مجھے اس طرح تنہا نہ کریں۔ یہ مت بھولیں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ جسے آپ نے اپنے خون سے سینچا ہے۔'' میں ماما کے کندھے سے لگ کے رو پڑی۔ وہ کندھا جو ہمیشہ میرے ہر درد کا درماں بنا ہے۔

''یہی تو بھلا نہیں سکتی میں کہ تم وہی جو جسے میں نے اپنی کوکھ' اپنے خون' اپنے جسم کے اندر پالا ہے۔ اپنی سانسوں سے جسے زندگی دی ہے اور دنیا میں لانے کے بعد قدم قدم پر جس کو ممتا دی ہے اور وہی بیٹی' اسی بیٹی نے اپنے باپ کے ناموس کا کوئی خیال نہ کیا۔'' یقیناً ماما بھی رو رہی تھیں لیکن انہوں نے میرے رونے کو یکسر نظر انداز کیا۔

''یہاں اس طرح رو کر اپنا وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ۔ واپس اس جگہ جس کو تم اپنا گھر سمجھتی ہو گی اور جو کہ تمہارا گھر کبھی بن ہی نہیں سکتا۔'' وہ کھڑی ہو گئیں اور سفاک لہجے میں بولیں۔

''ماما! اتنی ظالم تو نہیں بنیں ماما! میں وہی وزنہ ہوں ماما! آپ کی وزنہ! بابا کی وزنہ! وزنہ ندیم' ماما میرا گھر یہ بھی تو ہے یا پھر کیا اس گھر نے بھی مجھے پرایا کر دیا ہے۔ مجھے دھتکار دیا ہے۔'' میں سسک رہی تھی۔

''اس گھر نے نہیں تم نے اس گھر کو دھتکارا ہے۔ اب نہ یہ گھر تمہارا ہے اور نہ تم پہلے والی وزنہ! اب تم وزنہ ذوالفقار بن چکی ہو۔ تم نے ہر رشتے کے تقدس کو پامال کیا ہے۔ تم نے مجھ سے میرا بھائی' میرا دیور' میرے شوہر کا بہترین دوست چھینا ہے وزنہ! تم نے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے مردہ باپ کی روح کو بھی دکھ پہنچایا ہے۔ اکثر خواب میں وہ مجھے روتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کیا یہ چلن سکھایا تھا تمہیں' تمہارے والدین نے ہماری پرورش نے۔'' ماما کے لہجے کی سفاکی ان کے آنسوؤں پر حاوی تھی۔

''چلی جاؤ یہاں سے وزنہ! چلی جاؤ اور پھر کبھی آ کے اپنی مجبور' بے بس اور اکیلی ماں کا امتحان مت لینا۔ چلی جاؤ یہاں سے۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں گئیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا اور میں کتنی دیر روتے رہنے کے بعد وہاں سے نکل آئی۔

مجھ سے گاڑی چلائی نہ جا رہی تھی۔ ذہن شل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے کئی بے رنگ سے دائرے گھوم رہے تھے۔ میں نے گھر جا کر گاڑی روک دی اور اسٹیئرنگ وہیل کے اوپر اپنا سر رکھ کے دیر تک

روتی رہی۔ اسی وقت زلفی گھر آئے تھے۔

ہاں میں نے ذوالفقار سے محبت کر کے غلطی کی۔ ہاں میں اس کے قابل نہ تھی۔ ہاں میں نے اس سے محبت کی جرأت کر کے بہت بڑا گناہ کر لیا لیکن میں آج بھی اس سے محبت کرتی ہوں اور شاید ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ میں اس کی محبت میں جان بھی دے سکتی ہوں۔ میں اس کی محبت میں تنہا ہو چکی ہوں۔ اکیلی بالکل اکیلی۔

''وزنہ! بچوں کی طرح مت بی ہیو کیا کرو۔ اپنے کلینک سے واپس گھر آیا تو تمہیں موجود نہ پایا۔ فرحانہ بھابی کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ تم ان سے ملنے گئی تھیں۔''

وہ مجھے پکڑ کر اندر گھر میں لائے۔

''تم سمجھتی ہو کہ کسی کو تمہاری فکر' تمہاری پریشانی نہیں اور چونکہ تم کسی کی ذمے داری نہیں تو تمہاری بھی کسی کی طرف کوئی ذمے داری نہیں' ہے ناں۔'' وہ غصے میں تھے۔ میں نے بھی انہی کے سے لہجے میں کہا۔

''ذمے داری اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' وہ تمسخرانہ پن سے ہنسے اور میری بات کا جواب سوچنے لگے۔

''نہیں کر سکتا میں خود کو مجبور تم سے محبت کرنے کے لیے' جس طرح خود کو تم سے شادی کرنے پر مجبور کیا۔ نہیں کر سکتا دوبارہ اسے مجبور۔ تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ دنیا بھر کے لوگ صرف تمہارے ہی اشارے پر چلیں۔ جو تم چاہو جو تم کہو وہ ہو جائے۔ کیوں تم کائنات کو اپنی بوتل کا جن بنانا چاہتی ہو کیوں تم ہر انسان کو حکم میرے آقا کہہ کر اپنے سامنے جھکانا چاہتی ہو۔''

''نہیں چاہتی میں کسی سے بھی کچھ' نہ ماما سے نہ آپ سے اور نہ اپنی قسمت سے۔ جو کچھ بھی مجھے ملا ہے وہی بہت ہے۔ یہ احسان ہی سب کا بہت ہے مجھ پر۔ مجھے کسی اور احسان کی طلب نہیں اور اگر آپ کو مجھ سے محبت نہیں تو چھوڑ دیں ناں مجھے میرے حال پر۔ کیوں بار بار مجھے واپس اسی محرومی کی دنیا میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ تلاش کرنے دیں ناں مجھے میرا وجود۔ جینے دیں ناں مجھے میرے حال پر۔'' میں چیخ چیخ کے کہہ رہی تھی۔ میرے اندر کا لاوا پھٹنے کو مچل رہا تھا۔ آنسو متواتر بہہ رہے تھے۔

''میرا کوئی واسطہ نہیں اس دنیا سے جس سے محبت کی وہی میری محبت کو سمجھ نہ پایا۔ اس کے گھر کو اپنا گھر بنایا تو سبھی اپنے روٹھ گئے اور اس گھر نے بھی مجھے دھتکار دیا۔ جب اس بھری دنیا' تمام لوگوں سے میرا واسطہ ہی نہیں تو جانے دیں مجھے کسی اور دنیا میں۔''

اور پھر پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا۔ دماغ کی شریانیں گویا پھٹنے لگیں۔ ذہن بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ اپنا وزن مجھے گھٹتا ہوا محسوس ہوا اور پل میں ہی اس موجودہ دنیا سے جیسے لاتعلق ہو گئی۔

⁂

''نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے اور ایسی سچویشن میں مریض کی جان جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ اب آپ کو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ کوئی بات' کوئی کام' کوئی بھی چیز ایسی نہ ہو جس سے مریضہ دل برداشتہ ہو۔ ان کی خوراک' نیند' سکون اور سب سے بڑھ کر ان کی ذہنی حالت کا خیال رکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ذوالفقار! آپ خود ایک ڈاکٹر ہیں لیکن آپ چند دنوں کے لیے سرجن سے سائیکاٹرسٹ بن جائیں اور اپنی وائف کا بہتر سے بہتر طور پر خیال رکھیں۔'' ادھیڑ عمر ڈاکٹر زلفی سے باتوں میں مصروف تھا اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں سب سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر پھر میرے بیڈ کی طرف آیا۔ میرے ہاتھ میں لگی ڈرپ کی رفتار کچھ کم کی اور میری رگوں میں جاتے ہوئے اس کے قطروں نے میری رگوں میں ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

میں نے آنکھیں کھول کے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ میں غالباً کسی اسپتال کے آئی سی یو میں تھی۔ نیورو الٹراساؤنڈ کی مشین میرے دماغ سے جڑی اسکرین پر لکیریں بنائے جا رہی تھی۔

''ہاں تو مسز ذوالفقار! اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟'' ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا۔ اس نے میرا بی پی اور ہارٹ بیٹ چیک کی۔ ''آپ بھی تو ڈاکٹر ہیں اور آپ ہی کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ دیکھیں زندگی اونچ نیچ پر ہی مبنی ہوتی ہے اور پھر زندگی کو فیس کرنا ہی بہادر لوگوں کا کام ہے۔'' ڈاکٹر نے گویا نصیحت کی۔ وہ پھر زلفی سے گویا ہوا۔

''ڈاکٹر ذوالفقار! ونزہ کی حالت اب بہت حد تک نارمل ہے۔ اگر آپ چاہیں تو انہیں گھر لے جا سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ کم از کم انہیں ایک دن یہاں پرائیویٹ روم میں شفٹ کروا لیں اور کل صبح لے جائیں۔''

''جیسا بہتر ہو ڈاکٹر!'' وہ ادب سے بولے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ میرے بستر کے قریب آئے۔ میں اسی طرح نیم وا آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی وہ کرسی پر بیٹھے اور میری جانب بہت پیار سے دیکھنے لگے۔ کچھ ایسا پیار جو ان کی آنکھوں میں میرے لیے پہلے کبھی نہ تھا۔ انہوں نے میرے چہرے کے آگے آئی ہوئی لٹ کو اپنی انگلی سے ہٹایا اور نہایت ہی پیار سے بولے۔

''ویلکم بیک ٹو لائف' مسز ذوالفقار احمد!''

شاید اگر یہ بات وہ آج اس لمحے سے قبل کبھی بھی کہتے تو میں خوشی سے جھوم اٹھتی۔ اپنے دل کی دنیا میں خوابوں کے ہزاروں دیئے جلا دیتی لیکن آج مجھے ان کی یہ بات اور یہ لہجہ دونوں بہت انجانے لگے۔ بہت نا آشنا سے۔

کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جس چیز کی خواہش میں ہزاروں اذیتیں' ہزاروں صعوبتیں'

ہزاروں ریاضتیں جھیل آتے ہیں وہی چیز ہم تک آتے آتے بہت معمولی ہو جاتی ہے یا پھر اس کو پانے کی تگ و دو میں جھیلے ہوئے غم اس کی حیثیت کو کم کر دیتے ہیں۔

''کل صبح ہی انشاء اللہ ہم گھر چلیں گے' اپنے گھر' تمہارا گھر ونزہ! بس اب تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلے تھیں۔ اسی طرح ہنسو' اسی طرح کھلکھلاؤ اور ہاں زندگی کی تلخیوں کو فراموش کر دو۔ اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔'' انہوں نے میرے ساکت ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے کہا۔

میں خاموش ہی تھی۔

⁂

اگلے دن گھر آئے تو گھر پر سبھی کو پایا۔ ماما' فائزہ باجی' عمر بھائی' انوش اور اس کی بیوی بھی۔ سبھی مجھے ویلکم کر رہے تھے۔ سبھی کے چہروں پر میرے لیے محبت تھی لیکن وہ محبت میرے لیے کتنی انجان تھی۔ ماما میرے قریب آئیں اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

''مجھے معاف کر دو میری بچی! میں تجھے سمجھ ہی نہ پائی۔'' وہ مجھے سینے سے لگا کے آنسو بہا رہی تھیں اور میں..... مجھے اپنی حالت کی سمجھ ہی نہ آ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ یہ سبھی چہرے' سبھی باتیں' سبھی محبت کے سائے' سب دھوکا ہیں۔

ان سبھی لوگوں نے اپنے چہروں پر ماسک چڑھا رکھے ہیں۔

مجھے ان سبھی پر غصہ آنے لگا اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے آپ پر کہ میں چاہ کر بھی ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کر پا رہی تھی۔ کتنی مجبور' کتنی بے بس تھی میں۔

میرے دل میں پتا نہیں یہ احساس کیوں تھا کہ میری زندگی میں کہیں کچھ کھوٹ' کچھ کمی' کچھ ادھورا پن ضرور ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں بہت اکیلا پن محسوس کر رہی تھی۔ کچھ ایسا کہ جس جگہ میں لیٹی ہوئی ہوں وہ گھر کا کوئی آرام دہ کمرہ نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی' تاریک سی قبر ہے۔ جہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں۔ نہ کوئی اپنا نہ کوئی دوست۔

میں گھبرا کے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ واش بیسن کا پانی تواتر سے بہہ رہا تھا اور میں وضو کرنے کی نیت سے اس پر جھکی۔ میں نے پہلے اپنے ہاتھ تین مرتبہ دھوئے۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے ہاتھوں سے میرے گناہوں کی دنیا بھر کی برائیوں کی گرد دھل کے صاف ہو گئی ہے اور پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ گئی ہے۔ پھر تین بار کلی کرنے اور ناک کا مسح کرنے کے بعد میں نے اپنا چہرہ دھویا۔ یوں لگا کہ جیسے میں نے اپنا چہرہ کسی عام پانی سے نہیں بلکہ آب زم زم سے دھو لیا ہو۔ میری آنکھوں' کانوں اور دماغ پر چھائے غفلت کے پردے اس پانی کی طاقت سے پٹ چکے تھے۔ ختم ہو چکے تھے۔

اپنے بازو دھونے مسح کے بعد میں نے پاؤں دھوئے اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے اپنے پاؤں سے گناہوں کی زنجیروں کو توڑ دیا ہو۔

وضو مکمل کرنے کے بعد میں باہر آئی اور دوپٹہ باندھ کے جائے نماز بچھائی۔ یہ میرا میرے حقیقی معبود سے' میرے اپنے بہت اپنے اللہ تعالیٰ سے پہلا رابطہ تھا۔ اس سے پہلے مجھے ٹھیک سے یاد نہ تھا کہ میں نے کب نماز پڑھی تھی یا پھر میں نے کب اپنے رب کو یاد کیا تھا۔

ہم انسان اگر کسی جاننے والے یا دوست کے احسان تلے آئیں تو ہم تاعمر اسے نہیں فراموش کر پاتے لیکن وہ ذات جو پیدائش سے بھی قبل ہماری ذات پر احسانات ومہربانیوں کا حصار قائم کر لیتا ہے ہم اس ذات کو اپنی زندگی میں فراموش کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی دوست ہمیں ایک دن کا بھی کھانا کھلا دے تو ہم جب تک بدلے میں اسے کھانا نہ کھلائیں ہم چین نہیں پاتے لیکن وہ رزاق جو کہ ہر روز تین بار ہمارے رزق کا بندوبست کرتا ہے' اسے ہم تک پہنچاتا ہے۔ کیا ہم نے کبھی اس کا احسان ماننے کی کوشش کی ہے؟ ہم انسان جو کہ زندگی کی الجھنوں' پریشانیوں سے گھبرا کے اپنی قسمت کو دوشی ٹھہراتے ہیں' کیا ہم نے کبھی اپنے گناہوں کی تلافی کی ہے لیکن وہ مالک ہر بار ہمیں تلافی کا موقع دیتا ہے' ہمیں زندگی کی دشوار گزار راہوں میں اپنی طرف رجوع کرنے کا موقع ضرور دیتا ہے۔

میرا کیا ہوا ایک ایک سجدہ' مجھے میرے معبود کے اور بھی قریب کر رہا تھا۔ میں اپنی روح سے اس ذات کو اپنے قریب محسوس کر رہی تھی۔

نماز کے بعد میں اسی کی ثناء میں تسبیح پڑھنے لگی۔ میں وزنہ ندیم علی جسے کبھی سروکار ہی نہ تھا رب العالمین کے کسی اسم سے' جسے کوئی تعلق نہ لگتا تھا تسبیح کے موتیوں سے' وہی اللہ نور السمٰوٰت والارض کا ورد کر رہی تھی۔

اور یہ ورد جیسے مجھے کائنات کی تخلیق کے ہر راز' ہر کشف سے آشنا کر رہا تھا' پل بھر کو یوں لگا کہ جیسے میری جائے نماز وہاں پر موجود نہیں جہاں پر ہے بلکہ ہوا میں معلق ہے اور میں تسبیح کے دانوں پر اللہ ہی زمین وآسمان کا نور ہے کے ورد کے ہمراہ خلاؤں میں سفر کر رہی ہوں۔

تسبیح ختم ہونے پر میں نے انتہائی محبت کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور صدقِ دل سے دعا کی لیکن دعا سے قبل میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں دیر تک روتی رہی' روتی رہی۔ میں اس رب تعالیٰ سے مانگتی بھی کیا کہ اس نے تو آج تک مجھے سب کچھ بنا مانگے ہی عطا کر دیا۔ میری ذات گناہوں کے بوجھ تلے دبی ہے لیکن اس مالک نے پھر بھی مجھے سزا نہ دی۔ میری ذات کو نیست ونابود نہیں کیا بلکہ مجھے سنبھلنے کا موقع عطا کیا۔ میری انگلی تھام کر مجھے بقا کا راستہ دکھایا۔ اپنی محبت کا راستہ دکھایا۔

میں اسی طرح جائے نماز پر بیٹھی اپنی ہتھیلیوں کو اپنے آنسوؤں سے بھگو رہی تھی کہ میرے شانے پر

کسی نے اپنا ہاتھ رکھا۔ میں نے دیکھا تو وہ ذوالفقار تھے۔

''کیا ہوا' کیوں رو رہی ہو؟'' ان کے لہجے میں اپنائیت تھی جو کہ کسی بھی زاویئے سے ڈرامہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

''اپنی بے بسی پر رو رہی ہوں کہ میرا معبود میرے کتنے قریب رہا اور میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کرنے میں اتنے سال لگا دیئے۔''

''چلو اٹھو' روؤ مت' انسان چاہے کتنا ہی خود غرض کیوں نہ بنے وہ خالق کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ چاہے جو ہو جائے۔ وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر ہی پیار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور بخشتا ہے اور انسان لیتا ہے اور بھول جاتا ہے۔ چلو اٹھو' سو جاؤ اب۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔'' انہوں نے مجھے اٹھا کے بستر پر لٹا دیا اور خود بستر کے دوسرے کونے پر آ کے لیٹ گئے۔

''آپ یہاں سوئیں گے۔'' بے اختیار ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

''ہاں کیوں کوئی پرابلم ہے؟'' وہ بہت ہلکے پھلکے لہجے میں بولے جیسے کہ وہ پہلے بھی اسی طرح کرتے رہے ہوں۔

''شمیل اکیلا نہیں ہوگا کیا آج'' میں نے طنز ہی کیا تھا۔

''اسے سلا کے آیا ہوں اور ویسے بھی اب وہ بڑا ہو گیا ہے تو اسے اکیلے سونا چاہیے اور پھر کیا میں اپنی اچھی سی دوست اور پیاری سی بیوی کو تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔'' انہوں نے میرا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے گال کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں موند لیں۔ ان کا یہ رویہ' بہت حد تک میرے لیے خوشگوار بھی تھا اور عجیب بھی۔ میں نے بھی اطمینان سے آنکھیں بند کیں اور اچھے دنوں کی امید میں نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆

آج موسم صبح سے ہی بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ چھم چھم بوندوں نے ہر طرف ایک اچھی سی تبدیلی کر دی تھی۔ چڑیاں' فاختائیں' رنگ برنگے طوطے اڑتے پھر رہے تھے۔ میرے باغ میں ہدہد کی ایک جوڑی بہت مزے سے گھاس پر بیٹھی تھی اور میں اس کو دیکھے جا رہی تھی۔ بائیں باغ کا یہ کونا مجھے بے حد پسند تھا۔

چمپا پکوڑے اور چائے لے آئی اور میں نے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

''دلہن بی بی جی! آپ کو پتا ہے آپ جب اسپتال میں تھیں ناں تو صاحب روزانہ آپ کا فوٹو چپکے چپکے دیکھتا تھا۔'' اس کے منہ میں پکوڑے کے جاتے ہی میرے لیے محبت ٹپکنے لگی۔

''میری فوٹو۔'' مجھے یقیناً حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں بی بی جی! اور اس دن آپ نے وہ جو ڈرائنگ روم اپنی مرضی سے سیٹ کیا تھا ناں جو صاحب

نے غصے سے آپ کو ڈانٹا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد اسی طرح وہ گلدان' وہ صوفہ' وہ میز سیٹ کیا اور ہاں آپ کے وہ کپڑے جو سوٹ کیس میں تھے ناں وہ بھی نکال کے اپنی الماری کے اندر رکھ دیے۔''

یقیناً چمپا کے کیے ہوئے یہ انکشافات میرے لیے نئے تھے۔ اسپتال سے آئے ہوئے مجھے چار دن ہو گئے تھے لیکن میں ایک بار بھی ڈرائنگ روم کی طرف نہیں گئی اور نہ ہی زلفی کی الماری کھول کے دیکھی۔

''اور ایک اور بات بھی دلہن بی بی وہ جو اوپر والا گیسٹ روم ہے ناں اس کے ساتھ والے کمرے میں صاحب نے بڑی بیگم صاحبہ کی بڑی بڑی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ آپ کے آنے سے ایک دن پہلے صاحب نے وہ ساری تصویریں اتار کے شمیل بابا کی الماری کے اوپر رکھ دیں اور کوئی اور تصویر اخبار میں لپیٹے لائے تھے وہ اوپر لگا دی۔''

چمپا کی باتیں مجھے حیرت اور خوشی دونوں میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اسے کسی اور کام میں لگا کے میں پہلے ڈرائنگ روم میں آئی اور واقعی میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ڈرائنگ روم ویسے ہی سیٹ تھا جیسے کہ ایک ماہ پہلے میں نے کیا تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ اس ڈرائنگ روم کی سیٹنگ میں نے ہمیشہ ایک ہی دیکھی ایک دن بیٹھے بیٹھے میں بور ہو رہی تھی اور میں نے صوفوں کی ترتیب تبدیل کی۔ سرخ رنگ کی پھولوں والی بیڈ شیٹ کو کاٹ کر اس سے نئے کشن کور بنائے۔ بازار سے پھولوں کے نئے واز اور ڈرائی فلاور خرید لائی اور پورے کمرے کو ایک نئی لک دے دی۔

زلفی شام کو آئے اور دیکھتے ہی غصے میں بپھر گئے کہ پہلے والی سیٹنگ انبساط نے خود کی تھی اور اس کی یادوں کو مٹانے کا مجھے کوئی حق نہیں پھر ان کے حکم پر چمپا نے تمام سیٹنگ کو پہلے کی طرح کر دیا۔ کشن کور نکال پھینکے تصویریں واپس اپنی جگہ لگ گئیں۔ کرسٹل واز توڑ دیا گیا۔

اور اب دوبارہ وہی میری کی ہوئی سیٹنگ اسی طرح کا کرسٹل واز وہی کشن' وہی ترتیب۔

ڈرائنگ روم سے ہو کے میں اپنے کمرے میں آئی اور زلفی کی الماری کھول کے دیکھی۔

الماری کے ایک حصے میں زلفی کی شرٹس اور سوٹ لٹکے تھے اور دوسری طرف میرے سوٹ سلیقے سے ہینگر کیے ہوئے لٹکے ہوئے تھے۔ اوپر کے خانے میں میری لپ اسٹک' میرے ہیئر بینڈ' کیوٹکس اور باقی چیزیں پڑی تھیں اور سب سے آخری خانے میں میری سینڈلز' یہ تمام سامان جب سے میں آئی تھی ایک سیاہ رنگ کے سوٹ کیس میں میری ہی طرح کونے میں پڑا رہتا تھا اور اب اسے اچانک ہی یہ جگہ مل گئی تھی۔ میری آنکھوں میں پل بھر کو آنسو آ گئے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کے گیسٹ روم کے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ کمرہ اکثر بند رہتا تھا کیونکہ اس کمرے میں انبساط کی یادیں بند تھیں۔ اس کی تصویریں۔

لیکن آج اس کمرے میں ایسا کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی اس کی تصویر اور نہ اس کی یاد۔ سامنے کی دیوار پر جو

ساکت و جامد سا وجود تصویر بنا کھڑا تھا وہ میرا تھا۔ وزنہ ذوالفقار کا۔

یہ انلارج کی ہوئی وہی تصویر تھی جو ذوالفقار نے برف کے درمیان کھینچی تھی اور اسی لمحے کے چند ساعتوں بعد ہی تو میں نے اقرار کیا تھا۔ اپنے پہلے پیار کا پہلا اقرار۔

تبھی چمپا اندر کمرے میں داخل ہوئی۔

''دلہن بی بی جی! وہ نیچے آپ کی امی آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' اس کی اطلاع پر میں جلدی جلدی ہی نیچے آئی۔ ماما میرے کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ دو عدد سوٹ کیس' چند ڈبے اور کچھ اور کچھ سامان تھا۔

''کیسی ہو میری جان!'' انہوں نے مجھے گلے سے لگا کے بے حد پیار کیا۔

''میں تو ٹھیک ہوں ماما! لیکن یہ سب کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ...... یہ سب میری بیٹی کا جہیز ہے جو کہ میں نے اس کے لیے بہت پہلے سے ہی بنانا شروع کر دیا تھا۔'' ماما نے مسکرا کے کہا۔

''میرا جہیز......؟'' میں نے حیرت سے ہی کہا۔

''ہاں وزنہ! یہ تمام چیزیں جو ایک ماں نے اپنی بیٹی کے لیے اس کے بچپن سے اکٹھی کر رکھی تھیں لیکن وہ بدنصیب ماں اسے شادی پر دے ہی نہ پائی محض چند بے تکی باتوں پہ ناراض ہو کے۔'' ان کا لہجہ افسردہ تھا۔

''ماما!'' میں نے انہیں روکا۔

''ہاں وزنہ! کتنی خود غرض ہو گئی تھی ناں میں تب۔ یہ تو سوچا ہی نہیں کہ اس طرح کے فیصلے تو رب تعالیٰ پیدائش کے وقت ہی جوڑ دیتا ہے۔ ہم اس کو چاہ کر بھی بدل نہیں پاتے۔ وزنہ ذوالفقار کی قسمت میں تب بھی لکھی جا چکی تھی جب انبساط اس کی ہمسفر بنی یا پھر جب شمیل پیدا ہوا۔ میری بیٹی کو جس کا ہم سفر بنانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا وہ صرف ذوالفقار ہی تھا۔ کبھی کبھی ہم والدین کتنے خود غرض بن جاتے ہیں۔ اپنے حقوق تو یاد رکھتے ہیں لیکن فرائض سے منہ موڑ لیتے ہیں۔'' ماما کی آنکھیں نم تھیں۔

''بس ماما! بیتے ہوئے کل کی تلخیوں کو بھلا کے اگر ہم آنے والے کل اور آج کے بارے میں سوچیں تو شاید ہم بہت خوش رہیں۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔

ماما نے وہ سوٹ کیس کھولے' کتنے سارے رنگ برنگے سجے بنے' گوٹے والے جوڑے' زری کے کام والے سوٹ' بنارسی ساڑھیاں' کڑھائیوں والے کپڑے' کرن والے دوپٹے۔

''ماما! یہ سب آپ نے کب کیا؟'' میں اٹھا اٹھا کے دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

''فائزہ کا جہیز بناتے وقت تمہارا بھی ساتھ ساتھ ہی بناتی گئی وزنہ! یہ کپڑے ہیں ان بڑے ڈبوں

میں برتن اور چھوٹے ڈبوں میں جوتے' چوڑیاں وغیرہ کراکری' کٹلری' گلاس' مگ اور چند ضروری چیزیں۔ الیکٹرک کا کچھ سامان ابھی گھر پر پڑا ہے۔ اٹھوا لینا اور ہاں بیٹا یہ تمہارے زیور......'' میں نے حیران ہو کے انہیں دیکھا۔

''اپنی ماں کی طرف سے دی ہوئی چیزیں ہر بیٹی کو لینا پڑتی ہیں۔ چاہے اسے کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو۔'' ماما کے کہنے پر میں نے وہ دونوں سیٹ لے کر رکھ لیے۔ ''بیٹا اب اپنے گھر کی ہو گئی ہو تم۔ ذمے داری آ گئی ہے تم پر اس گھر کی۔ زلفی بھائی کی اور ایک چھوٹے سے بچے کی بھی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میری بیٹی ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں ثابت ہو پائے گی۔ بس ضرورت ہے کچھ حوصلے کی' برداشت کی اور مجھے امید ہے کہ تم صبر اور حوصلے سے کام لو گی۔''

ماما ایک اچھی ماں کی طرح میرے سپرد اپنی تہذیب کر رہی تھیں اور میں ان کے گھٹنوں پر لیٹی اپنی خوش قسمتی پر اپنے رب کی شکر گزار ہو رہی تھی۔

فون کی گھنٹی کافی دیر سے بج رہی تھی اور چمپا شاید کہیں سوئی ہوئی ہو گی۔ اس لیے اٹھا ہی نہیں رہی تھی۔ آخر مجھے اپنے آرام دہ بستر کو چھوڑ کے فون تک آنا ہی پڑا۔

''ہیلو ونزہ!'' دوسری طرف زلفی ہی تھے۔ ''کیسی ہو' سو تو نہیں رہی تھیں؟''

''جی...... جی نہیں' بس لیٹی ہوئی تھی۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''اچھا ایسا کرو شام کو تیار رہنا' ہم ڈنر پر جائیں گے۔'' انہوں نے مطلع کیا۔

''ڈنر پر کیوں؟'' یہ غیر متوقع اطلاع ہی تھی۔

''کیوں' کیا آپ بھی ہر کسی کی طرح بھول گئی ہیں کہ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے آپ ونزہ ذوالفقار بنی تھیں۔ ہماری بنی تھیں۔'' وہ بہت پیار سے بولے۔ میں ان کے اس انداز پر حیران ہی تھی۔ کیا یہ بھی ڈرامہ تھا' اداکاری تھی' فریب تھا' دھوکا تھا' یہ کیا تھا۔

''شمیل کو اسکول کے بعد میں شارق کے پاس چھوڑ آؤں گا۔ تم ٹھیک چھ بجے تیار رہنا اور ہاں کوئی بنارسی ساڑھی بھی پہننا کسی نازک سی جیولری کے ساتھ۔'' انہوں نے سرگوشیانہ سے انداز میں کہا۔ میں بے اختیار ہی مسکرا دی آج یقیناً مجھے یاد نہ رہا تھا کہ میری شادی کی سالگرہ ہے کس طرح بھول گئی تھی میں یہ دن۔

میں نے ماما کا دیا ہوا سامان نکال کے دیکھا۔ اس میں دو بنارسی ساڑھیاں تھیں۔ ایک سبز رنگ کے بارڈر والی اور دوسری ریڈ اور اورنج کے کامبینیشن پر میں نے ریڈ والی ساڑھی نکالی۔ اسے چمپا سے پریس کروایا۔ ماما کے دیئے ہوئے جیولری سیٹ میں سے ایک سرخ نگوں والا سیٹ نکالا۔

شام کو میں وقت سے بہت پہلے ہی تیار تھی۔ میں نے اپنے بال کھول کے پہلی بار تفصیل سے میک اپ کیا۔ زیور پہنے اور زلفی کا انتظار کرنے لگی وہ بھی چھ بجے سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے۔ ہاتھ میں سرخ گلابوں کا بکے پکڑے ہوئے میری طرف بہت گہری آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' میں جھینپ گئی۔

''اپنی تکمیل کے احساس کو دیکھ رہا ہوں۔ کتنا مکمل ہو گیا ہوں ناں پھر سے میں' بنجر دل پہ پیار کی بارش کتنی پیاری لگتی ہے ناں۔'' وہ مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کے بولے۔ میرے چہرے پر شرم کے کتنے ہی سائے رقصاں تھے۔

''چلیں مسز۔'' وہ قدرے قریب آ گئے۔

''چلیں۔'' میں بہت دور چلی گئی۔ وہ مسکرا دیئے۔

''ایک بات پوچھوں زلفی!'' گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے کہا۔

''ہوں۔'' وہ مسکرائے۔

''آپ کی یہ محبت' یہ بدلا ہوا رویہ' کہیں یہ وقتی تو نہیں یا پھر میرے لیے ہمدردی تو نہیں۔ زلفی میں آپ کی نفرت پھر برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' میرے اندر ایک ڈر تھا۔ اسے دوبارہ کھو دینے کا۔

''پاگل لڑکی! مجھے تم سے کبھی نفرت نہیں تھی۔ بس میں تو اپنے آپ کو وقت دے رہا تھا۔ اپنے دل کو سمجھا رہا تھا۔ اسے نئے حالات کا عادی بنا رہا تھا۔ تم نے تو میری مردہ زندگی میں روح پھونکی ہے۔ میری منتشر سانسوں کو یکجا کیا ہے' انہیں سمیٹا ہے۔ کتنا بکھر گیا تھا میں محبت کو کھو کر' لیکن تمہاری والہانہ چاہت نے مجھے جینے کا ایک نیا رخ دیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر نے اور شمیل نے بھی قبول کر لیا ہے۔''

''اچھا۔'' میں نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

''تو کیا وہ رہ سکتا تھا اتنے دن اپنی بیسٹ فرینڈ سے دور؟'' انہوں نے بھی مسکرا کے کہا۔

انہوں نے ٹیپ آن کیا۔ مہر علی شاہ کا کلام گونجا۔

''کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء۔ گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں''

انہوں نے سڑک کے کنارے گاڑی روکی اور میری طرف متوجہ ہوئے۔

''میں نے بھی اپنی گستاخ آنکھیں لڑا دی ہیں ان جھیل سی گہری آنکھوں سے۔ اب کیا ان آنکھوں میں مجھے رہنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ تا عمر' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' ان کا لہجہ ان کی صداقتوں کا امین تھا۔

انہوں نے اپنی جیب ٹٹولی اور اس میں سے ایک سفید رومال نکالا۔ اس میں وہی مرجھایا سا بیشا کا پھول تھا۔

''یہ لو ونزہ! میری محبت کا پہلا اقرار۔ میں نے اپنی پوری زندگی تمہیں سونپ دی۔ ہزاروں لمحے ہمارے منتظر ہیں۔ ہزاروں خواب ہماری آس میں بیٹھے ہیں۔ ہزاروں خواہشیں ہمارے انتظار میں ہیں۔ میرا ساتھ دو گی ناں ان خوابوں' خواہشوں کو پانے کے لیے۔ دو گی ناں ساتھ میرا۔'' وہ میرے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بولے۔

میں نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔

انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

''آئی لو یو زلفی!'' میری آنکھیں اپنے ہر بند کو توڑ کے بہہ چکی تھیں۔

''می ٹو ڈیئر۔'' انہوں نے میرے آنسو صاف کیے۔

گاڑی اپنی رفتار پر پھر سے چل رہی تھی۔

''شمیل کو لے لیں گھر جانے سے پہلے۔'' میں نے کہا۔

''ارے اس شیطان کو وہیں رہنے دو۔ کل ویسے بھی اس کی چھٹی ہے۔ آج تو ہم اپنی نئی نویلی دلہن سے اپنی محبت کا اقرار کریں گے۔ کچھ اس کی مانیں گے' کچھ اپنی منوائیں گے اور اپنے پیار کی خوشبو کو اپنے رُوم رُوم میں بسا لیں گے۔'' زلفی کا لہجہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ پہلا پیار' ہاں پہلا پیار کتنا نزدیک کر دیتا ہے ناں خدا کے۔ اس کا وجود کتنا قریب لگنے لگتا ہے۔ پیار انسان کو اپنے معبود سے بہت نزدیک لے جاتا ہے جدائی میں اگر کوئی ساتھ ہوتا ہے تو خدا ہوتا ہے۔ ملنے کی امید اگر کوئی زندہ رکھتا ہے تو خدا ہوتا ہے۔ ملن کے لمحوں کی دعاؤں اور سجدوں کو اگر کوئی سنتا ہے تو خدا ہوتا ہے۔

میں اپنے معبود کی مہربانیوں پر دل سے شکرگزار تھی۔ گاڑی اسی رفتار سے سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی اور میں کھڑکی کے شیشے سے بیتے دنوں کے ہر دکھ کو الوداع کہہ رہی تھی اور آنے والے حسین لمحوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

٭٭٭

تم پھول کسی کو مت دینا

مرے صبر پر کوئی اجر گیا' میری دوپہر پہ یہ ابر کیوں
مجھے اوڑھنے دے اذیتیں' مری عادتیں نہ خراب کر
یہ جلوسِ فصلِ بہار ہے تہی دست' یار سجا اسے
کوئی اشک پھر سے شرر بنا کوئی زخم پھر گلاب کر

''ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لڑکیاں آخر اداکاروں اور گلوکاروں کے پیچھے اتنی پاگل کیوں ہوتی ہیں؟'' صمد نے بیٹھے بیٹھے اپنی بحث کو اک اور زاویے سے دیکھا۔

''اوئے مسٹر۔ یہ بیماری صرف لڑکیوں ہی میں نہیں لڑکوں میں بھی ہوتی ہے۔ ڈھکے چھپے انداز ہی میں سہی لیکن یہ تمام لڑکے اسکرین پر سحر بکھیرتی اپسراؤں کے دیوانے ہوتے ہیں۔'' قرۃ العین نے صدا بلند کی۔ چھوٹے سے رسالے کے اس آفس میں تمام کام کرنے والوں کی آپس میں اچھی راہ و رسم تھی۔

وہ اپنے لکھے ہر آرٹیکل' ہر کالم اور ہر انٹرویو پہ تنقیدی گفتگو کیا کرتے تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں نینا؟ آخر تم ہی کو تو انٹرویو کرنا ہے نوجوان نسل میں اپنی رومینٹک غزلوں اور گیتوں کے ذریعے کریز بن جانے والے علی اعشار سے تم ہی کمنٹ نہیں کر رہی ہو۔'' ردا نے اسے متوجہ کیا اور وہ جو ہونٹوں میں پین دبائے کسی غیر مرئی نقطے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''عجیب آدمی ہے یہ علی اعشار! پہلے تو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ کبھی کوئی محفل' تو کبھی کوئی پروگرام۔ فون تک پہ انٹرویو دینے سے انکار کر دیا اس نے اور دیکھ لو کل خود ہی ایڈیٹر صاحب کو فون کر کے مجھے اپنے گھر پہ بلوا لیا ہے۔ سچ پوچھو تو اس کے گھر جاتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سی فیلنگ ہو رہی ہے۔'' اس نے اپنا خدشہ ظاہر کر دیا۔

''تم کیوں گھبرا رہی ہو۔ اس طرح کے لوگ پریس والوں اور عوام کے سامنے ہمیشہ اچھا بن کے رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے کسی بھی غلط چیز کی توقع مت رکھو اور پھر تم وہاں اکیلی تھوڑی جاؤ گی۔ ہمارا فوٹو گرافر نومی تمہارے ساتھ ہی ہوگا۔'' صمد نے اسے دلاسا دیا۔

''ہاں لیکن اس کا گھر ہے بھی کتنے دور دراز علاقے میں اور پھر رات کے ساڑھے آٹھ بجے انٹرویو دینے کی کوئی تک ہے بھلا۔ اب انٹرویو کرتے کرتے کم از کم دو گھنٹے تو لگیں گے ہی ہمارے پاس کوئی اپنی کنوینس ہے نہیں۔ ڈراپ تو ایڈیٹر صاحب کروا دیں گے لیکن واپسی؟'' نینا کے دل میں ایک نہیں کئی وسوسے تھے۔

''اے ڈرپوک لڑکی! تجھے کس نے کہا تھا پریس جوائن کرنے کو اور وہ بھی اسپیشل اسائنمنٹ والے کالم کے لیے انٹرویوز کرنے کو' جس کا مقصد صرف اداکار یا گلوکار کو جاننا نہیں بلکہ ان کی پرسنل لائف میں جھانکنا ہوتا ہے۔ یہ بتاؤ تم نے سوال نامہ تیار کر لیا ہے یا وہ بھی ڈر کے مارے بھول گئیں۔'' قرۃ العین نے اسے جھڑکا۔ وہ مسکرا دی۔

''اچھا تو پھر ابھی گھر چلی جاؤ۔ آٹھ بجے آ کے نومی کے ساتھ یہیں سے نکل پڑنا۔ واپسی پہ اللہ مالک ہے۔'' صمد نے اسے تاکید کی۔ تبھی اندر سے ایڈیٹر علی حسن قریشی نکلے۔

''نیناں بی بی! آٹھ بجے کے قریب آپ کو اعشار کی پرسنل گاڑی آفس سے پک کرنے آئے گی اور وہی آپ کو ڈراپ بھی کر دے گی۔ آپ اپنے گھر والوں کو بتا دیجیے گا واپسی کا وقت اور نعمان کو بھی لے لیجیے گا۔ او کے۔'' انہوں نے سارا پروگرام بتایا۔

''او کے سر۔'' وہ ادب سے بولی۔ ایڈیٹر کے واپس جاتے ہی صمد نے ٹیبل بجائی۔

''تیری آنکھوں کو غزل بولوں' کنول بولوں یا تارے۔''

علی اعشار کی گائی غزل کا مصرعہ تھا یہ۔ ''لگتا ہے یہ اعشار صاحب کچھ زیادہ ہی سخی دل ہیں۔ گاڑیاں' تنہائیاں' اوئے ہوئے۔'' صمد شرارت سے مسکرایا۔ نیناں نے پیپر ویٹ اٹھا کے اسے مارنے کا اشارہ کیا۔

*

آٹھ بجے سے کچھ پہلے ہی علی اعشار کی گاڑی اس چھوٹے سے آفس کے باہر موجود تھی۔ تیاری تو اس کی نارمل ہی تھی جیسی وہ روزانہ آفس آتے وقت کرتی تھی۔ بس جانے سے پہلے اس نے تازہ پانی سے منہ دھو کے اسکارف باندھا اور پرفیوم چھڑکا اور چل پڑی۔ گاڑی کے اندر کی فضا خنک اور ایئر فریشنر کی مہک لیے ہوئے تھی۔ باوردی ڈرائیور اسے اور نعمان کو اس دور دراز علاقے میں بنے اکا دکا بنگلوں کے بیچ لے آیا اور ایک مخصوص طرز کے بنے گیٹ کے سامنے جا کر گاڑی کا ہارن بجایا۔ گیٹ کھلا اور گاڑی اندر گیراج میں اپنی جگہ کھڑی ہو گئی جہاں دو قیمتی گاڑیاں چمچماتی ہوئی اپنی موجوگی کا اعلان کر رہی تھیں۔

اندر گئے تو ایک شاندار قسم کا لاؤنج ان کا منتظر تھا۔ جدید ڈیزائن سے آراستہ صوفے' کرسٹل ٹیبل اور اس پر رکھی کرسٹل ہی کی کئی چیزیں۔ چھت پہ لگا اعلیٰ طرز کا بڑا سا فانوس اور اس کی جھلملاتی روشنی سے سجا ماحول۔ دیوار میں اے سی لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی علی اعشار کی انلارج کی ہوئی تصویر۔ وہ یقیناً خوب صورت خدوخال اور جاذب شخصیت کا مالک تھا۔

''میڈم جی! کیا گانے سے اتنے سارے پیسے مل سکتے ہیں؟ اگر مل سکتے ہیں تو میں کیوں تصویریں کھینچ کھینچ کے اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔'' یقیناً نعمان بھی اس آن بان اور شان سے مرعوب ہو گیا تھا اور ہوئی تو نیناں خود بھی تھی۔

''نہیں نومی! مجھے تو یہ کوئی زمیندار لگ رہا ہے۔ امیر لوگوں کے بچوں کو ہی اس طرح کے شوق ہوتے ہیں۔'' اس نے یقیناً یہی سمجھا تھا۔ اس چپ چاپ سے ماحول میں ہلکی سی آہٹ ہوئی اور ایک ملازم ٹرالی گھسیٹتا ان تک آیا۔ ٹرالی بھی کئی طرح کے لوازمات سے سجی تھی۔ نیناں نے کوک اور سینڈوچ پہ ہی اکتفا کیا۔

''اعشار صاحب کہاں ہیں؟ ہمیں دیر ہو جائے گی۔'' اس نے ملازم سے پوچھا۔

''میڈم! سر ابھی نیچے آ رہے ہیں۔ اصل میں آج وہ کافی بزی رہے ہیں۔ یتیم خانوں اور اسپیشل چلڈرن کے اسکولز کا معائنہ کیا ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر آئے ہیں۔ میں نے آپ کے آنے کی اطلاع دے دی ہے۔ وہ آ جاتے ہیں ابھی۔'' نیناں کو وہ ملازم روبوٹ کی طرح کی حرکتیں کرتا ہوا لگا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد سیڑھیاں اترتے ہوئے علی اعشار نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

سفید رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس اسکرین سے بالکل الگ ایک علی اعشار ان کے سامنے تھا۔ وہ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ دلکش مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ سجائے اس نے انہیں ویلکم کیا۔

''سوری مس نیناں علی! میں کچھ لیٹ ہو گیا۔ اصل میں پچھلے چند دنوں سے میں بہت مصروف رہا ہوں۔ کنسرٹ، ریکارڈنگ اور پھر آج چیرٹی اور فنڈز کے لیے چکر لگے۔'' وہ بہت اچھے طریقے سے اپنی مصروفیت کی تفصیل بتانے لگا۔

''آپ کے ملازم نے بتایا۔ کیسے ہیں آپ۔'' وہ رسماً مسکرا دی۔

''میں بالکل ٹھیک۔ آپ کو آنے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی؟''

''جی بالکل نہیں۔ انٹرویو شروع کریں۔''

''ضرور۔ میں حاضر ہوں آپ کی عدالت میں۔'' وہ مسکرایا۔

اس نے اپنا منی ٹیپ ریکارڈ آن کیا اور نومی نے اپنے کیمرے کو تیار کرلیا۔

''علی اعشار صاحب! چھ سال پہلے آپ نے بطور غزل گو سنگر اپنے سفر کا آغاز کیا اور اس چھ سال کے اندر اندر آپ کے سات عدد البمز اور کئی سارے گانے آ گئے جو کہ نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ہر بچے بڑے کے ہونٹوں پہ بھی مچلتے رہے۔ اتنی شہرت پا کے کیا ملا آپ کو؟'' سوال بظاہر کچھ عجیب سا تھا لیکن علی اعشار نے بہت خوب صورت انداز اپنایا جواب دینے کا۔

''دیکھیے نیناں! میں شہرت کا بھوکا نہیں اور اگر ہوتا تو میں اپنا فنی سفر کسی غزل گو سنگر سے نہیں بلکہ پاپ سنگر یا بھنگڑہ سنگر کی حیثیت سے کرتا۔ مجھے خوشی ہے اس بات کی کہ میں نے جو فیلڈ، جو زاویہ چنا، وہ لوگوں کے دلوں تک بے کم و کاست پہنچا اور انہی کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے عزت بھی دی، شہرت اور دولت بھی۔ میرے لیے تو اپنے چاہنے والوں کی دعائیں ہی میرا حاصل ہیں۔''

''آپ کے ساتھ، آپ کے گھر میں کون کون رہتا ہے۔ میرا مطلب فیملی؟'' اک اور سوال اٹھا۔

''والدین کا ساتھ تو جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتے ہی چھوٹ گیا۔ دو بھائی ہیں۔ اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن۔ دوسرے شہروں میں رہتے ہیں۔ ایک بہن جو کہ شادی شدہ اور ماشاء اللہ سے اپنے گھر میں خوش ہے۔''

''یعنی آپ اس اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتے ہیں۔'' اس پہ نیناں مسکرائی۔

''بالکل نہیں۔ میں تنہا تو نہیں۔ میرا پی اے اور سیکرٹری شاہ ویز ہے، میرا بنگالی کک دلبر ہے، میرے دو عدد ڈرائیورز، کام والی ماسی نازاں ہے اور میرا چوکیدار گل زمان خان۔ میرے کمرے میں میرے ساتھ میری غزلیں، میرے گیت اور میرے ارد گرد بکھری نظمیں رہتی ہیں۔'' علی اعشار نے کھنکھناتے

لہجے میں جواب دیا۔

''تو آپ اپنی اس تنہائی کو دور کیوں نہیں کر لیتے۔ کسی ساتھی کی موجودگی سے۔'' نیناں نے شرارت سے کہا۔ نومی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچے جا رہا تھا۔

''جب قسمت میں لکھا ہوگا تو وہ بھی ہو جائے گا۔ فی الحال تو ایسا کوئی نہیں ملا۔'' اس کے چہرے پہ اک مسکراہٹ در آئی۔

''اعشار جی! میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گی دل آویز شاہ کی طرف، جو کہ نہ صرف ایک گلوکارہ تھیں بلکہ اچھی اداکارہ بھی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی آپ سے بہت اچھی جان پہچان اور دوستی تھی، یہاں تک کہ آپ کی شادی کی افواہیں بھی پھیلی تھیں لیکن اچانک وہ اسکرین سے غائب ہو گئیں اور چھ ماہ بعد ان کی موت کی خبر میڈیا تک پہنچی۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے۔'' نیناں نے انتہائی اہم سوال اٹھایا۔ اعشار کے چہرے پر اک رنگ سا آیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا جیسے کہ بولنے کے لیے الفاظ تراش رہا ہو۔

''دل آویز شاہ میری بہت اچھی دوست تھی۔ فیملی ٹرمز بھی تھے ہمارے۔ پروفیشن بھی ایک تھا۔ انڈر اسٹینڈنگ بھی تھی ہم میں لیکن شادی کا قطعی کوئی خیال نہ تھا۔ اللہ نے دل آویز کو بہت ہی کم وقت دیا تھا۔ اس کی اچانک موت نے میرے دل پہ بہت گہرا صدمہ اور اثر چھوڑا۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں کہنا چاہوں گا۔'' اس نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا ماحول کچھ افسوسناک بن گیا۔

''اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے مستقبل کے بارے میں کیا پلان ہیں۔'' اس نے اک اور سوال کیا اور اس طرح علی اعشار اس کے ہر سوال کا جواب بہت خوب صورتی سے دیتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ترتیب دیے ہوئے تمام سوال ختم ہو گئے۔ انٹرویو کے بعد اعشار انہیں کھانے کی ٹیبل تک لے گیا جہاں اعلیٰ قسم کا پاکستانی و چینی کھانا عمدگی سے سجایا گیا تھا۔ ڈنر کے بعد اعشار نے انہیں گاڑی تک چھوڑا اور گاڑی نے دونوں کو ان کے گھر پہ اتارا۔ نیناں نے شکر ادا کیا کہ یہ مشکل اسائنمنٹ بخوبی انجام کو پہنچی تھی۔

*

رات بھر بیٹھ کے اس نے علی اعشار کی ریکارڈڈ آواز کو کاغذ پر اتارا اور صبح انٹرویو ایڈیٹر سے پاس کرا کے کمپوزنگ کے لیے بھیج دیا۔ اس کے سبھی ساتھی اس کارنامے پہ خوش تھے۔

''ویل ڈن نینا! بہت اچھے سوالات کیے ہیں اور موصوف کے جوابات بھی بہت اچھے ہیں۔'' قرۃ العین نے کمنٹ کیا۔

''مجھے تو یہ آدمی بہت چالاک لگتا ہے۔ دل آویز شاہ کے سوال پہ کتنی مہارت سے مکر گیا جب کہ

مجھے یاد ہے کہ دل آویز شاہ سے اس کی شادی کی تصویریں بھی چرا کے چھاپی گئی تھیں اور ان سے یہ صاحب اسی طرح انکار کر گئے تھے کیمرہ ٹرک کہہ کر۔'' صمد نے خبر دی۔

''مجھے تو پہلی ملاقات میں وہ عجیب عجیب سا ہی لگا۔ اکیلا رہتا ہے۔ کوئی بیوی' کوئی دوست نہیں۔ فیملی کے نام پہ آٹھ دس نوکر ہیں اور ایک عالی شان پناہ گاہ۔'' نیناں نے کہا۔

''یار یہ میڈیا اور گلیمر کی دنیا سے جڑے لوگ اول درجے کے فریبی ہوتے ہیں۔ چھ چھ عشق لڑاتے ہیں۔ چار چار شادیاں کرتے ہیں اور آخری عمر کی شادی کو ہی ہائی لائٹ کر کے ایکسپوز کرتے ہیں۔ بہت کم مثالیں ہیں ہمارے یہاں کسی اداکار یا گلوکار کی کہ ایک عدد شادی کی۔'' ردا نے حقیقت ہی کہی تھی۔

''خیر مجھے اس سے کیا۔ میرا کام اتنا ہی تھا کہ میں اس سے انٹرویو کروں۔ اس کی شخصیت کے بارے میں اچھی یا بری رائے دینا میرا کام نہیں۔ اچھا دوستو! اب میں چلتی ہوں۔ آج ہما کا رزلٹ تھا ایف ایس سی کا۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہوگا۔ پریشان تھی وہ کافی کل رات سے۔'' نیناں نے اپنا ہینڈ بیگ اور فائل اٹھائے اور آفس سے باہر چلی گئی۔

اس نے گھر کے ڈور بیل کو بجایا تو دروازہ امی نے کھولا۔ گھر میں خلافِ توقع بہت سناٹا سا تھا۔ وہ تو کسی دھما چوکڑی' کسی شور ہنگامے کی توقع کیے بیٹھی تھی لیکن گھر میں تو خاموشی تھی۔

''کیا ہوا امی! ہما کا رزلٹ آ گیا اور یہ سب لوگ کہاں ہیں؟'' اس نے ماں کے چہرے کو دیکھ کے کہا۔

''تم چلو اندر۔ لگ جائے گا پتہ تمہیں اپنی لاڈلی بہن کے کرتوتوں کا۔'' والدہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ وہ کسی انہونی خبر کا خدشہ لیے اندر داخل ہوئی۔ ہما' شہیر' صوفیہ کوئی بھی تو باہر نہ تھا۔ وہ چپ چاپ اندر کمرے تک آئی۔ وہاں بیڈ پہ اسے تینوں ہی نظر آ گئے قدرے اداس' چپ چاپ۔

''ہما! کیا ہوا تیرے رزلٹ کا۔ بتاؤ مجھے؟'' اس نے گم سم بیٹھی ہما کو کہا۔ اس نے بے بسی سے بہن کو دیکھا اور اس کی آنکھیں پل بھر کو نم ہو گئیں۔

''کیوں رو رہی ہو؟ کوئی تو مجھے بتائے اس کے رزلٹ کا کیا ہوا۔ پیپر کلیئر ہوئے یا کوئی رہ گیا۔'' اب اسے خود بھی رونا آ رہا تھا۔

''نیناں آپی! ہما کا رزلٹ آ گیا ہے۔'' صوفیہ نے بمشکل یہی کہا۔

''کیا آیا ہے یہ بھی بتاؤ۔ آخر تم سب لوگ یوں منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟'' وہ سراپا سوال تھی۔

''وہ اصل میں نیناں آپی! ہمانے' ہمانے تمام پیپر.....'' شہیر نے شروعات کیں۔

''ہاں ہاں۔ بولو۔ کیا تمام پیپر؟'' اس کی جان اٹکی سی تھی۔

''ہمانے تمام پیپرز.....فیل.....نہیں کیے۔ اس کا ایف ایس سی کلیئر ہو گیا اور وہ بھی ۷۰ فی صد نمبروں سے۔'' شہیر نے رک رک کے بتایا اور ہما' صوفیہ' شہیر اور دروازے پہ کھڑی امی بھی کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ وہ جو بوکھلائی سی بیٹھی تھی اس کی جان میں جان آئی اور وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے ان تینوں کو کشن اٹھا اٹھا کے مارنے لگی۔

''بدتمیزو! جان نکالنے کا ارادہ تھا میری۔ کتنی پریشان تھی آج صبح سے میں۔ ہما سے بھی زیادہ مجھے فکر تھی جیسے میرا رزلٹ ہو اور امی آپ بھی۔'' اس نے مسکراتی ماں کو دیکھا۔

''بھئی میں کیا کرتی۔ تیرے یہ چھوٹے بہن بھائی تینوں نے اتنا زور دیا کہ میں منع نہ کر پائی۔'' وہ صاف مکر گئیں۔

''چلیں نیناں آپی! اسی خوشی میں آپ آج ہمیں آئس کریم کھلائیں گی۔'' ہما نے فرمائش کی اور وہ ان کی اس خطرناک شرارت پہ مسکرا کے رہ گئی۔

✲

علی اعشار کا انٹرویو میگزین میں کیا چھپا لوگوں کے تعریفی خطوط اور فون کالز کی گویا لائن لگ گئی۔ کسی کو اعشار کا فون نمبر درکار ہوتا تو کسی کو اس کا ایڈریس۔ نیناں کے بھی دوستوں نے اسے اس خصوصی انٹرویو کو اتنی کامیابی سے کرنے پر مبارک باد دی اور وہ بہت خلوص و محبت سے ہر کسی کی مبارک بادیں سمیٹ رہی تھی۔ آج بھی وہ اپنے آفس میں بیٹھی اپنے اگلے انٹرویو کے لیے سوال ترتیب دے رہی تھی کہ پیون نے اسے فون کی اطلاع دی۔

''کس کا فون ہو سکتا ہے؟'' وہ خود کلامی کرتی ہوئی ٹیلی فون تک آئی۔

''ہیلو۔''

''مس نیناں! علی اعشار عرض کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے کھنکتا ہوا لہجہ سنائی دیا۔

''اعشار صاحب! آپ؟'' اس کی حیرت متوقع تھی۔

''ہاں جی جناب! ہم۔ آج ہی آپ کے ایڈیٹر کی طرف سے رسالہ ملا۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا نیناں۔ اتنی خوب صورتی سے میرا انٹرویو ترتیب دیا آپ نے۔ آئی ایم ریئلی امپریسڈ۔''

''ارے اعشار صاحب! انٹرویو دیا آپ نے تھا۔ میں نے تو بس اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے اسے ترتیب دیا ہے۔'' نینا بھی مسکرا دی۔

''نیناں جی! یہ پریس والے تو ہم جیسے فن کاروں کو دو ٹکے کا سمجھتے ہیں۔ انٹرویو لیتے ضرور ہیں لیکن چھاپتے وہی ہیں جو ان کے دلوں میں ہو لیکن آپ اور آپ کا رسالہ بہت تعاون کرنے والے ہیں۔ کل شام میں نے اپنے گھر پہ ایک پارٹی رکھی ہے۔ بس کچھ دوست' میں چاہتا ہوں آپ بھی آئیں۔'' وہ

اصل بات کی طرف آیا۔
''میں؟شکریہ اعشار صاحب! لیکن.....'' وہ لفظ تراشنے لگی۔
''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر کنوینس کا مسئلہ ہے تو میں خود لینے آجاؤں گا۔ بس آپ انکار مت کریں۔'' اعشار مروت سے بولا۔ وہ چپ ہی رہی۔ ''دیکھیں مس نیناں میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔'' اس کی اس بات پر نیناں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ سچ تو یہ تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد نیناں کے دل سے تمام کے تمام خوف ہوا ہو چکے تھے اور وہ اب کم ازکم اعشار کی شخصیت کی طرف سے بے خوف تھی۔
''یہ بتائیں کتنے بجے آنا ہے؟''
''یہ ہوئی ناں بات۔ کل شام چھ بجے۔ اگر آپ کہیں تو گاڑی بجھوا دوں آپ کے گھر۔'' وہ کھلکھلایا۔
''نہیں شکریہ۔ میرا بھائی مجھے ڈراپ کردے گا۔'' اس نے انکار کر دیا۔
''اوکے پھر۔ کل ملیں گے۔''
''اوکے۔'' فون ڈس کنکٹ ہو چکا تھا اور وہ سوچ کے دوراہوں پہ کھڑی سوچے جا رہی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیے تھا کیا نہیں۔ یہ فیصلہ اس وقت خاصا مشکل ہی تھا۔

☆

''نیناں! اگر ہاں کر ہی دیا ہے تو جانے سے گھبرا کیوں رہی ہو؟ اور تم وہاں کوئی پہلی مرتبہ تھوڑی جا رہی ہو۔ اکیلی بھی تو نہیں ہوگی۔ شہیر تمہارے ساتھ ہوگا۔'' الجھی گھبرائی سی نیناں کو والدہ سمجھاتے ہوئے بولیں۔
''ہاں امی! لیکن وہ اتنے امیر لوگوں کی پارٹی ہوگی۔ اونچی حیثیت والے اونچے لوگ' میں وہاں خود کو ان فٹ محسوس کروں گی۔'' ہزاروں خدشے اس کے دل میں تھے۔
''افوہ نیناں آپی! آپ میرے فیورٹ سنگر علی اعشار کے گھر جانے یا نہ جانے کے بارے میں بہت سوچ رہی ہیں۔'' ہما نے اسے چھیڑا۔
''اٹھو آپی! ساڑھے پانچ تو یہیں بج گئے۔ اب تو مجھے کچھ حکم دیں۔ بوتل کا جن منتظر ہے۔''
''تو ہاں کر یا نہ کر۔ تو ہے میری آپی! تو ہے میری آپی!''
شہیر زور زور سے گنگنانے لگا۔ وہ بے دلی سے اٹھی اور کمرے میں جا کے تیار ہونے لگی۔ پارٹی تھی تو اس نے گرین کلر کا جارجٹ کا کڑھائی کیا ہوا سوٹ نکالا۔ ہلکے میک اپ کے ساتھ نازک سی جیولری پہنی اور لپ اسٹک لگالی۔ بالوں کی چوٹی بنائی اور اسکارف باندھ لیا۔

شہیر کا موٹر سائیکل ڈیفنس فیز ایٹ میں پہنچ چکا تھا۔ نیناں کو گھر دھندلا سا ہی لیکن یاد ضرور تھا۔ کچھ ہی دیر کے اندازوں کے بعد نینا نے موٹر سائیکل اسی مخصوص گیٹ کے باہر رکوائی جہاں علی اعشار کے نام کا بورڈ بھی آویزاں تھا۔
وہ لوگ اندر گئے تو علی اعشار کو اپنا منتظر ہی پایا۔ اندر اور کئی چہروں کی بھیڑ تھی جن میں چند اداکار تھے اور باقی قدرے انجان چہرے۔ اعشار اسے ساتھ لے کر باقی لوگوں کے پاس آیا۔
''تو دوستوں! فائنلی مہمان خصوصی آ چکی ہیں۔ یہی ہیں وہ جن کے لیے آج میں نے یہ چھوٹی سی پارٹی رکھی ہے۔ مس نیناں علی!'' اس کے یہ کہنے پر سبھی نے تالیاں بجائیں اور نیناں کے لیے یہ انکشاف خاصا عجیب تھا کہ یہ پارٹی اسی کے لیے دی گئی ہے۔
سبھی پارٹی انجوائے کر رہے تھے۔ شہیر تو اپنے من پسند اداکاروں سے باتوں میں اور آٹو گراف لینے میں مصروف تھا اور وہ ہاتھ میں کوکا کولا کا گلاس تھامے کونے میں کھڑی تھی۔ کتنا عجیب ہوتا ہے تب دل کا عالم کہ اردگرد کے ماحول میں کوئی چہرہ' کوئی مزاج' اپنے جیسا نہ ہو۔ دل کی سمیت' ڈائمینشن کہیں بھی ملتی نہ ہو۔ بھری محفل میں بھی یہ احساس ہو کہ تنہائی ہی اردگرد ہے آنکھوں کے سامنے کئی ہنستے مسکراتے چہرے ہوں' بکھرتے قہقہے ہوں لیکن آنکھوں کے اردگرد فقط تنہائی ہی گھر بنائے ہو۔
''نیناں! آپ یہاں اکیلی کونے میں کھڑی ہیں یقیناً آپ بور ہو رہی ہیں ہے ناں۔'' علی اعشار ہاتھ میں لیمن اسکواش تھامے اس کے سامنے تھا۔
''نہیں بور نہیں ہو رہی بالکل بھی۔ بس کچھ سوچ رہی تھی۔'' وہ مسکرا دی۔
''پتہ ہے نیناں! ہم لوگ اپنی آدھی سے زیادہ زندگی فقط سوچنے میں ہی گزار دیتے ہیں کبھی اپنے مستقبل کی بارے میں تو کبھی اپنے ماضی کے بارے میں' لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ اس سب کے بیچ ہم اپنا قیمتی حال کہیں کھو دیتے ہیں۔'' اعشار بہت سنجیدگی سے بولا۔
''پتہ ہے اعشار صاحب! آپ گانے کے علاوہ باتیں بھی خوب کرتے ہیں۔'' نیناں کے کمنٹ پر اعشار نے کھل کر قہقہہ مارا۔
''چلیں نیناں! میں آپ کو اپنا لان دکھاؤں۔'' وہ نیناں کو اپنے ساتھ لے کر باہر لان میں آ گیا۔ باہر کی فضا خاصی خنک تھی۔ تاریکی پہ اعشار کے گھر کی روشنی حاوی تھی۔ ماحول میں پھولوں اور رات کی رانی کی مہک تھی۔
''ایک بات بتائیں اعشار صاحب! آپ نے تو مجھے اس پارٹی میں صرف ایک گیسٹ کی حیثیت سے بلایا تھا اور یہاں آ کر آپ نے مجھے مہمانِ خصوصی ظاہر کیا' ایسا کیوں؟'' نیناں کتنی دیر سے جو سوال چھپائے بیٹھی تھی وہ کر ہی ڈالا۔

''پہلے آپ مجھے اعشار صاحب کہنا بند کریں۔ میں صرف اعشار ہوں اور اگر آپ زیادہ تکلف برتنا چاہیں تو علی اعشار کہیں اور دوسری بات یہ کہ آپ یہاں صرف میری مہمان ہی نہیں بلکہ خاص مہمان کی حیثیت سے آئی ہیں۔ دیکھیں نیناں میں جانتا ہوں کہ آپ بہت الگ قسم کی لڑکی ہیں۔ بہت اسپیشل اور میں بھی مزاجاً بہت الگ سا بندہ ہوں۔ نینا اگر بات گھما پھرا کے نہیں کی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ میں آپ کے والدین سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اعشار نے بہت دھیمے بہت مدھم لہجے میں کہا۔

''میرے والدین سے۔'' وہ کچھ حیران سی ہوئی اس کی باتوں سے۔

''جی ہاں۔ میں آپ کو آپ کے والدین سے مانگنا چاہتا ہوں۔'' اس کا انداز خاصا اپنائیت بھرا تھا۔

''اعشار۔'' آواز گویا نیناں کے گلے میں رندھ گئی۔

''جب سے آپ کو دیکھا ہے۔ دل میں ایک ساتھی کی خواہش بہت شدت سے جاگی ہے۔ مجھے جس خاص ہستی کی تلاش تھی۔ آپ کو دیکھا تو یوں لگا کہ وہ تلاش آپ ہی تھیں۔ مجھے پتہ ہے کہ میں نے آپ کو خاصی حیرت میں مبتلا کر دیا ہے لیکن یہی سچ ہے۔'' وہ نیناں کے چہرے پر اپنی آنکھیں ٹکا کے بولا اور وہ اپنی آنکھیں اوپر اٹھا نہ پا رہی تھی۔ کتنا عجیب تھا یہ اچانک کیا ہوا انکشاف۔ تبھی اوپر ٹیرس پہ اک چھناکا سا ہوا کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ نیناں اور اعشار دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔

''نازو! مجھے نیچے جانے دو۔'' اوپر سے کسی عورت کے قدرے چیخنے کی آواز آئی اور اگلے ہی پل دروازے کے زور سے بند ہونے کی۔

''کس کی آواز ہے یہ؟'' نیناں کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔

''وہ ہماری کام والی ہے ناں نازو۔ اس کی بڑی بہن بیمار ہے تو میں نے علاج کے لیے اسے یہاں رکھا ہوا ہے۔ چند دن کے لیے۔ بیچاری بہت بری حالت میں ہے۔'' اعشار کے چہرے پہ اک رنگ سا آ گیا۔ نینا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اچھا اعشار میں چلتی ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔''

''آپ نے جواب نہیں دیا نیناں!'' وہ پھر اسی والہانہ پن سے بولا۔

''میری امی کو ہی اختیار ہے یہ باتیں طے کرنے کا۔'' یہ کہہ کے وہ رکی نہیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر شہیر کو بلانے چلی گئی۔

☆

''بہت ہی عجیب بندہ ہے وہ دوسری ہی ملاقات میں اس نے تم سے یہ سب کہہ دیا۔'' ردا سنتے ہی اچھل پڑی اور پریشان سی نیناں مزید گھبرا اٹھی۔

''دیکھا جائے تو اس نے کوئی غلط طریقہ نہیں اپنایا۔ بہت محتاط رویے میں اس نے مجھ سے اس بات کا اظہار کیا لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے اس سے یہ امید نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اتنا بڑا سنگر اسے کوئی بھی لڑکی مل سکتی ہے۔ اس کی چوائس نیناں علی ہی کیوں۔'' نیناں اپنا آپ شیئر کرتے ہوئے بولی۔

''لیکن نیناں! وہ مجھے خاصا سمجھدار لگ رہا ہے۔ مطلب یہ کہ بجائے اس نے تجھے پرپوز کرنے کے۔ دو تین سال تجھ سے محبت رچانے کے ڈائریکٹ تمہارے گھر والوں سے مل کے تمہیں مانگنے کی بات کی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ خاصا میچور ہے۔'' ردا نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

نیناں چپ ہی رہی۔

''دیکھو نیناں! تمہاری امی بھی تمہارے لیے کسی بہتر رشتے کی تلاش میں ہیں ہے ناں۔ تو کیا علی اعشار کا رشتہ بہتر نہیں ہو سکتا؟'' ردا کا سوال خاصا مشکل تھا۔

''ردا! یہی تو بات ہے۔ مسئلہ کہیں بھی نہیں۔ اعشار ہر طرح سے ایک بہتر انسان ہے اور میری امی بھی شاید بہت خوشی سے راضی ہو جائیں گی لیکن پتہ نہیں کیوں میرا اپنا دل کچھ عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہے۔'' نیناں کا انداز کچھ بجھا بجھا سا تھا۔

''کیا تم اعشار سے شادی نہیں کرنا چاہتیں یا پھر کوئی اور تمہیں پسند ہے؟ کہیں تم اس کے بارے میں پھیلی ہوئی افواہوں سے تو خوفزدہ نہیں اور اگر ہو تو میری یہ بات یاد رکھو کہ شوبز سے جڑی ہر ہستی اس طرح کی فلیش لائٹ کی زد میں ہمیشہ رہتی ہے۔'' ردا اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں ردا! اور انسان پرکھنے کی سمجھ بھی ہے مجھ میں۔ اعشار بہت اچھے انسان ہیں اور میرے پاس بھی اس رشتے سے انکار کا کوئی جواز نہیں لیکن میں پھر بھی بہت الجھی ہوئی ہوں۔ امی سے ڈسکس کروں گی میں آج یہ بات۔ پھر جو فیصلہ وہ کریں گی وہی مجھے منظور ہو گا۔'' نیناں نے بالآخر کچھ طے تو کر لیا۔ آفس سے گھر آئی تو لاؤنج میں ٹی وی پر اعشار ہی کی آواز اور چہرہ سجے ہوئے تھے اور ہما چوکڑی مارے چائے اور غزل دونوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

چن لیا میں نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا
پیار نہ کرنا یہ دل کہتا رہا۔ کہنے دیا۔

اعشار کی خوبصورت آواز نیناں کو اپنے حصار میں لے چکی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے دل میں بھی پہلی بار محبت کی کونپل پھوٹ چکی تھی اور وہ کونپل رہ رہ کے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھاگتی۔ خیالوں کی دنیا سے نکل کر کام میں پناہ لینا چاہتی لیکن کاغذوں کے بیچ سے بھی اعشار کی خوبصورت مسکراہٹ اسے نظر آ جاتی یا پھر سماعت سے اعشار کا کھنکتا ہوا لہجہ ٹکرا جاتا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ غزل اعشار نے اسی کے لیے گائی ہو۔ اسی کو یہ احساس دلانے

کے لیے کہ اعشار نے سارے جہاں کی لڑکیوں کی پروا نہیں کی بس اسے دیکھا اور اپنے لیے چن لیا۔

سچ یہ محبت کی کونپل یہ چاہت کا بیج کتنی خاموشی سے دلوں کی نم مٹی میں اگ آتا ہے کہ ہمیں خود بھی اس کے پھوٹنے کا پتا نہیں چلتا۔ پتا تو تب چلتا ہے کہ جب محبت کے نام کا اک تناور شجر ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور ہم اس کی چھاؤں تلے۔

امی اس کے منہ سے ساری روداد سن کر کچھ دیر تو خاموش رہیں۔ پھر مسکرا کے بولیں۔

''مجھے تو اس رشتے میں کوئی مضائقہ نہیں لگ رہا نیناں تمہاری کیا مرضی ہے اس بارے میں؟''

''امی! فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔ پھر میری مرضی کی کیا اہمیت ہے۔ ابو کے بعد آپ ہی تو ہمارا سب کچھ ہیں۔ مجھے وہ سب منظور ہے جو آپ چاہیں گی۔'' نیناں نے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ لیا۔

''مجھے تو لڑکا اچھا ہی لگ رہا ہے۔ شہیر بھی اس کی بہت تعریف کر رہا تھا اور پھر اس کا یہ سمجھ دارانہ انداز۔ یہ میچیورٹی نیناں اس کو کہہ دو کہ وہ کسی دن مجھ سے ملنے آ جائے اور اپنے خاندان والوں سے ملوائے۔''

''باقی تو سب ٹھیک ہے امی! لیکن ایک بات میرے دل کو بار بار کھٹک رہی ہے وہ یہ کہ کیا صرف دو تین ملاقاتوں سے کوئی انسان کسی کو سمجھ پاتا ہے یا پھر کیا زندگی بھر کے فیصلوں کے لیے اتنی جلد بازی ٹھیک ہوتی ہے؟'' نیناں کا خدشہ تھا تو درست۔ امی اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''بیٹا! کسی کو سمجھنے کے لیے وقت کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی دو انسان سالوں تک ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور پھر بھی ایک دوسرے کو جان نہیں پاتے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو جاننے کے لیے فقط چند ملاقاتیں بھی کافی ہوتی ہیں۔ تم ایک سمجھ دار لڑکی ہو نیناں! تمہیں میرے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ تم جتنا سوچنا چاہو سوچو اس رشتے پر اور پھر ذہن سے ہر خدشے کو نکال کے ہی کسی حتمی فیصلے پر پہنچو۔'' والدہ کی باتوں نے اس کے ذہن کو خاصا ریلیکس کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بستر تک آئی اور دیر تک اعشار کے بارے میں سوچتی رہی آنکھیں بند کرتے ہی اس کا چہرہ خواب بن کر نیناں کی آنکھوں میں تھا۔

*

''نیناں آپی! اگر آپ ڈسٹرب نہ ہوں تو میں میوزک لگا لوں۔ آج چھٹی کا دن ہے اور مجھے بوریت ہو رہی ہے۔'' ہما اسے کام میں مصروف دیکھ کر التجا کرنے لگی۔

''لگا لو۔ میں کوئی آرٹیکل تھوڑی لکھ رہی ہوں۔ درازیں ہی صاف کر رہی ہوں۔'' وہ مسکرا کے بولی۔

ہما نے اپنے بیڈ سائیڈ کی دراز کھولی اور ڈھیر سارے آڈیو کیسٹ خود ہی گر پڑے۔

''کیا لگاؤں آپی! ملکہ پکھراج کا راگ پہاڑی یا پھر علن فقیر۔'' ہما کی بات پہ نیناں ہنس پڑی۔

''اپنے ذوق کے مطابق ہی لگا لو جو بھی لگاؤ۔''

ہما نے ایک کیسٹ منتخب کیا اور اسے ٹیپ میں ڈال کر آن کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اعشار کی آواز ماحول میں گونجنے لگی۔

اس کی آنکھوں کو غزل بولوں' کنول بولوں یا تارے
جھیلوں سا وہ درپن ہے تو ساگر سے کنارے
اس کی آنکھوں کو......

''ہما تجھے کوئی اور سنگر نہیں ملتا سننے کے لیے۔'' پتہ نہیں کس خیال کے تحت نیناں نے یہ بات کہی تھی۔

''دیکھیں آپی! آپ کا سخت گیر پروفیشن اور تنقیدی نظر اپنی جگہ لیکن کم از کم علی اعشار کے بارے میں اتنی ناگواری سے بات نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' ہما مصنوعی خفگی سے بولی۔ نیناں مسکرا دی۔

شاید علی اعشار کے بارے میں سب کی یہ پسندیدگی خاصی اچھی لگی تھی۔ ہما تو قدرے اونچی آواز میں گانے لگا کے باہر صفائی کرنے چلی گئی اور اعشار کی آواز اس کے ہمراہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔

کیوں شام کے رنگوں میں شناسائی سی جھلکے
کیوں اس کی ہنسی جیسے لگیں چاند ستارے

غزل کے ان بولوں پہ نیناں چپکے سے مسکرا دی اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ تبھی چھوٹے سے ٹیبل پہ پڑا ٹیلی فون چلا اٹھا۔

''ہما! دیکھو کس کا فون ہے۔'' اس کا دل فون اٹھانے کو نہیں کر رہا تھا وہ تو بس اعشار کی خوب صورت آواز میں کھوئے رہنا چاہتی تھی۔ گھنٹی بجے جا رہی تھی اور ہما کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ مجبوراً اسی کو فون اٹھانا پڑا۔ جلدی میں اس نے ٹیپ کا والیم بھی کم نہ کیا تھا۔ ''ہیلو ہیلو۔''

''کون ہے۔'' دوسری طرف خاموشی تھی۔ نیناں کچھ پریشان سی ہوئی۔

''ہیلو'' اس نے آخری مرتبہ کہا۔

''نیناں! میں ہوں علی اعشار۔ معاف کیجیے گا' چپ رہنے کا مقصد آپ کو تنگ کرنا ہرگز نہ تھا۔ میں تو آپ کے عقب سے آتی ہوئی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ آواز میری ہی ہے۔''

اعشار کے لہجے میں خاصی اپنائیت تھی۔

''کیسے ہیں آپ! آج گھر پہ کیسے فون کیا۔'' نیناں کو پہلی مرتبہ اعشار کے فون نے حیرت میں نہیں بلکہ خوشی میں مبتلا کیا تھا۔

''چھٹی کے دن آپ دفتر میں تو مل نہیں سکتیں اور اس دن پارٹی کی بعد آپ سے کوئی بھی رابطہ نہیں ہوسکا۔کہیں آپ مجھ سے خفا تو نہیں۔''

''میں کیوں آپ سے خفا ہونے لگی۔''

''یہ تو سراسر خفگی سے بھرا جواب ہی ہوا۔''اعشار کے لہجے میں محبت تھی۔نیناں ہنس دی۔

''آپ نے اس دن والے سوال کا جواب نہیں دیا نیناں۔''

نیناں چپ ہی رہی۔

''اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہے کہ آپ مجھے جانتی نہیں ہیں تو میں آپ کو سوچنے کا اپنے اپ کو جاننے کا پورا موقع دوں گا۔آپ بے شک جلد بازی میں فیصلہ نہ کریں۔ملنا چاہیں تو ملیں۔بات کرنا چاہیں تو کریں اور اگر نہیں تو آپ کی مرضی لیکن میں آپ کو اپنانے میں بہت سنجیدہ ہوں۔زندگی کے تیس سال گزر جانے کے بعد اب مجھے اور میرے گھر کو آپ کی ضرورت ہے۔''اعشار کے پرتاثیر الفاظ نیناں کے دل پہ اثر کرنے لگے۔

''ایک بات پوچھنا چاہوں گی اعشار! آپ کی پسند عام سے چہرے' عام سی زندگی' رہن سہن اور عام سے خوابوں والی اک عام سی لڑکی ہی کیوں۔کیا آپ نے اپنے لیے پریوں سے سراپے والی اور گھر کی کھڑکی سے خوابوں والی برف نہیں چاہی؟ میں تو صرف آپ کو ایک پریکٹیکل لائف اور مکمل گھر ہی دے سکتی ہوں۔پتہ نہیں آپ کے خواب کس طرح کے ہوں گے؟''نیناں پہلی بار اعشار کے سامنے اپنا ڈر رکھنے لگی۔

''فکر مت کرو میرے خواب اتنے مہنگے نہیں۔میں نے جیون ساتھی کے روپ میں ہمیشہ ایک سیدھی سادی' عام سی لڑکی چاہی ہے۔جو گھر کی رسوئی کے اندر میرے لیے اچھے اچھے کھانے بنائے۔ٹھوڑی پہ اپنا چہرہ ٹکائے رات دیر تک میرا انتظار کرے اور جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی زبان سے میرا ہی نام نکلے۔''اعشار کا لفظ لفظ محبت میں ڈوبا تھا۔نیناں بے یقینی ظاہر کرتی بھی تو کیسے کہ اس کا روم روم سراپا صداقت تھا۔اس کے ہر انداز سے وفا چھلکتی نظر آتی تھی اور اس کی آنکھیں شفاف جھیلوں ایسی تھیں جہاں سے اس کی سچی محبت کا عکس واضح نظر آتا تھا۔

''پھر۔کیا میں آپ کے والدین سے ملنے آسکتا ہوں نیناں؟''وہ گویا منتظر تھا۔

''پہلے آپ میرے بارے میں سب کچھ جان تو لیں۔''وہ مسکرا کے بولی۔

''میں نے کوئی شرط تو نہیں رکھی۔تم جیسی ہو مجھے قبول ہو۔''اعشار کا اسے اس طرح سے اچانک تم کہنا ہی نیناں کو اچھا ہی لگا۔

''میرے ابو کی آج سے چار سال پہلے ڈیتھ ہوگئی تھی۔فیملی کے نام پر بس میری امی اور ماموں ہی

ہیں۔ان سے جب آپ ملنا چاہیں فون کر کے آجایئے گا۔''نیناں نے اسے رضامندی دے دی۔

''ایک بات بتاؤں نینا! تمہارے گھر کی تنہائیوں میں میری آواز سننا مجھے بہت اچھا لگا اور ابھی عقب میں جو میری غزل چل رہی ہے مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے یہ غزل دو سال پہلے میں نے تمہارے لیے ہی گائی تھی۔اس غزل میں تمہارے سوال کا جواب بھی ہے۔چن لیا میں نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا۔''اعشار بہت پیار سے بولا۔نیناں سمٹ سی گئی۔فون بند ہو چکا تھا لیکن ابھی تک اس کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں تھی۔

*

اعشار ایک بار امی سے ملنے ان کے گھر کیا آیا ہر کسی کو اپنا دیوانہ کر گیا۔ادھر امی اس کے گن گنواتے نہ تھکتی تھیں تو ادھر صوفیہ' شہیر اور ہما بات بات پر اس کا ذکر چھیڑ دیتے۔اصل بات کے پتہ چلنے کے بعد ہما اور شہیر کو تو بالکل بھی یقین نہ آیا تھا کہ واقعی وہ اپنے پسندیدہ سنگر کو اپنے ہی گھر کا فرد اور اتنا قریبی رشتہ دار بنانے والے ہیں۔اعشار اس بار نیناں کی والدہ سے رضامندی حاصل کرنے آیا تھا اور اگلی بار اپنے بھائیوں اور بھابیوں کو لانے کا کہا تھا۔اس ملاقات کے بعد امی بہت مطمئن تھیں اور ان کا اطمینان نیناں کے لیے باعثِ مسرت تھا۔اسے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے قدرت نے اچانک اس کے جسم سے پر باندھ دیے ہوں اور دور دور اونچائیوں تک آسمان کی وسعتوں تک کی پرواز اس کی منتظر ہو۔اس کے لیے اتنا اچھا جیون ساتھی جو کہ ہر طرح سے کامیاب ہو۔ایک خواب ہی تو تھا۔وہ اسی خواب میں پلکیں موندے اچھے دنوں کی نوید کی منتظر تھی۔اک ایسے ہمسفر کی محبت پانے جا رہی تھی وہ کہ جو بنا مانگے' بنا سوچے خود ہی اس کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا کے اندر آگیا ہو اور دل کے اندر اپنا گھر سمجھ کے اتنی مضبوطی سے بیٹھ گیا ہو کہ جیسے وہ کبھی اس گھر کے باہر تھا ہی نہیں اور آپ کی محبت اس دل کے دروازے پہ پہرے دار بن کر بیٹھ جاتی ہے کہ کہیں وہ مکین اس مکان سے چلا نہ جائے۔دل کی دنیا کہیں پھر سے بنجر نہ کر جائے۔

*

ان لوگوں کی آمد ہو چکی تھی ڈرائنگ روم میں چہل پہل کا سماں تھا۔شہیر' صوفیہ اور ہما باری باری ان سے مل آتے اور اندر کمرے میں بیٹھی نیناں کو ان کے متعلق آکر بتاتے اور وہ مسکرا کے رہ جاتی۔آنے والوں میں اعشار کی دو بھابیاں' ایک بہن اور دو بھائی تھے جو کہ اعشار کی شادی کے جلد سے جلد خواہاں تھے۔وہ سارے کے سارے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے اور انہیں اعشار کی تنہائی کا شدت سے احساس تھا۔نیناں ذہنی طور پر ان سے ملنے کو تیار تھی۔اس نے اپنا سب سے پسندیدہ کام والا جوڑا اور ہلکی پھلکی تیاری کر رکھی تھی لیکن کچھ دیر بعد امی ہاتھ میں ایک سوٹ اور زیوروں کا ایک سیٹ لے

آئیں۔

''یہ لو نیناں! ان لوگوں کی خواہش ہے کہ تم منگنی کی رسم کے لیے یہ جوڑا پہنو۔'' نازک سے کام والا سی گرین سلک آرگنزا کا بنا جوڑا امی کے ہاتھ میں تھا جسے اس نے خاموشی سے لے لیا اور تبدیل کرنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔ واپس آئی تو صوفیہ نے اسے ذرا ترتیب سے تیار کیا۔ جیولری پہنائی اور تازہ گجرے اس کے ہاتھوں میں ڈالے۔ کچھ ہی دیر میں امی اور صوفیہ اسے تھام کر ڈرائنگ روم تک لے آئے۔ اس کی آنکھیں گویا زمین میں گڑ گئی تھیں۔ اسے اعشار کے قریب ہی بٹھایا گیا ماحول میں ہلکی سرگوشیوں اور مسکراہٹوں کا احساس ہونے لگا۔ اعشار کی بھابیوں اور بہن کو نیناں پسند آ گئی تھی۔ سب کے چہروں پہ خوشی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اعشار کی بہن زارا اٹھی اور اعشار کے پاس آ کر بیٹھی۔ اس نے ایک نازک سی ڈائمنڈ رنگ تھامی اور نیناں کا ہاتھ پکڑ کر اس کی لمبی سی مخروطی انگلی میں جگمگانے کے لیے چھوڑ دی۔ اس لمحے کو اعشار کی بھابی نے الگ اور شہیر نے اپنے کیمرہ میں قید کر لیا۔ مبارک باد کا اک شور سا اٹھا۔ باری باری اعشار کی بھابیاں' بھائی اور بہن نیناں کے پاس آئے اور اسے تحفے اور دعائیں دے گئے۔

اعشار نے اس کے کان کے قدرے قریب آ کر سرگوشی کی۔

''میری دلہن آج بہت پیاری لگ رہی ہے۔'' اور نیناں اپنے آپ میں سمٹ کے رہ گئی۔ ساعتوں میں اعشار کا کھنکتا لہجہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے انگلی میں اس کا جگمگاتا نام تھا اور دور سے ہما کی چلائی ہوئی کیسٹ کا شور۔

برسات کا موسم۔ یہاں ہم وہاں تم
جبھی کو مل گئے ساجن۔ ساجن
تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے
کیا چیز ہو تم خود تمہیں معلوم نہیں ہے
فضا میں محبت کی مہک تھی اور ارد گرد خوابوں کے سوداگر۔

✻

''یہ کیا نیناں! منگنی کر لینے کے بعد بتا رہی ہو بھئی نہ کوئی اطلاع۔ اچانک ہی برفی اور گلاب جامن کا ڈبا پکڑا اور کہہ دیا کہ میں منگنی کر آئی ہوں۔'' قرۃ العین گلاب جامن مزے سے کھاتے ہوئے بولی۔

''ہاں تو آج کل سائنسی دور ہے۔ زیادہ تر حالات و واقعات اچانک ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ دفعتاً آپ کی آنکھیں تب کھلتی ہیں جب آپ کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کام ہو چکا ہے۔ دس ستمبر کو کسی کے

گمان میں بھی تھا کہ کل وہ سانحہ ہونے والا ہے فقط یہی معلوم تھا کہ وہ لوگ بس مجھے دیکھنے آئیں گے۔ منگنی کی رسم اور اس طرح کی فارمل منگنی کی پارٹی کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔'' نیناں اسے یقین دلاتے ہوئے بولی۔

''ویسے یار! تم صحیح کہتی ہو کہ دنیا کے اکثر واقعات اچانک ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اب دو ماہ پہلے تم علی اعشار کو فقط نام سے جانتی تھیں یا پھر اس کے گیتوں سے اور یاد ہے تم اس کا انٹرویو کرنے سے قبل بہت گھبرائی ہوئی تھیں پھر تم نے اس کا انٹرویو کیا۔ تم نے اسے اخبار میں چھاپا اور اس نے تمہیں اپنے دل میں اور دیکھتے ہی دیکھتے تم ہونے والی مسز نیناں اعشار بن گئیں۔'' ردا نے مسکرا کے ساری باتوں کو ریمائنڈ کیا۔

''ہاں بھئی اب ہمیں آپ کے آٹوگراف اور انٹرویو ابھی سے لے لینے چاہئیں ورنہ کل کو آپ کافی مہنگی ہو جائیں گی۔'' سارا نے اسے چھیڑا۔

''یہ صمد کدھر ہے۔ نظر نہیں آ رہا۔'' نیناں نے اس کی ٹیبل خالی دیکھ کر کہا۔

''سوچ رہا ہے باہر کوریڈور میں کھڑا کہ وہ تمہاری جگہ اسپیشل اسائنمنٹ والا کام لے لے۔ شاید اسے بھی کوئی اداکارہ پسند کر لے۔'' قرۃ العین کے کہنے پر سبھی مسکرا دیے۔ نیناں مٹھائی کا ڈبا اٹھائے کوریڈور میں آئی جہاں صمد گیلری سے ٹکا نیچے کی بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔

''یہاں پہ اس طرح کھڑے کس کے درشن کر رہے ہو صمد۔'' اتنے دنوں سے ساتھ کام کرتے کرتے اس کی صمد سے اچھی جان پہچان تھی۔ وہ اکثر اپنے کام میں اس سے مشورہ یا مدد لیا کرتی تھی۔ دیکھا جائے تو کولیگز میں وہی نیناں کے لیے دوستوں ایسا تھا۔ ردا تو بعد میں آئی تھی پہلے تو صمد ہی تھا۔

''بتاؤ گے بھی کہ نہیں یہاں اس طرح کیوں کھڑے ہو۔ وہاں سارے لوگ میری منگنی کی مٹھائی کھا کے انجوائے کر رہے ہیں اور تم ہو کہ یہاں بے وجہ کھڑے ہو۔'' وہ ناراض ہی ہوئی تھی۔

''نیناں! تم نے اپنی منگنی کے بارے میں بتایا بھی نہیں۔'' صمد کا لہجہ الجھا بکھرا سا تھا۔

''یہ سب کچھ میں اندر وضاحت سے سمجھا کے آئی ہوں کہ پرسوں تک خود مجھے بھی اپنی متوقع منگنی کی کچھ خبر نہ تھی۔ سبھی کچھ اچانک ہوا۔'' وہ صفائی دیتے ہوئے بولی۔

''نہیں نیناں! لڑکیوں کے بارے میں اس طرح کے فیصلے اچانک تو نہیں ہوتے۔ پہلے بات چیت ہوتی ہے۔ اطمینان قائم ہوتا ہے۔ ملاقاتیں آنا جانا ہوتا ہے اور پھر جا کے اس طرح کا کوئی فائنل فیصلہ ہوتا ہے۔ کیا تم نے یا تمہاری والدہ نے اس بارے میں سوچا نہ ہوگا۔ چھان بین نہیں کی ہوگی؟ یا فقط علی اعشار کا نام ہی کافی تھا تمہارے اطمینان کی لیے۔'' صمد انتہائی خفگی سے بولا۔

''نہیں صمد! میں نے اور امی نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہے۔ امی کے مطمئن ہونے کے بعد ہی

میں نے یہ اسٹینڈ لیا۔ فقط اعشار کے نام یا شہرت کی چکا چوند دیکھ کر نہیں رضامند ہوئی میں۔"

"لیکن نیناں! تمہیں ابھی اور سوچنا چاہیے تھا۔ آخر کو یہ تمہارے مستقبل کا فیصلہ ہے۔ اچھی طرح چھان بین کرنی چاہیے تھی۔ کیا تمہیں اعشار ہر زاویئے ہر رخ سے بیسٹ ہی لگا۔ کیا اس پر پوری کائنات ختم ہوگئی ہے؟" صمد بپھر ہی گیا تھا۔

"تمہارے اس طرح مجھ پہ چلانے کی وجہ کیا ہے صمد! اور اعشار کے بارے میں تمہیں آخر کیا بے یقینی ہے؟ اس کی شادی کی ایک افواہ کیا سامنے آئی تم تو اسے سچ سمجھ بیٹھے۔ ٹھیک ہے تم میرے دوست ہو، میرے خیر خواہ ہو لیکن میری زندگی کی اس خوشی پر تمہاری اس قدر ناراضگی آخر کیوں؟" نیناں کا لہجہ بھی اپنے آپ بگڑتا گیا۔

"وہ اس لیے مس نیناں علی! کہ تم مجھے جی جان سے زیادہ عزیز ہو۔ پچھلے پانچ سالوں سے میں نے صرف تمہیں ہی چاہا ہے، تمہیں اپنا لینے کی خواہش کی ہے۔ تم سے محبت کی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میری یہ پانچ سالہ محبت کی کوئی حیثیت نہیں کیوں کہ وہ پانچ دن کی محبت جیت چکی ہے جو علی اعشار نے تم سے کی ہے۔" صمد غصے میں کہتا ہوا کوریڈور پھلانگتا ہوا نیچے چلا گیا اور وہ اس کے اس قدر عجیب لہجے اور والہانہ اظہار پہ حیران و پریشان سی کھڑی رہی۔

☆

اپنے جذبوں کی بھنک جب تک آپ کسی شخص تک نہ پہنچائیں آپ کے احساسات بے معنی ہی رہتے ہیں۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں جہاں آدمی بھی مشین کی سی زندگی گزار رہا ہے اور مشینی حرکتیں سرانجام دے رہا ہے وہاں ہر نفس کو اپنی بات دوسرے تک پہنچانے کے لیے زبان ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ آپ کو دوسرا شخص کبھی سمجھ ہی نہیں پائے گا۔ پھر آپ کے احساسات آپ کے جذبات آپ ہی کے دل کی گھٹن اور پھانس بن کر زندگی بھر آپ کو چبھتے رہیں گے۔

نہ صرف رشتوں کو، آج کل کی محبتوں کو بھی اظہار نام کی لاٹھی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ لاٹھی نہیں تو آپ کی محبت لولی لنگڑی ہے۔ بے سروپا ہے۔

رسالے میں چھپا صمد کا آرٹیکل نیناں پڑھ رہی تھی اور اس کا لفظ لفظ اسے صمد کے دل کی کہانی کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ شخص جو ہر ماہ رسالے میں انسانی شخصیت کے متعلق اتنی اچھی باتیں لکھا کرتا تھا خود اس کی شخصیت کس قدر انتشار کا باعث بن چکی تھی۔ انجانے میں، بے خبری میں ہی صحیح لیکن یہ سب ہوا تو نیناں کے ہاتھوں تھا۔ وہ اپنے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر زور سے دبانے لگی۔

انجانے میں ہی سہی لیکن میں نے صمد کا دل دکھایا ہے۔

لیکن مجھے تو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ وہ مجھ سے......

لیکن کیا پانچ سال کے عرصے میں اس نے کبھی ضرورت نہیں محسوس کی مجھے کہنے کی۔

یا کیا وہ سمجھتا تھا کہ میں جانتی ہوں۔ سمجھتی ہوں اسے۔

کیا اس نے کہنے میں دیر کر دی یا میں نے اپنا فیصلہ جلد بازی میں کیا۔

کیا اعشار، صمد سے اچھا ساتھی ثابت ہو سکے گا؟

ہزاروں طرح کے سوالات اس کے گرد گھیرا کیے ہوئے تھے جن سوالوں کے جوابات اسے ڈھونڈے سے بھی نہیں مل پا رہے تھے۔ فون کی بجتی گھنٹی نے اسے گویا خیالوں کی دنیا سے جھنجھوڑا اور وہ اٹھی اور فون تک آئی۔

"ہماری شہزادی اداس کیوں ہے۔ کیا ہمیں مس کر رہی ہے؟" دوسری طرف بولنے والے کا انداز خاصا دلربا سا تھا۔

"اعشار! آپ۔" وہ چونکی۔

"کیوں۔ کسی اور کو سوچ رہی تھیں کیا؟ چاہے آپ جسے سوچیں ہمیں تو یہ الہام ہوگیا کہ ہماری پرنسس اداس ہے اس لیے ہم نے فوراً فون کر لیا۔ ویسے دو دن بعد میں دبئی جا رہا ہوں۔ کنسرٹ کے لیے۔ تین چار دن یا شاید ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔ اس لیے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تم کل میرے ساتھ لنچ کرو گی؟" اس نے اپنے مقصد کی بات کی۔

"کل۔" وہ بمشکل یہی بول پائی۔

"کیوں۔ کل کوئی پرابلم ہے کیا۔"

"نہیں۔ لیکن......" وہ جھجکی۔

"پوچھ لینا امی سے۔ کل ٹھیک ایک بجے میں تمہیں پک کرنے آجاؤں گا۔ او کے۔ ٹیک کیئر۔ خدا حافظ۔" فون بند ہو چکا تھا اور وہ ہونٹ کاٹ کر ہی رہ گئی۔

اعشار ٹھیک سوا ایک بجے ان کے فلیٹ کے باہر موجود تھا۔ وہ تقریباً تیار ہی تھی۔ اس کے آتے ہی نیناں نے اسکارف لیا اور اس کے ہمقدم ہو کے جانے لگی۔ امی دونوں کو اکٹھے دیکھ کر دل سے دعائیں دینے لگیں۔ ابھی وہ اپنے گھر سے نکلے ہی تھے کہ آس پاس کے بہت سارے بچے اور لڑکیاں اعشار کے اردگرد جمع ہوگئے اور اس سے آٹوگراف لینے لگے۔ وہ ایک ایک آٹوگراف دینے لگا۔ کاغذ پہ، لنچ باکس پہ اور ہاتھوں پہ۔ نیناں یہ سب دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔

"اب اگر ہماری زندگی میں آنا ہوگا تو یہ نخرے تو برداشت کرنے ہی پڑیں گے۔" اس نے مسکرا کے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہ خاموش ہی بیٹھی رہی۔ اعشار اس سے کتنی باتیں کرتا رہا ہنستا رہا مسکراتا رہا۔ اسے چھیڑتا رہا اور وہ اس کی ہر بات کا جواب بس ہوں ہاں اور مسکراہٹ سے ہی دیتی رہی۔ وہ

اس کی ہر بات' ہر ادا پہ غور کر رہی تھی۔ وہ اب اپنا دل ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اسٹیئرنگ وہیل کو بڑی ادا سے گھماتا وہ کچھ گنگناتا رہا تھا۔

''آپ کو پتہ ہے اعشار! آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔'' اس نے ڈیش بورڈ کھول کر کیسٹس دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ مجھے ویسے پتہ نہیں تھا۔ کبھی خود کو گاتے ہوئے سنا نہیں ناں۔'' اعشار شرارت سے مسکرا دیا۔ نیناں بھی مسکرائی۔

''اگر اجازت ہو تو کچھ گنگنا دوں۔''

''ضرور۔'' وہ اس کی طرف مکمل متوجہ ہوئی۔

''گنگنائی ہوائیں جھومیں ساری فضائیں
گھر کے آئیں گھٹائیں' سپنے ہی سپنے ہیں چھائے
تم آئے' تم آئے
دھڑکنوں پہ جو بندھن تھے سب کھل گئے
جسم و جاں پیار کی اوس میں دھل گئے
آرزو نے جو لی دل میں انگڑائیاں
جانے کیسے نشے سانس میں گھل گئے
رنگ سجنے لگے ہیں
گیت بجنے لگے ہیں
چھائے ہیں سپنوں کے سائے
تم آئے تم آئے''

اعشار کی دلربا آواز نیناں کی دھڑکنوں کو معطر کیے جا رہی تھی اور اس کے گیت دور فضاؤں میں گھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اسی طرح کے خوب صورت سفر کے بعد شیرٹن ہوٹل کے پارکنگ لاؤنج میں اس نے اپنی گاڑی کھڑی کی اور نیناں کو اپنے ہمراہ لے کر وہ اندر آیا۔ فائیو اسٹار کے زبردست ریسٹورنٹ میں بوفے لنچ کے بعد اعشار نے گاڑی اپنے گھر کی طرف موڑ دی۔

''یہ کیا آپ مجھے ڈراپ نہیں کریں گے میرے گھر تک۔'' وہ حیران ہوئی۔

''ضرور کروں گا لیکن پہلے میں اپنے گھر جاؤں گا وہاں ایک چیز بھول آیا' وہ تمہیں دوں گا ورنہ وہ چیز ایک ہفتے تک مزید تمہارا انتظار کرے گی کیوں کہ کل صبح چھ بجے کی فلائٹ سے میں دبئی جا رہا ہوں۔'' اعشار نے وضاحت کی۔

''مجھے مس کرو گی؟'' وہ پھر شوخ ہوا۔

''واپس کب آئیں گے؟''

''اس کا مطلب مجھے مس کرو گی۔'' وہ باتیں ہی ایسی کرتا تھا کہ نیناں سمٹ کے رہ جاتی۔ اس کے انداز میں نہ جانے کیا طلسمی رنگ تھا کہ وہ پل میں اپنا آپ کھوتی محسوس کرتی۔ گاڑی اعشار پیلس کے باہر آ کے تیزی سے ہارن دینے لگی۔ باوردی گارڈ نے دروازہ کھول کر اسے اور اعشار کو سلام کیا۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ اندر قدرے خاموشی تھی۔ شاید دوپہر کا وقت تھا اور سبھی سو رہے تھے۔ نازو کہیں سے بھاگتی ہوئی اس کی طرف آئی۔

''سلام صاحب! سلام بی بی جی!''

''نازو! تم بی بی جی کے لیے چائے بنواؤ میں ابھی آتا ہوں۔ او کے سویٹ ہارٹ۔'' وہ نیناں اور نازو دونوں سے بیک وقت کہتا سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔

''کیسی ہو نازو؟'' نیناں نے مسکرا کے اس سے پوچھا۔

''اچھی ہوں جی۔ بی بی جی آپ وہی ہیں ناں جی جو اخبار میں کام کرتی ہیں۔ صاحب کا انٹرویو لینے یہاں آئی تھیں؟'' نازو خاصے ڈرے ڈرے انداز میں بولی۔ اس کی نظر بار بار اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

''ہاں میں وہی ہوں۔ کیوں؟'' نیناں حیرت سے مسکرائی۔

''وہ بی بی جی! ہم کو تم سے بہت ضروری کام ہے۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''کام مجھ سے۔'' نیناں سراپا حیرت تھی۔

''ایک منٹ بی بی جی! میں ابھی آئی۔'' نازو بھاگتی ہوئی لاؤنج کو پھلانگ کر سیڑھیوں کے پیچھے چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں اسی بوکھلاہٹ سے باہر بھاگتی ہوئی آئی۔ آ کر اس نے ایک مٹھی میں بھنچی ہوئی پرچی نیناں کو پکڑائی۔ نیناں نے حیرت سے وہ لے لی اور اسے کھولنے لگی۔ چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر ٹوٹی پھوٹی اک تحریر تھی۔

''میری مدد کرو۔ مجھے بچا لو۔ ورنہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

''یہ کیا ہے نازو۔'' نیناں بولی۔

''بی بی جی! وہ عورت بہت مصیبت میں ہے۔ اسے صاحب نے ڈھائی سال سے قید کر رکھا ہے بی بی جی۔ یہ دیکھو خدا کے واسطے اسے یہاں سے نکالو ورنہ صاحب اسے مار ڈالے گا۔'' نازو ہاتھ جوڑ کر سرگوشی سے بولی اور نیناں سراپا حیرت بنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے نازو کی نم آنکھوں کو دیکھنے لگی۔

''کیسے مار ڈالے گا اعشار؟'' اس نے سوال کیا۔

''اپنی بیوی کو بی بی جی!'' وہ روتے روتے بولی۔ نیناں کے قدموں تلے تو گویا زمین نکل گئی۔

سیڑھیوں پہ قدموں کی چاپ ابھری۔ نازو بھاگ کے کچن کی طرف گئی۔ نیناں نے وہ رقعہ اپنے پرس میں ڈال دیا اور نارمل سی بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا نازو نے چائے نہیں پلائی؟'' وہ حیران ہوا۔

''نہیں اعشار! میں چائے زیادہ نہیں پیتی اور ویسے بھی میں بالکل فل ہوں۔'' اس نے بہانہ بنا لیا۔

''او کے ہنی! یہ لو۔ یہ تمہارے لیے ہے۔'' اس نے سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا چھوٹا سا پیکٹ اسے پکڑایا۔

وہاں سے ہو کے اعشار نیناں کو گھر تک چھوڑنے آیا۔ اعشار کے ساتھ واپسی کا یہ سفر نیناں کو خاصا دشوار لگا۔ نازو کا وہ ڈرا سہا لہجہ' پرچی پہ لکھی تحریر جو کہ بے بسی کی زندگی کی مثال تھی اور اعشار کا یہ بہترین انسان والا ڈرامہ۔ کیا واقعی یہ ڈرامہ تھا۔ وہ جو اعشار اسے دکھا رہا تھا
یا وہ جو نیناں دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

واپسی کے رستے میں اعشار نے اس کے اپ سیٹ موڈ کی طرف اشارہ بھی کیا لیکن وہ کچھ نہیں کہہ کر ٹال گئی۔ گھر آ کر اعشار نے اس سے ایک ہفتے کے لیے وداع کیا اور نیناں نے بھی زبردستی مسکرا کے اسے بھیجا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے پہلے اعشار کا دیا ہوا گفٹ کھولا۔

سنہرے رنگ کے میٹل فریم کے اندر سجی اک تصویر تھی جس میں اعشار بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا کے نیناں کی انگلی میں انگوٹھی ڈال رہا تھا اور نیناں دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ شرما رہی تھی۔ اچانک اس کے کانوں میں نازو کی خوفزدہ آواز ابھری۔

''وہ اپنی بیوی کو مار ڈالے گا بی بی جی اور اس آواز کی بازگشت کے ساتھ اس نے وہ تصویر بیڈ پر پھینک دی۔ گفٹ کے ساتھ چپکا چھوٹا سا کارڈ تھا جس پر لکھی تحریر یوں تھی۔

مجھے جو چاہے تو وہ زندگی سمجھ کے چاہے زندگی کا حصہ نہیں۔

اعشار

پل بھر کے لیے نیناں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے پرس میں ڈالی ہوئی وہ پرچی نکالی جو چلا چلا کے کسی مظلوم کے درد کی داستان کہہ رہی تھی۔

''مجھے بچالو۔ میری مدد کرو ورنہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

*

''صمد! صمد! میری بات سنو۔'' نیناں جو کتنی دیر سے کوریڈور میں کھڑی صمد ہی کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے ایڈیٹر کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس کی طرف دوڑی۔

''کیا ہوا نیناں! اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے صمد پلیز میری مدد کرو۔ مجھے تمہاری مدد کی بہت ضرورت ہے۔'' نیناں نے گھبراہٹ سے کہا۔

''کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ بھی۔'' وہ واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

''یہاں نہیں۔ چلو نیچے پارک میں بیٹھ کے بتاتی ہوں۔'' وہ اسے ساتھ لے کر نیچے پارک میں آئی۔ وہ دونوں اک بینچ پہ بیٹھ گئے۔

''صمد! میں بہت گھبرائی ہوئی ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔ کل میں اعشار کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ وہاں پہ اس کی ملازمہ نازو نے مجھے یہ چٹ دی اور کہا کہ صاحب اپنی بیوی کو مار ڈالے گا۔'' نیناں نے وہ چٹ صمد کو دکھائی۔ ''صمد مجھے لگتا ہے کہ کوئی عورت اعشار کی قید میں ہے لیکن کیوں' اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا۔''

''وجوہات تو ہزاروں ہو سکتی ہیں لیکن ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہمیں اس عورت تک پہنچنا ہے۔ مجھے لگتا ہے علی اعشار کی وہ ملازمہ جسے اس نے عورت پر نظر رکھنے کے لیے رکھا ہے وہ عورت اعشار کی نہیں اس عورت کی ہمدرد ہے اور اس عورت کو بچانا چاہتی ہے۔ نیناں! یہی عورت ہمیں پہنچا سکتی ہے اصل بات کی تہ تک۔'' صمد نے تمام بات کلیئر کی۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے صمد؟''

''علی اعشار کب گھر سے باہر ہوتا ہے اور اس کے گھر میں کون کون ہے؟'' صمد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''اعشار ایک ہفتے کے لیے دبئی چلا گیا ہے کسی کنسرٹ کے لیے اور اس کے گھر میں نازو کے علاوہ کوئی چار پانچ ملازم ہیں۔'' نیناں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''یہ لو میرا موبائل یہاں سے اعشار کے گھر فون نمبر ملاؤ اور نازو سے بات کرو۔'' صمد نے اسے اپنا سیل فون پکڑایا۔ نیناں نے اعشار کے گھر کے نمبرز پش کیے۔ چند گھنٹیوں کے بعد فون کسی عورت نے اٹھایا۔

''ہیلو۔ کون نازو!'' نیناں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''ہاں جی۔ آپ کون؟'' یقیناً نازو اسے پہچان نہ پائی تھی۔

''میں نیناں۔ اخباری رپورٹر۔ یہ بتاؤ تمہارے صاحب کہاں ہیں؟'' نیناں نے اپنا تعارف

کروایا۔ نازو کو سمجھانے کے لیے۔

''بی بی جی! آپ کسی طرح سے ادھر آ جاؤ۔'' وہ سرگوشی سے بولی۔

''گھر میں اور کون کون ہے ادھر؟''

''بی بی جی صاحب کی غیر موجودگی میں ڈرائیور تو چھٹی پر ہوتے ہیں کک دوپہر کو کھانا بنا کے چلا جاتا ہے۔ باقی چوکیدار اور شاویز صاحب ہوتے ہیں لیکن آپ فکر نہ کرو۔ آپ آج دوپہر کو آ جاؤ۔ میں سب سنبھال لوں گی۔'' نازو نے اسے اطمینان دلایا۔

''ٹھیک ہے میں تین بجے آ جاؤں گی۔ خیال رکھنا۔'' نیناں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

''صمد! وہ کہتی ہے کہ وہ سب سنبھال لے گی اور مجھے دوپہر کو آنے کو کہا ہے۔''

''تمہارا اکیلے جانا ٹھیک نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' صمد نے کہا اور نیناں نے گردن اثبات میں ہلا دی۔

دوپہر کے ٹھیک تین بجے وہ دونوں اعشار پیلس کے باہر تھے۔ اوپر گھر کے ٹیرس پہ کھڑی نازو شاید اسی کی منتظر تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر دوڑ کر نیچے آئی اور گیٹ کھول کر باہر آئی۔

''بی بی جی! وہ شاویز صاحب اپنے گھر میں سونے چلا گیا ہے۔ میں نے اس کے کمرے کو باہر سے لاک کر دیا ہے اور گل زمان خان کو چائے میں نیند کی گولی ملا کے پلا دی ہے اور کوئی یہاں نہیں۔ آپ آ جاؤ۔'' نازو نے اپنا کام کر دیا تھا۔ وہ نیناں کو ساتھ اندر لے کر آئی اور ہولے ہولے چوروں کی طرح قدم اٹھاتی لاؤنج عبور کر گئی پھر اسی دن کی طرح سیڑھیوں کے پیچھے جانے لگی۔ نیناں بھی اسی کے پیچھے پیچھے تھی۔ صمد البتہ باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہی طے پایا تھا۔ نیناں کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیڑھیوں کے نیچے اک دروازہ ہے اور دروازہ کھولتے ہی دوسری سیڑھیاں ہیں جو کہ نیچے تہ خانے نما جگہ میں جاتی ہیں۔ وہ دونوں سیڑھیاں عبور کر کے نیچے آ گئیں۔ نیچے اک نیم تاریک سا کمرہ تھا جہاں فرنیچر کے نام پہ ایک چارپائی تھی اور نیچے چٹائی بچھائی گئی تھی۔ اسی چٹائی پر زنجیروں میں جکڑا اک وجود تھا جو کہ پیٹھ دیوار کی طرف کیے لیٹا تھا۔

''بیگم صاحب! بیگم صاحب! اٹھو دیکھو یہ آ گئی ہیں۔'' نازو نے اس لیٹی عورت کو جھنجھوڑا۔ وہ اٹھی اور اس نے نیناں کی طرف دیکھا۔ نیناں بھی اسی کو دیکھ رہی تھی پل بھر کو نیناں حیران ہوئی۔

سانولی سی رنگت، کملایا وجود، لاغر سا جسم، میلے پھٹے کپڑوں میں موجود تھا۔ کیا وہ جانا پہچانا تھا۔ ہاں وہ نقش شناسا تھے۔ نیناں انہیں جانتی تھی۔

''دل آویز شاہ۔'' نیناں کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ وہ عورت اپنا نام سن کر حسرت و یاس لیے گردن اثبات میں ہلانے لگی۔

ہاں۔ یہ دل آویز شاہ تھی۔ وہ دل آویز شاہ جو کہ تین سال پہلے ہر ڈرامے، ہر پروگرام کی ضرورت تھی۔ جس کی کوئل جیسی آواز اور اپسراؤں سا چہرہ شوبز انڈسٹری پہ چھایا ہوا تھا، جو اپنی دلکش اداؤں اور نازک نین نقش سے چاہنے والوں کے دلوں کی ملکہ بن چکی تھی اور وہ دل آویز شاہ جس کی موت کی خبر نے ڈھائی سال پہلے کتنے دلوں کو منتشر کر دیا تھا۔

وہی دل آویز شاہ اس حال میں تھی۔

''نازو! باہر سے صمد کو بلا کے لاؤ ذرا۔'' نیناں نے نازو سے کہا اور جو حکم کی تعمیل کے لیے فوراً چلی گئی۔

''آپ کی..... آپ کی اس حالت کا ذمہ دار کون ہے دل آویز!'' نیناں بھی چٹائی پہ نیچے ہی بیٹھ گئی۔ دل آویز نے اک لمبی آہ بھری۔

''میری اس حالت کا ذمہ دار وہی شخص ہے جس پہ میں نے دنیا بھر کے لوگوں سے زیادہ اعتبار کیا، جس کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا، جسے زندگی سے زیادہ محبت کی۔ وہی شخص جس کے لیے میں نے ساری کشتیاں جلا دیں اور آج جس کے گھر کی کال کوٹھری میں مردوں جیسی زندگی گزار رہی ہوں اور اپنے جینے کے دن گن رہی ہوں۔'' دل آویز کا لہجہ کرب و اضطراب میں ڈوبا تھا اور آواز میں تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

''لیکن کیوں۔ کیا وجہ ہے کہ اعشار نے آپ کے ساتھ یہ سب کیا؟'' نیناں خود بے چین ہو گئی تھی۔

''کچھ غلطی قسمت کی ہوتی ہے اور کچھ قصور انسان کے دل کا کہ سارے کے سارے راستے کبھی کبھی بربادی کی طرف ہی جاتے ہیں۔ اعشار کے اس رویے کی وجہ ایک کروڑ سے بھی زیادہ دولت جو کہ میرے باپ ہی نے میرے نام کی تھی جس کے لیے اعشار نے مجھ سے شادی کی اور اپنی پراپرٹی اس کے نام کرا دینے کی مانگ کی جب میں نے صاف انکار کیا تو وہ تشدد پہ اتر آیا۔ جب میں پولیس کے پاس مدد کے لیے گئی تو اعشار نے مجھے اس کال کوٹھری میں زنجیروں کے سپرد کر کے میری موت کی خبر پھیلا دی جو کہ اس کے بیان کے مطابق میری کار کے پہاڑ سے کھائی میں گرنے کی وجہ سے ہوئی۔ کار تو میری کھائی میں گرائی گئی تھی لیکن اس میں، میں نہیں تھی۔ اعشار اور میری شادی پبلک میں ایکسپوز ہم نے نہیں کی تھی۔ دنیا کے سامنے ہم صرف دوست ہی تھے لیکن میرے ماں باپ ہم دونوں کی شادی کے خلاف تھے۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد وہ جائیداد میری ہے اور اعشار اسی پر قبضہ کرنا اور پھر مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے کیونکہ میرے پاپا کی وصیت کے مطابق اگر وہ جائیداد میں نہیں لیتی تو وہ یتیم خانوں میں تقسیم کی جائے گی اور میں اپنی زندگی بچانے کی خاطر ڈھائی سال سے پراپرٹی پیپرز پہ سائن کرنے سے انکار

کر رہی ہوں اور اعشار کا تشدد برداشت کر رہی ہوں۔'' دل آویز شاہ نے پوری کہانی سنا دی۔ صمد بھی آ چکا تھا اور نیناں کی طرح ہی حیران و پریشان بیٹھا وہ سن رہا تھا۔

''اس سفید پوش عمرو عیار کے چہرے سے نقاب ہٹا کے مجھے یہاں سے آزاد کرواؤ پلیز۔'' دل آویز شاہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

''آپ فکر نہ کریں ہم آپ کو یہاں سے آزاد کروا کے رہیں گے۔'' نیناں نے اسے تسلی دی۔

''ہاں لیکن ہمیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ اعشار اور اس کے آدمی بہت چالاک لگتے ہیں ورنہ ڈھائی سال سے ایک وجود کو اس طرح چھپائے رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔'' صمد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''کیا ہمیں پولیس کو انفارم کرنا چاہیے صمد!'' نیناں نے کہا۔

''ہاں لیکن پولیس ہر کارروائی سے پہلے ہر بات کا ثبوت مانگے گی۔ دل آویز کے قید ہونے کا سارے الزامات کا' اعشار کے رویے کا' صرف زبانی بیان پہ تو یقین نہیں کرے گی اور ہمیں پولیس کے لیے یہ ثبوت بنانے پڑیں گے۔'' صمد سوچ کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' نیناں حیران ہوئی۔

''مطلب میں تمہیں باہر جا کے سمجھاتا ہوں۔ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہم کل اسی وقت اس طرح یہاں آئیں گے اور دل آویز کا انٹرویو بمع تصاویر لیں گے اور بعد میں جو کرنا ہوگا وہ کر کے پولیس کی مدد سے ان کو آزاد کرائیں گے۔ آپ یہ میرا موبائل فون اپنے پاس رکھیں۔ ہم آپ سے رابطے میں رہنا چاہتے ہیں۔'' صمد نے اپنا سیل فون اسے پکڑایا۔

''اس کی بیل میں نے آف کر دی ہے۔ فون ہونے پر یہ لائٹ جلے گی۔ میں آپ کو اس نمبر سے فون کروں گا یا پھر یہ نیناں کے گھر کا نمبر ہے۔ صرف انہی نمبرز والی کال اٹھایئے گا اور اگر کوئی پرابلم ہو تو ہمیں فون کر دیجیے گا۔ او کے۔'' صمد نے ہر بات دل آویز کو سمجھائی اور اس سے اجازت لے کر نیناں کے ہمراہ واپس باہر آ گیا۔

دل آویز شاہ کا انٹرویو کر کے اور اس حالت میں تصاویر کھینچنے اور اس کو اپنے پاس محفوظ کر لینے کے بعد وہ دونوں اپنی اگلی پلاننگ پہ سوچ رہے تھے۔ دل آویز شاہ کے انٹرویو سے انہیں ایک اور بات بھی پتہ چلی تھی چونکہ دل آویز کا باپ عطاالحق نقوی اعشار اور دل آویز کی شادی کے خلاف تھا اسی لیے اعشار نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کروا دیا تھا لیکن اس قتل کا کوئی ثبوت اعشار کے خلاف نہیں جا سکتا۔ یہ بات خود اعشار ہی نے نیناں کو بتائی تھی۔ والد کے بعد دل آویز کی والدہ اور بھائی ہی تھے لیکن وہ کہاں تھے دل آویز کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ بیچاری تو بس کٹی پتنگ کی مانند آسمان کی

سفاک ہواؤں میں ڈولتی پھر رہی تھی جسے نہ اپنی سمت کا پتہ تھا اور نہ اپنی منزل کا۔ بس زندگی کے دن گھسیٹے جا رہی تھی اور اس بے درد لوگوں کی بستی میں اسے پہلے ہی چارہ گر تو ملے تھے۔ نیناں اور صمد۔ ان ناشناسا انسانوں کی ہمدردی ہی اب دل آویز کی کل کائنات تھی جس کے سہارے اسے امید کی چند کرنیں نظر آئی تھیں۔ جینے کے لیے اک ننھی سی موہوم سی آس بندھی تھی۔

☆

کوئی دیوار سے لگ کے بیٹھا رہا اور بھرتا رہا سسکیاں رات بھر
آج کی رات بھی چاند آیا نہیں راہ تکتی رہیں کھڑکیاں رات بھر
کوئی چہرہ کوئی روپ' آنچل کوئی سوچ کی وادیوں سے گزرتا رہا
میرے احساس کو گدگداتی رہیں رنگ و نور کی بجلیاں رات بھر
دائرے شوخ رنگوں کے بنتے رہے یاد آتی رہی وہ کلائی ہمیں
دل کے سنسان آنگن میں بجتی رہیں ریشمی شربتی چوڑیاں رات بھر

''اعشار ان دنوں نیا نیا گلوکار بنا تھا۔ شہر کی چھوٹی موٹی محفلوں میں گانے کے بعد وہ پہلی بار الیکٹرونک میڈیا تک پہنچ پایا تھا اور اس کی پہلی غزل ہی نے اس کی پہچان بطور ایک غزل گو سنگر کے کروا دی تھی۔ میری ملاقات بھی اس سے ٹی وی کے ایک میوزیکل شو میں ہوئی تھی جس کی کمپیئرنگ میں نے کی تھی۔ میں اس کی خوب صورت آواز اور عمدہ غزلوں کے چناؤ کی تو پہلے ہی سے معترف تھی اور اس کو سامنے دیکھ کر اس سے باتیں کر کے اس کی سحر انگیز شخصیت کی بھی گرویدہ بن گئی۔ اس کی گفتگو وہ جادوئی لب ولہجہ' اس کے وہ دلفریب انداز میرے چار سو اپنا سحر پھیلانے لگے اور میں جو اس گلیمر اور چکا چوند کی دنیا میں خود کو اور اپنے دل کو اتنے عرصے سے سنبھالے ہوئے تھی اعشار کے ملتے ہی اپنا دل کھو بیٹھی اور اس کے سحر میں جکڑتی گئی۔ وہ میرے لیے محبت کی راہیں بناتا گیا اور میں انہی منزلوں کے نشان کھوجتی چلتی گئی' چلتی گئی۔ تمام دنیا کو ٹھکرانا گوارا کیا میں نے۔ ہر کسی کو چھوڑنا قبول کیا میں نے۔ یہاں تک کہ میں اعشار کو یہ بھی کہتی تھی کہ تمہیں پا لینے کے بعد میں گلیمر کی اس دنیا سے اپنے روابط توڑ ڈالوں گی۔ صرف اور صرف تمہاری بن کے رہوں گی اور میری اس طرح کی باتوں پہ وہ اپنے مخصوص جادوگر لہجے میں کہتا۔

''دل آویز! مجھ سے اتنی محبت نہ کرو کہ میں اپنی ہر غزل' اپنے ہر گیت میں تمہارا ہی چہرہ بننے لگوں۔'' اور پھر وہ اکثر میرا ہاتھ پکڑ کے گنگناتا رہتا اور اس کے وہ گیت دور آسمانوں تک پھیلتے محسوس ہوتے۔

زندگی کے انہی خوب صورت دنوں میں ہم نے شادی کا ارادہ کیا لیکن یہ ارادہ میرے والدین کو

پسند نہ آیا۔ اعشار کا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا اور پھر مالی طور پر بھی وہ اتنا مستحکم نہ تھا کہ میرے والد جلدی مان جاتے۔ مجھے ان چیزوں کی کوئی فکر نہ تھی اول تو یہ کہ میرے ڈیڈی کی پراپرٹی پر جو کہ کروڑوں پہ محیط تھی میرا اور میرے بھائی جہانزیب کا برابر کا حصہ تھا۔ میرے حصے کی مالیت تقریباً ایک کروڑ بنتی تھی اور دوسرا یہ کہ میں نے شوبز کی دنیا سے اتنا کمایا تھا کہ کم از کم میرے سامنے اعشار کا سوشل اسٹیٹس کوئی ویلیو نہیں رکھتا تھا۔ میں اپنے والد سے بغاوت کرتی رہی اور اعشار کا ساتھ دیتی رہی پھر ایک دن میں نے اور اعشار نے کورٹ میرج کر لی لیکن اس بات کو میڈیا سے چھپائے رکھا۔ ہماری شادی کے دن ہی مجھے خبر ملی کہ میرے ڈیڈی کی ایک ٹریفک حادثے میں موت ہو گئی ہے جہاں میں ڈیڈی کی موت کو لے کر اداس تھی وہیں اعشار کو پانے کی خوشی سے سرشار بھی۔ کتنے دنوں تک میں ڈیڈی کے غم میں روئی' اعشار کی محبت نے تو مجھے ہر طرح کے غم بھلا دیے۔

ان دنوں میں ماما سے ملی۔ ماما جو کہ ایک طرف تو اعشار سے میری شادی پہ ناراض تھیں اور دوسری طرف اپنے شوہر کی موت کے غم میں گرفتار۔ کب تک مجھ سے ناراض رہتیں' آخر کار انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں ڈیڈی کی پراپرٹی ہم دونوں بہن بھائی میں تقسیم ہو گئی اور انہی دنوں اعشار کے رنگ بدلنے لگے۔ اس نے چالاکی سے اپنا اور میرا جوائنٹ اکاؤنٹ بنوا لیا تھا اور میری کمائی ہوئی تمام دولت پہ قبضہ کر چکا تھا۔ اب اس کی نظر ڈیڈی کی پراپرٹی پر تھی اور آہستہ آہستہ اس نے مجھے وہ پراپرٹی اسی کے نام ٹرانسفر کرنے پہ مجبور کرنا شروع کیا جب میں کسی طور نہ مانی تو اس نے مجھے قید کر لیا اور دنیا والوں کی نظر میں مجھے مار ڈالا تا کہ کوئی میری تلاش نہ کرے۔ میری کھوج نہ لگائے اور اس قید میں اس نے صرف مجھے موت نہیں دی ہر پل کی اذیتیں دی ہیں۔ پل پل کی گھٹن دی ہے' صعوبتیں دی ہیں۔''

دل آویز کی سسکیاں گونجیں تو نیناں نے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آف کر دیا۔ کتنا کرب تھا اس کی آواز میں۔ کتنی جلن تھی اس کے انگ انگ میں۔ اعشار جیسے بظاہر خوب صورت لگنے والے انسان کے اندر اتنی گندگی تھی جس کا تصور بھی کبھی نیناں کو نہ تھا۔ اس شخص نے اپنے اندر اس قدر سفاکیاں سمیٹ رکھی تھیں۔ اس قدر ظالم تھا وہ شخص۔ اوہ اعشار کیوں۔ کیوں۔ میں نے بھی تم پہ اعتبار کر لیا۔ کیوں کر نیناں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ تبھی فون کی بیل ہوئی۔ نیناں نے اپنے گالوں سے آنسو صاف کیے اور فون اٹھا لیا۔

''ہمیں معلوم تھا کہ آپ ہمارے بغیر بہت ہی اداس ہیں۔'' دوسری طرف سے اعشار کا کھنکھناتا لہجہ ابھرا۔

''کون...... اعشار!'' نیناں نے خود پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

''بس دو دنوں میں ہی میری آواز فراموش کر دی جناب نے اور ایک ہم ہیں پل پل آپ کی یاد میں سلگتے رہتے ہیں۔'' اعشار انتہائی محبت سے بولا۔

''کچھ لوگوں کو انسان کبھی بھی فراموش نہیں کر پاتا! آپ بھی انہی لوگوں میں سے ہیں اور پھر آپ نے تو میرے جیسی عام لڑکی کو ایک نیا مقصد دیا ہے۔ آپ کو کیسے بھولوں گی میں!'' لہجے میں انتہائی نفرت تھی ایسی نفرت کہ جسے اعشار سمجھ ہی نہ پایا اور انتہائی خوش گوار لہجے میں بولا۔

''تمہارے منہ سے اس طرح کے اظہار کے الفاظ سن کے بہت اچھا لگا۔ یہ بتاؤ جدائی زیادہ گراں تو نہیں گزر رہی۔''

''کب آئیں گے آپ!'' ایک سرسری سا سوال تھا۔

''بس صرف دو چار دن اور کچھ ضروری کام نمٹ جائیں پھر اپنی جان کے پاس اڑ کے چلا آؤں گا۔'' وہ کھلکھلایا۔

''مجھے بہت بے چینی سے انتظار رہے گا آپ کا۔'' نیناں کی آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔

''انتظار کرنا۔ جلدی آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اعشار نے فون رکھ دیا اور نیناں دیر تک اس مکروہ شخص کی پرفریب باتوں پہ آنسو بہاتی رہی۔

*

میں کرائم جرنلسٹ ہوں نیناں! میرے بہت سے لوگوں سے خفیہ رابطے بھی ہیں اور میری پہنچ محدود نہیں ہے۔ دشمن کو اسی کے جال میں پھنسا لینا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ دل آویز شاہ کا کیس بالکل بھی معمولی کیس نہیں ہے اور یہ بات تو یقینی ہے کہ جیسے ہی اعشار اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا وہ دل آویز کو قتل کر دیتا اور چونکہ دل آویز دنیا کی آنکھوں میں پہلے ہی مر چکی تھی تو اس قتل کا کوئی گواہ کوئی ثبوت نہ باقی رہتا۔'' صمد نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

''تم جانتی ہو نیناں! میرے ایک دوست ہیں انسپکٹر سرفراز! جن سے میں نے دل آویز شاہ کے والد عطاالحق کی موت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کچھ پرانے اخبارات بھی چھانے۔ میں اس معاملے کی چھان بین کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں نیناں کہ اعشار نے بہت چالاکی سے یہ مرڈر کیا ہے کیوں کہ پہلے گاڑی کو شہر سے باہر کسی ویران علاقے میں لے جایا گیا۔ وہاں پہ گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرائی اور تقریباً نیست و نابود ہو گئی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ عطاالحق نقوی کی لاش گاڑی کے باہر ملی تھی لیکن اس تمام قصے کو ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہی کہا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں اٹھا۔ دیکھا تم نے نیناں! اعشار نے کتنی چالاکی' کتنی پلاننگ سے یہ سب کچھ کیا۔''

صمد کی زبان سے یہ سب انکشافات سن کر نیناں کچھ دیر ساکت رہی۔ زمین پہ نظریں ٹکائے ہوئے

گویا اس اعتبار پہ پشیمان تھی جو اس نے اعشار پہ کیا تھا۔ اس احساس پہ پچھتا رہی تھی جو چند پلوں کے لیے ہی سہی اس کے دل میں اعشار کے لیے جاگا۔

''صمد! میرے پروردگار نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ مجھے وقت سے پہلے اس شخص کا اصلی چہرہ دکھا دیا۔ اس کے کردار' اس کی شخصیت سے اچھائی کی ساری چادریں نوچ کر اس کی اصلیت دکھا دی۔ اگر..... اگر میں اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی تو......؟'' نیناں کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی۔

''تم اپنے حوصلوں کو اس طرح پست کیوں ہونے دیتی ہو۔ کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ تم اس پاکھنڈ کو' اس چھلاوے کو پہچان گئیں۔ اس بہروپ کو سمجھ گئیں۔'' صمد اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔ لیکن پچھتاوا تو مجھے اس لمحے پہ ہوتا ہے کہ جب میں نے اس سے کوئی رشتہ جوڑا۔ اسے اپنی زندگی میں آنے کی اجازت دی۔'' وہ تڑپی۔

''پگلی! تم یہ یوں نہیں سوچتیں کہ اللہ نے تمہیں ایک بے کس ولاچار وجود کی مدد کے لیے بھیجا۔ اعشار کی زندگی میں اور اس کام کے لیے اللہ نے تمہیں چنا۔ تمہیں منتخب کیا اور تم بجائے پشیمان ہونے کے اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔ تم نے ایک برے انسان کو اس کی برائیوں کی سزا دلوانی ہے۔ تم نے ایک زندگی سے ہاری ہوئی عورت کو دوبارہ ملوانا ہے۔'' صمد کی پرتاثیر گفتگو نیناں کے دل میں اترنے لگی۔ وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔

''میں نے کسی طرح سے ایک ویڈیو کیمرہ حاصل کرلیا ہے جسے ہم اس کال کوٹھری میں فٹ کریں گے اور اعشار کے دل آویز کے ساتھ رویے کو ریکارڈ کریں گے اور پھر دل آویز کی آواز میں ریکارڈ انٹرویو اور تصویریں تو ہیں ہی۔ سرفراز اعشار کی گرفتاری میں مدد کرے گا اور پھر ہم میڈیا میں یہ بات پھیلا دیں گے۔'' صمد اسے مزید بتاتے ہوئے بولا۔

''پرسوں اعشار کو آجانا ہے اس سے پہلے کرنا ہوگا ہمیں سب۔''

''نیناں! میں کل وہاں جاؤں گا کیمرہ فٹ کرنے۔ دل آویز سے رابطے کے بعد اور پھر ہم اعشار کی آمد کا انتظار کریں گے۔ جب تک میں سرفراز کو سب کچھ بتا چکا ہوں گا اور ریکارڈنگ ملنے کے فوراً بعد ہی پولیس اسے حراست میں لے لے گی۔'' صمد کے لہجے میں بلا کا یقین تھا' ویسے بھی وہ کرائم جرنلسٹ تھا اور اس طرح کے کئی واقعات کو کوریج دے چکا تھا۔ وہ دونوں صحیح وقت کے منتظر تھے اور اپنی اپنی پلاننگ پہ عمل کرنے والے تھے۔

☆

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنا ہینڈ بیگ لاؤنج کے صوفے پہ پھینکا اور خود وہیں صوفے پہ ڈھے سی گئی۔ اندر ہما کے کمرے سے مسلسل قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہیر' صوفیہ اور ہما شاید کسی

سے بات کر رہے تھے اور کھلکھلا کے ہنس رہے تھے پھر تیز آواز میں ٹیپ کے چلنے کی آواز آئی لیکن وہ آواز اعشار کی تھی۔

غم جلاتا کسے کوئی بستی نہ تھی میرے چاروں طرف میرے دل کے سوا
میرے دل ہی پہ آ آ کے گرتی رہیں میرے احساس کی بجلیاں رات بھر

''کیا ہما! تم نے اعشار بھائی کا یہ سیڈ سانگ کیوں لگا دیا کوئی خوشی کا گانا لگاؤ نا'' صوفیہ چیخی۔

''اوہو۔ بچو آہستہ چلاؤ۔ اس طرح کے شور سے اوزون کی سطح پھٹ رہی ہے دنیا تباہی کی طرف جا رہی ہے۔'' امی کی ہلکی سی آواز ابھری اور امی کی اس بات پہ ایک بار پھر سب کا مشترکہ قہقہہ ابھرا۔

''نہیں امی! ہمیں خوش ہونے دیں ہمارے گھر کی پہلی خوشی ہے یہ۔ ابھی تو نیناں آپی کو آنے دیں ان کے ساتھ مل کے ہمیں اور شور مچانا ہے۔'' ہما کی آواز آئی۔

''پہلے تم گانا تو بمباسٹک لگاؤ'' شہیر چلایا۔ کچھ ہی دیر میں اک اور آواز ابھری۔

''کہندی اے سیاں میں تیری آں۔ اوئے''۔ جواد احمد بھی چیخ اٹھا۔

''ارے نہیں پاگل! وہ مہندی والا لگاؤ۔'' صوفیہ بولی۔ ماحول ایک بار پھر تبدیل ہوا۔

آئی مہندی کی یہ رات
لائی خوشیوں کی بارات
سجنیا ساجن کے ہے ساتھ
رہے ہاتھوں میں ایسے ہاتھ

نیناں اس قدر شور کی آواز سن کر اٹھی اور اس کمرے کی طرف آنے لگی۔ کمرے میں ماحول ہی عجیب سا تھا۔ بیڈ پہ جھلمل جوڑے بکھرے تھے۔ کرن والے' گوٹے والے دوپٹے۔ شہیر گلے میں دوپٹہ ڈالے ڈانس کے انداز میں ہاتھ اٹھا رہا تھا اور صوفیہ اور ہما باری باری کپڑے اٹھا کے دکھا رہی تھیں یہ سب دیکھ کر نیناں کے ذہن میں اک سوال کوندا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' لیکن وہ چپ چاپ دروازے پہ کھڑی رہی۔ تبھی ہما کی نظر اس پر پڑی۔

''ارے نیناں آپی آ گئیں''۔ ہما اور شہیر اسے دروازے سے اندر کھینچ لائے۔ ہما نے اک کرن والا دوپٹہ اٹھایا اور اسے اوڑھا کے اس کے گلے میں باہیں ڈال لیں۔ شہیر اب باقاعدہ جھومنے لگا تھا۔ امی اور صوفیہ بھی مسکرا رہی تھیں۔ تبھی نیناں کی نظر ٹیبل پہ سجے میٹل فریم پہ پڑی یہ وہی تصویر تھی جو اس دن اعشار نے اسے گفٹ کی تھی۔ وہ پہلے ٹیپ کی طرف دوڑی اور اسے آف کیا۔

''کیا ہے یہ سب۔ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ بے بسی سے چلائی دوپٹہ نوچ کے بیڈ پہ پھینک دیا۔

''پتہ ہے نیناں آپی! اعشار بھائی کا فون آیا تھا اور انہوں نے امی کے ساتھ مل کر یہ طے کرلیا ہے

کہ اگلے ماہ وہ آپ کو لے جائیں گے اور امی آپ کے جہیز کے کپڑے جو انہوں نے اب تک بنائے ہیں۔ ہمیں دکھا رہی ہیں۔'' ہما نے چہک کر کہا۔ نیناں نے دکھ اور کرب والی کیفیت سے ماں کو دیکھا جو مسکرا رہی تھیں۔

''چلے جاؤ۔ چلے جاؤ سب کے سب یہاں سے۔ ابھی دفع ہو جاؤ۔'' اس نے انگلی کے اشارے سے تینوں بہن بھائیوں کو کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ تینوں کی مسکراہٹیں تھم گئیں۔

''جاؤ یہاں سے۔'' وہ پھر چیخی۔ تینوں باری باری کمرے سے جانے لگے۔ امی اس کے اس رویے پر حیران سی تھیں۔ وہ بھی چپ چاپ بکھرے کپڑے سمیٹنے لگیں تو نیناں ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''امی! کیا ہے یہ۔ کیوں کی آپ نے شادی کے لیے ہاں؟'' وہ تڑپی۔

''بیٹا! اعشار نے فون کیا۔ شادی کی بات کی اور بچوں نے اسے سچ سمجھ لیا۔'' والدہ سہمے سے لہجے میں بولیں۔

''نام مت لیں اس شخص کا میرے سامنے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے اس کا مجھ سے اور یہ...... پھینک دیں یہ کپڑے' یہ دوپٹے۔'' وہ کپڑے اٹھا اٹھا کے واپس پٹخنے لگی۔

''لیکن ہوا کیا ہے نیناں! بتا تو...... کیوں تم اتنی مشتعل لگ رہی ہو۔ اعشار سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟''

''نفرت کرتی ہوں میں اس نام سے امی! گھن آتی ہے مجھے اس شخص کے تصور سے۔ دھوکے باز ہے وہ' فریبی ہے' جھوٹا ہے وہ! بھول جانا چاہتی ہوں میں اس کے وجود کو۔ اس کے نام کو۔'' غصے اور شدت جذبات سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''امی! ہم غلط تھے۔ ہم نے غلطی کی اس بہروپیے کو پہچاننے میں۔ وہ شخص...... وہ شخص...... شادی شدہ ہے امی! نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس نے اپنی بے قصور' بے بس بیوی کو قید کر کے ڈھائی سال سے اپنے گھر میں نیم مردہ حالت میں رکھا ہوا ہے۔ دل آویز شاہ جو ٹی وی پر اداکارہ تھی امی وہ مری نہیں اور وہ اعشار کے گھر ر اکال کوٹھری میں گم نام زندگی گزار رہی ہے۔ امی وہ شخص قاتل ہے' غنڈہ ہے' فریبی ہے۔'' وہ چلا چلا کے مین پر بیٹھ گئی۔ رو رو کے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ آنکھیں مسلسل بہنے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھیں اور کی حالت بھی اس سے کچھ الگ نہ تھی۔ یہ انکشاف ان کے لیے بھی باعث تکلیف تھا۔ وہ بھی بت بنی بیٹی کے لفظوں کی دلدل میں گھر چکی تھیں۔

روتے روتے نیناں کی نظر پھر اس میٹل فریم پر پڑی اور اس نے تیزی سے وہ اٹھایا اور زوردار طریقے سے دیوار پر دے مارا۔ تڑ...... تڑ تڑاخ ایک زوردار آواز سے فریم زمین پر گرا اور اس کا شیشہ کرچی کرچی ہو گیا۔ تصویر ابھی سالم تھی جسے نیناں نے ایک بار پھر اٹھا کے پھاڑا۔ ایک...... دو پھر چار۔ نہ جانے کتنے ٹکڑے کیے اور اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ امی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ نیناں

جب سب کچھ کر کے تھک چکی تو بیڈ پر اوندھی ہو کے گر گئی۔

''اگر تمہیں اتنے دنوں سے اس چیز کا احساس تھا نیناں! یا علم تھا تو تم نے مجھے بتانے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی۔'' شام کو امی اس کے لیے چائے اور ساتھ میں ڈسپرین کی ٹیبلٹ لے آئی تھیں اور انتہائی محبت سے اس سے مخاطب تھیں۔

''پتہ نہیں امی! میں نے آپ کو کیوں نہیں بتایا؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں آپ کو وقت آنے سے پہلے پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ میرے لیے آپ لوگوں کا دکھ اپنے دکھ سے زیادہ بڑھ کر ہے۔'' نیناں بہت دھیمے لہجے میں بولی۔

''تم نے ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا نیناں کہ مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہو سکتی ہے کہ میری بچی ایک درندہ صفت انسان کے جال میں پھنسنے سے بچ گئی ہے۔

نیناں! تمہاری ماں نے زندگی میں بہت صدمے برداشت کیے ہیں۔ بہت دکھ جھیلے ہیں اور میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گی کہ میری بیٹی اس طرح کے کسی بھی صدمے سے گزرے۔ خدا نے ہمیں بروقت صحیح فیصلہ کرنے کا موقع دیا ہے میری بچی! اب خدا کے لیے اس شخص سے اپنا پیچھا چھڑا لو۔ کوئی ضرورت نہیں اسے پولیس میں گھسیٹنے کی۔ چلو ہم ایبٹ آباد چلتے ہیں تمہارے ماموں کے پاس' پھر کبھی ہم اس شہر میں واپس نہیں آئیں گے۔'' والدہ کے لہجے سے ان کا ڈر اور خوف بیٹی کے متعلق ظاہر تھا۔

''امی! یہ آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کیوں کہ نیناں آپ کی بیٹی ہے' لیکن اگر آپ دل آویز شاہ کو اپنی بیٹی کی جگہ رکھ کر دیکھیں' دو پل کے لیے یہ سوچیں کہ جو دل آویز شاہ کے ساتھ ہوا ہے وہ سب کچھ آپ کی نیناں یا صوفیہ یا ہما کے ساتھ ہوا ہو تو کیا آپ اس شخص کو اس طرح چھوڑ کر جانا چاہیں گی اور پھر کس کو پتہ ہے امی کہ کل کو وہ شخص مجھ سے شادی کر کے میرے ساتھ بھی وہی کرتا جو اب دل آویز کے ساتھ کر رہا ہے تو کیا امی آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ کے کہیں جا سکتی تھیں۔ بولی امی! کیا آپ ایسا کرتیں؟ دل آویز بھی تو کسی کی بیٹی ہے امی! اس کی والدہ زندہ ہیں امی! لیکن اس بے چاری کو یہ علم ہی نہیں کہ اس کی بیٹی کس حال میں ہے۔ اس کی بیٹی پل پل کس اذیت کو جھیل رہی ہے۔ پل پل وہ کس موت کا مقابلہ کر رہی ہے امی! اعشار نے اس کی والدہ اور بھائی کو اس قدر ڈرایا دھمکایا کہ وہ لوگ اپنے گھر بار اپنی بیٹی کی پراپرٹی تک چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ چلے گئے۔ بولیں امی! کیا اس مظلوم کے لیے لڑنا غلط ہے جس کے باپ کو قتل کر دیا گیا ہو' جسے دنیا کی نظر میں مار کر اس پر تشدد کیا گیا ہو۔ جیسے جیتے جی اس کے بھائی سے' ماں سے' خونی رشتوں سے الگ کیا گیا ہو۔ بولیں امی......! بولیں؟'' نیناں امی کو جھنجھوڑنے لگی اور وہ جو ساکت و جامد سی اس کی باتیں سن رہی تھیں پل میں ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''نہیں نینا! اس بچی کو انصاف دلواؤ نیناں! اس نے بہت اذیتیں برداشت کر لی ہیں۔ اسے آزاد

کرواؤ۔'' والدہ کا لہجہ محبت سے لبریز تھا جس سے نیناں کا حوصلہ کہیں زیادہ بلند ہو گیا۔

✻

صبح سویرے بجنے والی فون کی گھنٹی نے اسے چونکا ہی دیا تھا۔ چوتھی پانچویں بیل پر اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف صمد تھا۔

''ہیلو نینا! کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔''

''میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا نیناں! کہ علی اعشار کل رات واپس آ گیا ہے۔ وہ یقیناً آج ہی تم سے رابطے کی کوشش بھی کرے گا اور دل آویز شاہ کے پاس بھی جائے گا۔ اس کال کوٹھری میں تو میں ویڈیو کیمرا لگا آیا ہوں اور موبائل پر میں دل آویز شاہ سے رابطے میں بھی رہوں گا اور انشاء اللہ بہت جلد میں انسپکٹر سرفراز کے ساتھ علی اعشار کو گرفتار بھی کر لوں گا۔'' صمد کا لہجہ پرعزم تھا۔

''صمد! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھ میں اس انسان سے بات کرنے کی ہمت ہے اور نہ شوق۔''

''ارے پاگل! اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ مت بھولو کہ اس جنگ کی شروعات ہم نے کی ہیں اور کسی نیک مقصد کے لیے کی ہیں اور پھر ظلم کو ختم کرنا بھی تو ثواب ہی کا کام ہے۔ بس تم ہمت نہ ہارو اور ہاں اگر اس کا فون آتا ہے تو اسے کچھ بھی محسوس مت ہونے دو۔ نارمل ہی رہو۔ او کے میں پھر تم سے بات کروں گا۔''

صمد نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا اور نیناں اپنے اندر کے خوف کو فنا کر دینے کی کوشش کرنے لگی۔

✻

''سائن کرو ان کاغذات پر۔ میں کہتا ہوں سائن کرو ان پر۔'' اعشار کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس کے اندر دل آویز کے والد کی تمام پراپرٹی کے پیپر تھے۔

''نہیں کروں گی۔ مرتے دم تک نہیں کروں گی۔ گلے پر چھری پھیرو گے تب بھی نہیں کروں گی۔'' دل آویز چلائی۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔ دو سال سے جانوروں سے بھی بدتر زندگی دی ہے تجھے! اور تجھے پھر بھی عقل نہیں آئی۔ موت تو تیرا مقدر ہے ہی۔ چاہے تو آج مرے چاہے کل۔ تمہاری زندگی کی طرف ایک ہی راستہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم یہ پراپرٹی میرے نام کر دو۔ بخش دوں گا تجھے! چھوڑ دوں گا۔'' اعشار نے دل آویز کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور پھر چھوڑ دیا۔

''بخشنے والا خدا ہوتا ہے اعشار اور تم خدا نہیں۔ تم اگر مجھے مار سکتے ناں اعشار تو کب کا مار چکے ہوتے۔ تم تو مجھے دنیا والوں کی نظروں میں مار کر بھی نہ مار سکے۔ پتہ ہے کیوں؟ اس لیے کہ میرا بچانے

والا رب تم سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔'' دل آویز سسک سسک کر بولی لیکن اس بار اس کی سسکیوں میں مجبوری یا بے بسی نہیں اک اعتبار تھا۔ اک یقین تھا۔ اپنے خدا کے اوپر۔ اس ایک بچانے والے کے اوپر۔

''دل آویز! اپنی اسی ضد کی وجہ سے تم نے اپنے باپ کو مروا دیا۔ اب کیا چاہتی ہو کہ تمہاری وجہ سے تمہارا بھائی اور ماں بھی مریں۔'' اعشار نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

''سائن کرو ان پیپرز پر ورنہ...... ورنہ آج میں...... آج میں تمہیں واقعی جان سے مار ڈالوں گا۔'' اعشار نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور دل آویز کی گردن پر رکھ دیا۔

''مار ڈالو اعشار! مار ڈالو۔ دباؤ ٹریگر۔ میرے مرجانے سے کسی کو فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن تمہیں نقصان ضرور ہو گا۔ مارو...... میں کہتی ہوں مارو مجھے!'' دل آویز نے پستول والا ہاتھ کھینچ کر اپنی گردن کے قریب کر لیا۔ اعشار اس کی یہ دیوانگی دیکھ کر بوکھلا گیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''چلاؤ گولی...... اعشار...... میں منتظر ہوں۔ میری سانسیں منتظر ہیں۔'' دل آویز رونے لگی۔ روتے روتے وہ زمین پر جھکتی ہی چلی گئی اور اعشار نے اپنی ٹانگ سے اسے اک زوردار ٹھوکر ماری اور دل آویز کا لاغر جسم دور کمرے کی تاریکی میں جا پڑا۔

''گن لو اپنی سانسیں کم ظرف عورت! گن لو...... اگر کل صبح تک تم نے میرے لیے ان پیپرز پر سائن نہیں کیے تو واقعی تم ماری جاؤ گی اور یاد رکھو اس بار میرے ہاتھ رکیں گے نہیں۔ رکیں گے نہیں میرے ہاتھ۔'' یہ کہہ کر اعشار نے اپنے کوٹ اور بالوں کو درست کیا اور کال کوٹھری کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا اور اس کے پیچھے ایک مظلوم، خاموش سا وجود آنسو بہاتا رہ گیا۔

✻

''کیا ہوا صمد! تم خاموش کیوں ہو۔'' کیفے ٹیریا کی ٹیبل پر اپنے سامنے بیٹھے صمد کو گم صم دیکھ کر نیناں بولی۔

''دل آویز سے بات ہوئی ہے میری کچھ دیر پہلے۔ آنے کو کہا ہے اس نے اور تو کچھ بھی نہیں کہا لیکن اس کی کانپتی آواز اس پر بیتے حالات کی ترجمان تھی۔ کتنا کچھ برداشت کیا ہے ناں اس نے اپنے آپ پر نیناں۔ کن حالات میں سانسیں لی ہیں اس نے۔ وہ بھی تو کسی کی بہن ہو گی، کسی کی بیٹی۔ اگر میری بہن اس کی جگہ ہوتی تو......'' اور اس سے آگے سوچتے ہوئے صمد خاموش ہو گیا۔ اس کا دل لرز اٹھا۔

''ہاں صمد! یہی سوچ تو ہمدردی اور انسانیت کو دل سے مٹنے نہیں دیتی ہے کہ جو ظلم کوئی اور برداشت کر رہا ہے اگر وہ ہمارے کسی اپنے پہ ہوتا۔ کسی ایسی پہ جو ہمیں بہت ہی پیارا ہو۔ ہم دوسروں پہ ہوتا ظلم

چپ چاپ دیکھ لیتے ہیں لیکن اگر ہمارے پیاروں پر ظلم ہوتا تو کیا ہم دیکھ پاتے اور دیکھ کر کیا جی پاتے۔ امی کو بھی اس دن میں یہی سمجھا رہی تھی کہ اگر دل آویز کی جگہ میں صوفیہ یا ہما ہوتیں تو وہ کیا محسوس کرتیں۔ بہت برا ہوا ہے اس بے چاری کے ساتھ اور اتنا سب کچھ کر لینے کے بعد اعشار جیسا وحشی درندہ کھلے عام گھوم رہا ہے۔'' نیناں کی آنکھوں میں اعشار کا نام آتے ہی نفرت کے سائے لہرائے۔

''میرا خیال ہے ہمیں آج ہی پولیس کو لے کر اعشار کے گھر جانا چاہیے اور وہ ٹیپ حاصل کر لینی چاہیے۔ دل آویز شاہ کو تحفظ دلا کے پھر پولیس جو کارروائی اعشار کے ساتھ کرے سو کرے۔'' صمد نے کہا تبھی پیون ان کی ٹیبل کے نزدیک آیا۔

''نیناں بی بی! آپ کا فون ہے۔'' اس کے یہ کہنے پر نیناں چونک پڑی۔

''نیناں اگر اعشار کا فون ہو تو پلیز اس سے ٹھیک سے بات کرنا۔ تمہاری کسی بات سے اس کو اندازہ نہ ہو کہ کچھ گڑبڑ ہے۔'' صمد نے اسے سمجھایا اور وہ بھاری بھاری قدموں کے ساتھ ٹیلی فون سننے کے لیے جانے لگی۔

واپسی پر اس کا چہرہ مزید اترا اترا سا تھا۔ صمد نے اس کے اترے چہرے سے کچھ اندازہ لگانا چاہا۔

''اعشار ہی کا فون تھا۔ وہ آج لنچ ٹائم میں مجھ سے ملنے آرہا ہے۔'' نیناں کے یہ کہنے پر صمد کچھ دیر خاموش رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''پرفیکٹ نیناں! بالکل پرفیکٹ۔ اعشار تم سے ملنے یہاں آئے گا اور اس کے پیچھے میں پولیس اور انسپکٹر سرفراز کے ہمراہ اس کے گھر پہ چھاپا پڑواؤں گا۔ دل آویز اور وہ ٹیپ لے کر اس کے وفاداروں کو گرفتار کروا دوں گا اور وہیں پہ تمہارا انتظار کروں گا اور تم اعشار کو کھانے کے بعد وہیں لے آؤ گی اور پھر اس طرح ہم اسے گرفتار کروالیں گے۔'' صمد سارا کا سارا پلان بنا کر بولا۔

''کیا یہ سب کچھ اتنا آسان ہے صمد!'' نیناں کے دل میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔

''ہاں نیناں! یہ بالکل صحیح وقت ہے وار کرنے کا۔ یقین کرو میرا۔ اس سے آسان راستہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بس تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' اس شخص کے پرعزم لہجے میں وہ تاثیر تھی کہ نیناں پل میں تمام خدشے بھلا بیٹھی اور اس انسانیت پسند شخص کی باتوں پر یقین کرنے لگی۔

☆

''آج تم کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔ میں جو اتنے دنوں سے تم سے ملنے کا انتظار کر رہا تھا دبئی سے یہاں تک فلائٹ میں تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔ تمہارے لیے شاپنگ کی اور تم...... تم نے مجھ سے فون پہ بات تک نہ کی۔ تمہارے گھر فون کیا تو روکھے سوکھے لہجے میں صوفیہ نے کہہ دیا کہ باجی

گھر پر نہیں ہیں۔'' اعشار اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے انتہائی محبت سے بولا۔

''شکایتیں صرف آپ ہی کو ہو سکتی ہیں۔ مجھے نہیں۔ گنوانے بیٹھوں تو جیت جاؤں۔'' نیناں کو اس شخص سے کراہیت ہو رہی تھی۔ اس کے لیے یہ ڈرامہ کرنا انتہائی دشوار ہو رہا تھا۔

''اب سمجھا۔ ناراض ہو۔ زیادہ دن لگا دیے اس لیے۔'' اس کے اس سوال پر نیناں خاموش ہی رہی۔ اپنے آپ پہ ضبط مشکل ہو رہا تھا۔

''ہم بہت جلد اک بہت خوب صورت رشتے میں بندھنے والے ہیں نیناں! اک بہت انمول رشتہ۔ اک گھر' اک فیملی اور ہم دونوں۔ کتنی خواب ناک ہو جائے گی زندگی۔'' اعشار اپنی ہی دھن میں مگن بولا۔

''بہت مہنگے خواب مت دیکھا کرو اعشار! خواب ہمیشہ اپنی آنکھوں جتنے ہی دیکھنے چاہئیں۔'' وہ ذو معنی انداز میں بولی اور اعشار مسکرا دیا۔

''نہیں ناں۔ تم میرے لیے ایک سہانا یا مہنگا خواب نہیں اک اچھی سی حقیقت ہو جس پہ میں اپنی تقدیر کا بہت شکر گزار ہوں۔''

''ہم لوگ تقدیر کو ہمیشہ اپنی مٹھیوں میں کیوں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں اعشار! تقدیر کی چالیں الٹی بھی تو پڑ سکتی ہیں۔'' نیناں کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا۔

''جان اعشار! یوں اس طرح مایوسی کی باتیں تو مت کرو اور اچھے دنوں کے اچھے سپنے دیکھو۔ منزل ہمارے بہت قریب ہے۔'' وہ یقین سے بولا۔

''ہاں اعشار! منزل ہمارے بہت ہی قریب ہے۔'' نیناں بھی مسکرا دی کیوں کہ وہ چیز جس کا علم نیناں کو تھا اعشار اس سے بے خبر تھا۔ وہ جانتا ہی نہ تھا کہ جو چالیں وہ بہت عرصے سے سمجھ داری سے کھیلتا آیا ہے وہ بدل بھی سکتی ہیں۔ گھوڑا' فیل' وزیر' پیادے' کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتے ہیں۔

☆

انسپکٹر سرفراز اور اس کے سپاہی جاری شدہ وارنٹ کے ساتھ ''اعشار پیلس'' پر چھاپا مار چکے تھے اور اس کے ساتھ دو وفاداروں جن میں شاہ ویز اور چوکی دار شامل تھے کو گرفتار کر لیا۔ دل آویز شاہ کو تحفظ دے کر پولیس اسٹیشن روانہ کر دیا۔ ویڈیو کیسٹ نکالی اور ساتھ ہی اعشار کے کمرے سے پراپرٹی کے کاغذات اور کچھ اسلحہ بھی برآمد ہوا۔ اب اعشار ہی کا انتظار تھا جسے پلان کے مطابق نیناں کو اپنے ساتھ اسی کے گھر لے آنا تھا۔

ایک گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد اعشار اپنی گاڑی پہ نیناں کے ہمراہ گیٹ کے اندر داخل ہوا اور سپاہیوں نے گیٹ بند کر دیا۔ اعشار کے چہرے پر حیرانی اور پریشانی کے سائے لہرا گئے۔ وہ جیسے ہی

گاڑی سے اترا تو انسپکٹر سرفراز نے اسے پکڑا۔

''یو آر انڈر اریسٹ مسٹر اعشار! آپ پر قتل اور تشدد کا کیس ہے اور میرے پاس وارنٹ ہے۔''

اعشار کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگ گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو نیناں؟'' صمد نیناں کے قریب آیا۔ نیناں نے گردن اثبات میں ہلا دی اور علی اعشار کی حیرت کی انتہا نہ رہی یعنی...... یعنی نیناں بھی شامل تھی اسے پکڑوانے میں۔ اس کے راز فاش کروانے میں۔ وہ انتہائی غصے کی حد تک پہنچ کر نیناں کو دیکھنے لگا۔

''دل آویز تو ٹھیک ہے ناں صمد!'' نیناں نے نم ناک لہجے میں صمد سے پوچھا۔

''ہاں۔ انہیں تحفظ میں لے لیا گیا ہے۔'' صمد بولا۔

اعشار کو پولیس وین میں بٹھا کر لے جایا گیا اور اس پر دوہرے کیس چلائے گئے۔ اس کے خلاف بیانات بھی لکھے گئے جن میں ناز، نیناں، صمد اور اس کے وفادار سبھی کے بیان تھے اور دل آویز کے ساتھ زیادتی کا منہ بولتا ثبوت وہ وڈیو کیسٹ تو ٹھوس ثبوت تھا۔

اگلے دن سے تمام اخبارات، رسائل اور الیکٹرونک میڈیا میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دل آویز کا انٹرویو اور تصاویر چھاپی گئیں۔ صمد اور نیناں کے انٹرویوز چھپے اور اس طرح اتنے عرصے سے راز رہنے والی یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی۔ کئی جگہ اعشار کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اسے کورٹ تک پہنچایا گیا۔

کورٹ نے دل آویز شاہ کو بمع اس کی تمام پراپرٹی کے باعزت تحفظ کے ساتھ روانہ کر دیا اور اس کے والد عطاالحق نقوی کے کیس کو چلایا گیا اور ثبوتوں اور گواہوں کے پیشِ نظر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اعشار نے ہی یہ قتل کیا تھا اور اس طرح اسے سزائے موت ہو گئی۔

دل آویز کچھ دن تو نیناں کے گھر رہی لیکن ایک ہی ہفتے کے اندر اندر اس کی والدہ اور بھائی اسے لینے آ گئے۔ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے یہ بات ان تک بھی پہنچ گئی کہ ان کی بیٹی کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے اور کس طرح انہیں پل پل کی موت دی گئی ہے۔ وہ نیناں اور صمد کے شکر گزار تھے کہ ان دونوں نے اتنی بہادری اور سمجھ داری سے ان کی بیٹی کی زندگی بچائی اور اس ظالم کے ظلم کو فنا کر دیا۔ وہ دونوں دل آویز کو لے کر ہمیشہ کے لیے لندن روانہ ہو گئے۔

اتنے دنوں کی تھکاوٹ اور ذہنی پریشانی نے نیناں کو بیمار کر دیا تھا۔ دو دن سے وہ چھٹی پہ تھی۔ گھر والے بھی اس کی تیمارداری میں لگے تھے اور جلد از جلد اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھے۔

آج تیسرا دن بھی اپنے آپ میں ایک بوجھل پن سمیٹے ہوئے تھا۔ اعشار کو کھونے کا اسے دکھ نہ

تھا۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی اس نے اپنی آنکھوں کو بہت غلط خواب دکھائے۔ صمد جیسے دوست کی چاہت سے انجان بنی رہی اور اس انجانے پن میں اعشار سے رشتہ جوڑ بیٹھی۔

''نیناں آپی! یہ پھول آپ کے لیے اور یہ کارڈ بھی۔ ٹی سی ایس والا دے گیا۔'' ہما نے اسے چونکا سا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈیزی اور گلاب کے پھولوں کا ایک بہت خوب صورت سا بکے تھا اور گلابی لفافہ تھا۔ نیناں نے حیرت سے دونوں چیزیں لے لیں۔ کارڈ کا لفافہ ابھی چاک ہی کیا تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر پڑا فون چلا اٹھا۔

اس نے کارڈ سائیڈ پہ رکھا اور فون اٹھا لیا۔

''ہیلو۔''

''میرے بھیجے ہوئے پیامبر ملے۔'' دوسری طرف سے صمد کی آواز ابھری۔

''تو یہ پھول تم نے بھیجے ہیں۔ بہت خوب صورت پھول ہیں۔'' نیناں مسکرا دی۔

''یہ صرف پھول نہیں۔ یہ اچھے دنوں کی نوید ہیں۔ یہ تم سے کچھ کہنے آئے ہیں۔'' وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

''کیا......؟'' نیناں نے پوچھا۔

''یہی کہ اب دوسروں کے بارے میں بہت سوچ لیا۔ اب اپنے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ تم نے کارڈ پڑھا؟''

''نہیں پڑھنے ہی والی تھی کہ تمہارا فون آ گیا۔'' وہ بولی۔

''چلو میں فون رکھتا ہوں۔ تم اطمینان سے کارڈ پڑھو۔ کل آفس میں تمہارا انتظار کروں گا اور ہاں...... تمہارے جواب کا بھی۔''

''کس بات کے جواب کا؟'' نیناں نے سوال کیا۔

''جو ابھی میں تم سے پوچھوں گا۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔ وہ منتظر تھی۔

''یہی...... کہ زندگی کے اس طویل سفر میں...... کیا تم میرا ہاتھ تھام لوگی؟ کیا تم میری بنو گی؟ کیا اپنے پھولوں سے خواب میرے نام کرو گی؟ میرے سوال منتظر ہوں گے تمہارے۔'' یہ کہہ کر صمد نے فون رکھ دیا اور نیناں نے مسکرا کر کارڈ کھولا۔ ڈھیر ساری سرخ گلاب کی پتیاں اس کی گود میں گر گئیں۔ اک تحریر اس کی منتظر تھی۔

''تم پھول کسی کو مت دینا
ہم سارے پھول خریدیں گے

کچھ پھول کھلیں گے گجروں میں
کچھ پھول سجیں گے سہرے میں
کچھ ڈولی میں بھی سجتے ہیں
کچھ سیج کی زینت بنتے ہیں
تم پھول کسی کو مت دینا۔
ہم سارے پھول خریدیں گے"

اس کی محبت سے لبریز نظم نے نیناں کی آنکھیں نم کر دیں۔ وہ پتی پتی گلاب کی پنکھڑیاں گود سے اٹھانے لگی اور گلابی لفافے میں رکھنے لگی۔ اسے یوں لگا کہ وہ گلاب کی پتیاں نہیں اس کے خواب ہیں جنہیں وہ قطرہ قطرہ سمیٹ کر صمد کو سونپنے کے لیے رکھ رہی ہے۔ ابھی تو اسے کل کا انتظار کرنا ہے۔ اپنی وفاداری کا اقرار کرنا ہے اور خوابوں کے پھول صمد کی گود میں ڈالنے تھے اور دل اس کی دسترس میں' اس کے اختیار میں کر دینا تھا۔

***

عشق آوارہ مزاج

تیرے خیال و خواب تری بات ہی بہت
سرمایۂ حیات یہ سوغات ہی بہت
دل اب بساطِ عشق کے ان مرحلوں میں ہے
تسکینِ آرزو کو جہاں مات ہی بہت

خنک سی شام اس ویران سے گھر کے کواڑوں میں آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ آسمان کئی رنگوں میں اپنا آپ ڈھالے بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ کبھی ملگجا تو کبھی کاسنی اور کبھی سرمئی رنگ اوڑھتا آکاش کتنا گہرا کتنا وسیع تھا۔ اس اداس سے کمرے کی دل چیر دینے والی تنہائی کے بیچ مغنیہ کی آواز ابھری۔

کبھی ہم خوب صورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی

بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے لیکن ہمارے پاس رہتے تھے

مشال نے اپنی پشت راکنگ چیئر سے ٹکائی اور نم آنکھوں کو پل بھر کے لیے بند کر لیا۔

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو کہ ہم کو تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
گئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو......
کہ ہم کو تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے

اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ یقیناً وہ یادوں کے کسی جھرمٹ سے بھاگ گئی تھی۔ موندی ہوئی آنکھوں سے اس کا لاشعور مغنیہ کی آواز کے ساتھ ماضی کے کتنے ہی کھنڈر چھان آیا تھا اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو شعور نے اسے وہی منظر دکھایا جس کی وہ نفی کرنا چاہتی تھی۔ وہی کمرہ وہی ویرانی اور وہی خاموش بے جان تصویریں۔ اس کا دل اس سب سے دور بھاگ جانے کو چاہا۔ ہر چیز سے چھپ جانے کو چاہا۔ وہ اٹھی اس نے ٹیپ آف کیا اپنی بیساکھیاں اٹھائیں گرم شال لپیٹی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو مشال بیٹی!'' عقب سے اسے فرزانہ بوا نے آواز دی۔

''بوریت ہو رہی تھی بوا۔ ذرا گھر کے باہر تھوڑی دیر ہو آتی ہوں۔'' اس نے بنا پلٹے ہی جواب دیا۔

''لیکن ابھی تو رات ہونے والی ہے۔ اکیلی کہاں جاؤ گی۔ اچھا چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' بوا شاید اس کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔

''نہیں بوا میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔ تھوڑی دیر تک آ جاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کے آگے بڑھنے لگی۔

''اچھا جلدی واپس آ جانا۔ کھانے سے پہلے آ جانا۔ ایک تو اس لڑکی کو کسی چیز سے خوف بھی نہیں آتا۔ پہاڑی علاقے میں مغرب سے پہلے لوگ گھروں میں دبک کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اندھیروں سے سردی سے گھبراتے ہیں اور یہ محترمہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر لیتی ہیں۔'' وہ سیڑھیاں آہستہ آہستہ اتر رہی

تھی اور عقب سے فرزانہ بوا کی خفگی سے بھری آواز بھی اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر گھر سے چلی آئی اور آہستہ آہستہ اپنی بیساکھیوں کی مدد سے وہ آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔

ان کا وہ چھوٹا سا گھر مال روڈ کے بالکل نزدیک تھا۔ مری وہ تقریباً چار سال پہلے ہی آئی تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ اسے اس طرح یہاں رہتے ہوئے دو سو سال بیت گئے ہوں۔ تنہا، اداس، ویران وہ ایسی تو نہ تھی لیکن زندگی میں ہونے والے اس ایک حادثے یا پھر ان چند حادثات نے اسے بہت ویران، بہت تنہا بہت اداس کر دیا تھا۔ وہ جو ہر وقت ہر جگہ قہقہوں کی پھوار میں بھیگتی رہتی تھی۔ خوابوں کے پیراہن، چاہتوں کے جگنو، سپنوں کی تتلیاں اس کی ہمراہ ہوتی تھیں۔ وہی مشال احمد کتنی تنہا کتنی اکیلی ہو گئی تھی۔ کیا لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ جگنو، وہ خواب، وہ تتلیاں بھی دور کی جھیلوں میں اڑ گئے تھے لیکن کیا اس کے پاس کوئی ایسا پرندہ نہ تھا کہ جس کے پروں پر سندیسے لکھ کر وہ ان دور بسنے والے لوگوں کو آواز دے سکے۔ انہیں اپنے پاس بلا سکے۔

وہ چلتے چلتے مال روڈ پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں جگہ جگہ بنی دکانیں اور ٹک شاپ، ہوٹل اور ریسٹورنٹ اس خاموش سی وادی میں جگمگاہٹ کا باعث بنے ہوئے تھے۔ گرمیوں میں تو مال روڈ کی یہ سڑکیں ٹورسٹ اور دور دور سے اڑ کے آنے والے پنچھیوں سے بھری رہتی تھیں لیکن سردیوں میں یا تو یہاں کے مقامی لوگ ہوتے تھے یا کوئی اکا دکا ٹورسٹ اور ہنی مون کے لیے آئے ہوئے کپل ہوتے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی اس پیراڈائز ونڈو نامی ریسٹورنٹ کی بالکنی میں آ بیٹھی۔ وہ اکثر یہاں آتی تھی اس لیے وہ یہاں کے لوگوں کے لیے انجان نہ تھی۔ کافی کا آرڈر دے کر اس نے کرسی کے پیچھے بالکنی کے سہارے اپنی بیساکھیاں رکھیں اور سامنے خنک فضا اور پرستان سے اتری ہوئی دھند میں لپٹے پہاڑوں کو دیکھنے لگی جو کہ رات کی سیاہی میں کالی چادر اوڑھے ہوئے تھے اور انہی پہاڑوں پر بنے گھروں کی بتیاں اس کالی چادر میں ہیرے موتیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

کافی کے گرما گرم چسکے لیتے ہوئے۔ کافی کے مگ سے اڑتا ہوا دھواں اسے ماضی کے دھندلکوں میں ساتھ لیے جا رہا تھا کہ جب وہ بہت سے ان کہے لفظوں سے تصویریں بناتی تھی کہ جب وہ خوب صورت تھی!

☆

اس با اعتماد، پر جوش اور خوب صورت لڑکی نے جب مقامی کالج سے اے لیول کر لیا اور کراچی یونیورسٹی کی فریش نیو کمر کے طور پر یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ کتنا رنگین، کتنا چنچل، کتنا خواب ناک، ہر طرف جواں پر جوش آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں کے دریچوں میں سجے کتنے ہی قد آور خواب تھے۔ ہر کوئی زندگی کی الجھنوں سے کوسوں دور اپنی زندگی کو انجوائے کرنے میں مگن تھا۔ ہر

کوئی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے لڑکپن کو انجوائے کرنے میں مشغول تھا۔ یونیورسٹی کے ہر ڈیپارٹمنٹ کے ہر کونے کے باہر اسٹوڈنٹس کے گروپ فرش پر، سیڑھیوں پر آلتی پالتی مارے خوش گپیوں میں مگن تھے۔ ان کے ہونٹوں سے چھلکتی مسکراہٹوں اور آنکھوں سے چھلکتی بے پروائیوں سے یوں لگتا تھا کہ جیسی ان کو اپنے مستقبل کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔ کوئی پرواہی نہ ہو۔

وہ اعتماد کی چال چلتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے یقیناً علم نہ تھا کہ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہوگا اور اس لیے اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کسی اسٹوڈنٹ سے پوچھے گی۔ وہ ہر طرف نگاہ دوڑا رہی تھی کہ وہ کس سے پوچھے۔ آخر کار ایک کونے میں کاریڈور کے باہر بیٹھے چند لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ان کے پاس آئی جو کہ آپس میں کسی بات پر لڑ رہے تھے۔

''شاہ زیب پلیز یار انہی سے رقم پوری کرلینا ناں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔

''ایسے کیسے پوری کرلوں اٹھنی چونی کم ہوتی تو پوری کرلیتا۔ پورے پچاس روپے کم ہیں۔ چلو لڑکیوں کی جیب ہی ڈھیلی کرو۔'' شاہ زیب اپنے ہاتھوں میں تھامے نوٹ لہرانے لگا۔

''یہ جو پہلے پیسے اکٹھے کیے ہیں یہ کس کی جیب سے نکلے ہیں۔ کنجوس۔'' ایک لڑکی نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔

''کیا یار صرف پچاس روپے کے لیے تم لوگ اتنی اچھی ٹریٹ مس کردینا چاہتی ہو۔ عورت کا دل تو بڑا فراخ ہوتا ہے۔'' ایک اور لڑکے نے کہا۔

''اور لڑکوں کے ہاتھ۔'' لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

مشال ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو کر مسکرا رہی تھی کہ جب شاہ زیب کی نظر اس پر پڑی۔

''یس ہو آر یو؟'' یکا یک سبھی اس انجان چہرے کی جانب متوجہ ہوئے۔

''سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اصل میں مجھے ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں پوچھنا تھا۔'' مشال مسکرا کے بولی۔

''ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کیا آپ فریش اسٹوڈنٹ ہیں؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' وہ مسکرادی۔

''آج آپ کا پہلا دن ہے؟'' ایک اور سوال اٹھا۔

''بی ایس سی آنرز کریں گی؟'' وہ مسلسل گردن اثبات میں ہلائے گئی۔

''آپ جانتی ہیں فریش اسٹوڈنٹ کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟'' اس سوال پر وہ خاموش ہوگئی تھی۔

''یار سعد انہیں ذرا بتانا کہ کیا ہوتا ہے۔'' اب شاید سعد نامی لڑکا اٹھا اور مشال سے مخاطب ہوا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''مشال احمد خان۔'' وہ بولی۔

''ہاں تو مس مشال احمد خان۔ یہ اس یونیورسٹی کا رول ہے کہ فریش اسٹوڈنٹ کے ساتھ فولنگ ہوتی ہے۔ یونو فولنگ جس کو ریگنگ اور بلنگ بھی کہتے ہیں جانتی ہیں آپ؟'' سعد بہت طنز سے بولا۔

''چھوڑو سعد سہم گئی ہے بے چاری۔'' ایک خوب صورت سی لڑکی نے مسکرا کے کہا۔

''گھبرائیں مت ہم آپ کو کوئی سزا نہیں دیں گے۔ ناں ہی کوئی الٹا سیدھا راستہ بتائیں گے۔ بس ہمارے اسٹاک میں پچاس روپے کی کمی ہے وہی پوری کرنی ہے اور وہ جو سامنے کینٹین ہے ناں وہیں پہ جا کے یہ چیزیں لے آنی ہیں جو اس لسٹ میں لکھی ہیں پھر آپ آئیں گی تو ہم آپ کو ضرور بتائیں گے کہ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ کہاں ہے۔'' شاہ زیب نے اسے مخاطب کر کے کہا وہ یقیناً سہم گئی تھی اور خاموش بھی تھی۔

''دیکھیں صرف کسی ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں بتانے کے لیے آپ نے میرے لیے سزا تجویز کردی۔'' وہ اپنے حواس سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''سزا۔'' شاہ زیب اور سعد کے ہمراہ سبھی مسکرادیے۔

''کرن، ندا، سجل، ذرا ان کو بتانا کہ سزا کیا ہوتی ہے۔ مس مشال احمد خان ہم نے آپ کو ابھی سزا دی ہی کہاں ہے۔ ہم تو آپ سے صرف مدد مانگ رہے ہیں۔ یونو مالی مدد۔ ہم سارے کے سارے غریب عوام ہیں۔ آپ اگر تھوڑا سا فنڈ دے دیں گی تو آپ کا کیا جائے گا۔ ویسے بھی ہم جیسے معصوم سینئرز آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ چلیں میرے ساتھ۔'' اسے مجبوراً ہی شاہ زیب کے ہمراہ آنا پڑا اور اس نے کینٹین سے لسٹ میں لکھی تمام چیزیں خریدیں اور پیسے شاہ زیب سے لے کر اس میں پچاس روپے مزید ملا کے کینٹین بوائے کو دیئے اور وہ چیزیں شاہ زیب سے اٹھوا کے وہ واپس وہیں آئی جہاں پر سبھی بیٹھے تھے۔

شاہ زیب ہر کسی کو کوکا کولا دے رہا تھا اور باقی چیزیں سرو کر رہا تھا اور وہ بدھو بنی ہر کسی کو دیکھ رہی تھی۔

''تھینک یو مس مشال احمد اب آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ اس وقت جہاں کھڑی ہیں۔ وہ ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ ہی ہے۔'' شاہ زیب منہ میں برگر ٹھونستے ہوئے بولا۔ اس بات پر اسے سخت قسم کا تاؤ آیا کہ ان ساروں نے اسے کس طرح پریشان کیا۔ وہ پیچھے مڑی اور جانے لگی۔

''بات سنیں۔'' اسے عقب سے کسی نے آواز دی۔ وہ مجبوراً پلٹی۔

کوئی لڑکا کھڑا اس کی جانب مسکرا کر دیکھ رہا تھا اس کی براؤن آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔

''اب جب کہ آپ ہمارے ڈیپارٹمنٹ اور ہماری کلاس میں آہی چکی ہیں تو آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر لنچ ہی کرلیں۔'' اس لڑکے کی اس پیشکش پر اسے غصہ آیا۔

"یعنی آپ لوگ میرے سینئر نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"صرف ایک مہینہ ہی سینئر ہیں۔ آپ کا ایڈمیشن غالباً لیٹ ہوا ہے۔ ہمارا ابھی بی ایس سی آنرز کا فرسٹ ایئر ہی ہے۔ آیئے آیئے ہمیں جوائن کیجیے۔" اس لڑکے کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ سے اسے مزید شرمندگی ہوئی۔ وہ جانے کے لیے پلٹی اور قدم بڑھائے۔ تبھی دو لڑکیاں انہی میں سے اٹھیں اور اس کی جانب آئیں۔

"سنو مشال! میرا نام ندا خاور ہے اور میں کویتا بنرجی ہوں۔ تم ہمارے گروپ کو جوائن کر لو ناں۔" ندا اور کویتا اسے زبردستی اپنے گروپ کے پاس لے آئیں۔

"چلو میں سب کا تعارف کرواتی ہوں۔ یہ ہیں سعد حسن' انٹیریئر سندھ میں بگڑ بگڑ کے اب کراچی کو بگاڑنے آئے ہیں۔" ندا نے شروعات کی۔

"مابدولت شاہ زیب علوی کہلاتے ہیں اس گروپ کے سب ضروری کام ہم ہی کرتے ہیں۔ جیسے کہ چندہ اکٹھا کرنا' کھلانا پلانا اور ہاں فریشرز کی فولنگ کرنا۔" شاہ زیب بولا۔

"میں سجل ندیم ہوں۔ میں ایگریکلچرل کی نہیں اکنامکس کی اسٹوڈنٹ ہوں اور میں واقعی تم سب کی سینئر ہوں۔ ماسٹرز کر رہی ہوں۔" دراز زلفوں اور حسین مسکراہٹ والی سجل اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔

"یہ ہیں سیدہ کرن شاہ اور یہ ہیں سید سمعان شاہ۔ یہ دونوں آپس میں چچا زاد کزن ہیں اور دونوں یونیورسٹی ہاسٹل میں رہائش پذیر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کرن لڑکیوں کے ہاسٹل میں ہوتی ہیں اور سمعان لڑکوں کے۔" کویتا نے نیچے بیٹھی کرن اور سمعان کا تعارف کروایا۔ سمعان وہی تھا جس نے اسے اپنا گروپ جوائن کرنے کی آفر پہلے کی تھی اور کرن شاہ۔ بلیک کلر کے اسکارف اور عبا میں لپٹی قدرے مغرور آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کا دودھیا چہرہ اور شفاف رنگت اسکارف کے اندر سے روشنی چھوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے سب کے بے حد اصرار پر گروپ میں شامل ہونے کی ہامی بھر لی اور وہیں ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنا تعارف کروانے لگی۔

"میں مشال ہوں۔ اسلام آباد میں میری اسکولنگ ہوئی۔ اے لیول کر لینے کے بعد میں نے مزید کچھ کرنا چاہا۔ کافی یونیورسٹیز میں اپلائی کیا مگر میرا دل کراچی آنے کو چاہا۔ سو میں آ گئی۔ ہاسٹل میں ہی شفٹ ہوئی ہوں میں۔"

"شاہ زیب' ندا' کویتا یاد رکھو مشال ہمارے گروپ میں شامل ہونے والی آخری لڑکی ہو گی۔" روٹھی روٹھی سی کرن شاہ بولی اور سبھی نے رضامندی ظاہر کی۔

*

وارڈن نے اسے کمرہ نمبر ۱۴۸ میں پہنچا دیا اور پیچھے کوئی ملازمہ اس کا سامان بھی اسی کے ساتھ اٹھا کے آنے لگی۔ وہ ابھی کمرے کے اندر اپنا سامان رکھ ہی رہی تھی کہ سامنے سے کرن شاہ کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔

"ہیلو کرن۔" وہ مسکرا کر اس کی جانب آئی جتنی اپنائیت بھری اس کی مسکراہٹ تھی اتنا ہی روکھا پھیکا سا منہ کرن نے بنایا۔

"تو تم میری روم میٹ ہو۔ ویلکم۔" کرن قدرے بے رخی سے بولی۔

"کتنا عجیب اتفاق ہے ناں ویسے مجھے تو یہ حسین اتفاق لگا اور کون کون ہیں ہاسٹل میں؟" مشال اپنا سامان رکھتے ہوئے بولی۔ وہ سنگل بیڈ کے اوپر بنے درازوں میں اپنی چیزیں رکھتی جا رہی تھی۔

"بہت ساری لڑکیاں ہیں۔ پہچان جاؤ گی آہستہ آہستہ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" کرن نے اپنا اسکارف اور عبا اتاری اور اپنے جاذب جسم کو آزاد کیا۔ پشت تک لہراتی اس کی سیاہ چوٹی' نازک سی کمر اور خوب صورت ڈیل ڈول۔ یقیناً اس کا وجود ایسا تھا کہ جسے چھپا کے رکھا جا سکے۔

"تم بہت خوب صورت ہو کرن۔" مشال آخر اپنے اندر کی بات زبان تک لے ہی آئی۔ کرن کے چہرے پر کوئی خاص رنگ نہ آیا جیسے کہ یہ جملہ اس کے لئے معمولی ہی ہو یا پھر جیسے کہ وہ یہی سننے کی توقع کیے بیٹھی ہو۔ وہ دھیمے سے مسکرا کے باتھ روم میں گھس گئی اور مشال اس کی اس ادا پر حیران سی ہوئی۔

تبھی کمرے میں ندا نے انٹری دی اور دھڑام سے کرن کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ صبح ندا نے گلابی رنگ کا کرتا اور بلیک ٹراؤزر پہنا تھا اور اب وہ ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھی۔

"مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ ہاسٹل میں کوئی نئی لڑکی آئی ہے میں سمجھ گئی کہ وہ تم ہی ہو گی۔" ندا کھلکھلا کے بولی۔

"اچھا یعنی میں یہ خوش فہمی پال لوں کہ تم لوگوں کو میرے یہاں آنے سے خوشی ہوئی ہے۔" مشال نے کہا۔

"آف کورس مجھے تو بہت بہت بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ میں تو صبح ہی تم سے اتنی امپریس ہوئی تھی۔ ویسے تم سے کس نے کہا کہ ہمیں خوشی نہیں۔" ندا کے خوب صورت خال وخد کا زاویہ بدلا۔

"پتا نہیں کیوں مجھے کرن کے بی ہیویر سے ایسا محسوس ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن......" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"ارے یار تم دل پہ نہ لینا۔ یہ جو اپنی کرن ہے ناں اس کے ساتھ ناں ذرا سا مسئلہ ہے۔ وہ کیا ہے اہل سادات میں پلی بڑھی ہے ناں۔ سخت مزاج لے کے پیدا ہوئی ہے۔ جہاں مسکراہٹ سے کام چل جائے وہاں لفظ ضائع نہیں کرتی اور جہاں لفظ سے کام چل جائے وہاں جملہ نہیں ضائع کرتی لیکن دل کی

بہت اچھی ہے۔اب اگر میری طرح منہ پھٹ ہوتی تو شاید اقرار کر لیتی کہ تم بہت اسپیشل لڑکی ہو۔تمہاری ڈریسنگ تمہاری پرسنیلیٹی۔سچ مجھے تم سے تھوڑی سی جیلسی بھی ہوئی تھی صبح۔'' ندا کی لمبی گفتگو پہ مشال دل کھول کے مسکرائی تھی۔

''تمہارے پیرنٹس کہاں ہوتے ہیں ندا؟''

''یہیں کراچی میں ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''تو پھر تم یہاں ہاسٹل میں؟'' مشال کو حیرت ہی تو ہوئی تھی۔

''پلیز ہاں مشال پیرنٹس کا ذکر کر کے بور مت کرو۔بس یہ سمجھ لو کہ میں بہت آزاد قسم کی لڑکی ہوں۔ پابندیوں سے بہت گھبراتی ہوں اسی لیے ہاسٹل میں رہتی ہوں۔عمر کو بھی میں نے کہا ہوا ہے کہ تم مجھ پر کبھی پابندیاں مت لگانا۔'' ندا تیز رفتاری سے بولے گئی۔

''یہ عمر کون ہے؟'' مشال کے ٹوکنے پر وہ کچھ خجل سی ہوئی۔

''پہلے وعدہ کرو کسی کو بتاؤ گی نہیں۔''

''دوست پہ اتنا بھی اعتبار نہیں۔'' مشال نے اسے یقین دلایا۔

''عمر دوست ہے میرا یا پھر محبت...... نیٹ پہ ملاقات ہوئی تھی ہماری چار سال پہلے۔بہت اچھا ہے وہ۔'' ندا یکلخت شرمائی لجائی۔مشال اس لڑکی کے مزاج کے ہر رنگ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔کبھی بہت بولڈ تو کبھی سراسر مشرقیت سموئے شریر آنکھیں اور شرمایا لہجہ۔وہ لڑکی اپنے آپ میں ایک پوری دنیا تھی۔

''لاہور میں ہوتا ہے وہ کبھی کبھی آ جاتا ہے ملنے۔زیادہ تر فون پر ہی ملتا ہے۔'' وہی شرمایا لجایا پن۔

تبھی کرن باتھ روم سے کپڑے چینج کر کے واپس آئی اور ان دونوں کو یوں آپس میں چپکے بات کرتے دیکھ کر حیران ہوئی۔وہ دونوں اب معمول کی باتوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔

☆

کتنی جلدی وہ اس گروپ کی جان بن گئی تھی۔ہر کوئی اسے سراہتا' ہر کسی سے اس کی اچھی ہائے ہیلو ہو گئی تھی اور وہ تو تھی ہی ایسی۔ہمیشہ سے پرفیکٹ ہمیشہ سے اسپیشل ان کا گروپ مشال کے بنا ادھورا ہی لگتا تھا۔آج بھی کلاس میں کوئی نیا لڑکا آیا تھا اور سمعان ٹیچر بنا اس کی فولنگ میں مصروف تھا جب کہ مشال سمیت کلاس کے سبھی لوگ اس منظر سے لطف ہو رہے تھے۔

''ہاں تو مسٹر چوہدری' آپ ملتان سے ہیں۔'' سمعان اپنی آنکھوں پہ کسی دوسرے کلاس میٹ کا چشمہ چڑھائے زبردستی سنجیدہ ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

''جی سر ڈسٹرکٹ ملتان سے ہوں۔'' وہ مودبانہ بولا۔

''پھر تو آپ سرائیکی بھی بول لیتے ہوں گے اور چونکہ ملتان اور اس کے گرد و نواح میں زراعت اور کھیتی باڑی عام ہے تو آپ وہاں کی زمینوں اور کھیتوں میں موجود سنڈیوں اور کیڑوں کے بارے میں بھی کافی معلومات رکھتے ہوں گے۔'' سمعان چشمہ درست کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں تو چوہدری صاحب آپ سرائیکی میں صرف دس سنڈیوں کے نام گنگنا کے سنائیں۔'' سمعان کی اس فرمائش پر سبھی کھلکھلا کر ہنس دیے۔

''شٹ اپ کلاس۔آپ ایگریکلچر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔آپ کو مختلف علاقوں کی سنڈیوں کے بارے میں معلومات ہونی چاہئیں۔'' سمعان چلایا۔سبھی کی ہنسی دبنے لگی۔

''بول ناں چوہدری سنڈا فاسٹ۔'' کسی دل جلے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔

''سر گنگنا کے بتانا ضروری ہے۔میرا مطلب میری آواز اچھی نہیں ہے سر۔'' وہ منمنایا۔

''تو اچھی ہو جائے گی بیٹا۔یہاں پہ جو آتے ہیں ان کی آواز رکشے کے بھونپو کی طرح ہوتی ہے لیکن ہم اسے کار کے ہارن میں تبدیل کر دیتے ہیں۔یقین نہیں آتا شاہ زیب آپ کچھ گا کے سناؤ۔'' سمعان نے جیسے ہی شاہ زیب کو آرڈر کیا شاہ زیب اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا۔نوٹس اٹھائے' ان کا رول بنا کے مائیک کی طرح سامنے رکھا اور گانے لگا۔

''امریکا کے ناں جاپان کے
ہم تو ہیں دیوانے ملتان کے
پیارے پیارے ہونٹ سرائیکی بولیں
اور کرتے ہیں دل گھائل
سانولی سلونی سی محبوبہ
تیری چوڑیاں شٹرنگ کر کے''

وہ ہاتھ لہرانے لگا اور سبھی لوگ تالیاں بجانے لگے۔کلاس کا ماحول یکسر بدل سا گیا۔تبھی کلاس میں پروفیسر ملک نے انٹری دی۔سمعان تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو کے اپنی سیٹ پر پہنچ چکا تھا اور اس کا چشمہ اپنے مالک تک' چوہدری بے چارہ بدھو بنا سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔اسے سعد نے پکارا۔

''اوئے سنڈا فاسٹ یہاں آ کے بیٹھ جا۔کلاس شروع ہو گئی ہے۔'' اور ہکا بکا سا چوہدری سعد کے برابر میں جا کے بیٹھ گیا۔

''بہت اچھی آواز ہے آپ کی شاہ زیب اور سمعان شاہ آپ کی اداکاری بھی۔'' پروفیسر ملک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔''کس کی شامت آئی تھی آج۔'' پروفیسر نے مزید استفسار کیا۔

''چوہدری سنڈا فاسٹ کی جو ملتان ریٹرن ہیں۔'' کسی لڑکی نے وضاحت کی اور سبھی مسکرا دیے۔
پھر چوہدری کا تفصیلی تعارف ہوا اور اسے سمجھایا گیا کہ یہ سب کیا تھا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد اوول کی سیڑھیاں تھیں اور وہ سب تھے۔ ان کی شرارتیں اور مستیاں تھیں اور ان کی الہڑ عمریں تھیں۔
''یارو میں ایک گرما گرم نیوز لے کر آیا ہوں۔'' شاہ زیب دور سے ہاتھ میں کوئی کاغذ لہراتا آیا۔
''کیوں تیرا کیمسٹری کی نادرہ حسین سے افیئر ایکسپوز ہو گیا کیا؟'' سمعان نے اسے چھیڑا۔
''یا پھر اپنا وائس چانسلر مرور گیا ہے۔'' سعد نے بھی ٹکڑا لگایا۔
''دفع دور کبھی کوئی کری ایٹو کام نہ سوچنا۔ اگلے ماہ اپنی یونیورسٹی اسٹیج ڈرامہ کر رہی ہے' جو مقابلہ جیتے گا۔ اس ٹیم کو پچاس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔'' شاہ زیب نے خبر سنائی۔
''کیا پچاس ہزار روپے۔'' سبھی ایک ساتھ بولے۔
''ہاں ایک گروپ تو ایک پلے کی لیے سلیکٹ ہو گیا ہے باقی دو رہتے ہیں۔ چلو ہم اپنے گروپ کا نام لکھوا کے آتے ہیں۔'' سمعان نے کاغذ لے لیا اور شاہ زیب بولا۔
''لیکن ہم میں سے ایکٹنگ کرے گا کون؟'' کرن نے نکتہ اعتراض اٹھایا۔
''اپنے تو سبھی اداکار ہیں۔ یہ سمعان' سعد' ندا' کوبتا اور مشال۔'' سجل بولی۔
''ناں بابا مجھے یہ اداکاری نہیں آتی۔'' مشال نے صاف انکار کیا۔
''اور مجھے تو اجازت ہی نہیں ملنی۔'' کرن بھی مکر گئی۔
''باقی لوگ میں کہیں سے پکڑ لوں گا۔ تم لوگ تو ہاں کرو۔'' شاہ زیب بولا۔
''میں تم لوگوں کے ڈائیلاگز لکھوں گی۔ مجھے کالج میں بیسٹ رائٹر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔'' مشال نے مسکرا کے کہا۔
''پرفیکٹ' میں شاہ زیب' سعد' کوبتا' ندا' ہم اسٹیج پر ہوں گے اور آپ کرسیوں پر بیٹھ کے مزے سے دیکھیں گی۔ ناں یار بے شک مشال ڈائیلاگ لکھے لیکن وہ اسٹیج پہ بھی ہو گی۔'' سمعان نے ضد کی۔
''اور میں کیا کروں گی۔'' کرن نے منہ بسورا۔
''تم ہمارے ڈرامے کی فوٹو گرافی کرنا۔'' سمعان نے فوراً کہا جس پہ کرن مزید بگڑ گئی اور اپنی کتابیں اور عبا سنبھالتی وہاں سے اٹھ گئی اور سجل اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ پیچھے تمام لوگ اپنی پلاننگ کرتے رہے اور اس طرح سبھی نام لکھوانے پہ رضامند ہو گئے۔
''یہ سید سمعان شاہ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔ ہمیشہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور وہ بھی اس مشال احمد کے سامنے۔'' کرن انتہائی غصے میں سجل سے بولی۔
''ہو سکتا ہے کرن! یہ تمہاری سوچ ہو۔ یکطرفہ سوچ۔ سمعان ایسا لڑکا نہیں ہے۔'' سجل نے اسے

سمجھانا چاہا۔
''سمعان کیسا لڑکا ہے یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ لالہ سکندر شاہ کا اکلوتا بیٹا ہے وہ۔ آسائشوں میں محبتوں میں پلا بڑھا ہے۔ اپنی حویلی کے ہر فرد کی طرح اس کا دل اپنے خاندان کی عورتوں سے متنفر ہے۔ ان حویلی کے سید زادوں کے لیے عورت کا وجود ایک گالی جیسا ہوتا ہے اور یہ لوگ کبھی کسی عورت کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ بس انہیں یہ اپنی عزت اور انا کا سرٹیفکیٹ بنا کے اپنے گھر کی تجوریوں میں بند کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔ سمعان شاہ کو ہمیشہ سے یہ اعتراض رہا ہے کہ میں کیوں شہر آئی اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ آزادی کیوں چاہی۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں لیکن وہ جان بوجھ کر مشال میں دلچسپی لے رہا ہے۔ مجھے نیچا دکھانے کے لیے۔'' کرن کا لب ولہجہ مشتعل تھا۔
''جہاں تک میں سمعان کو جانتی ہوں کرن...... تو وہ ایک مثبت ذہن رکھنے والا پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ اس کی ذہنیت فیوڈل جاگیرداروں کی جیسی بالکل نہیں۔'' سجل انتہائی نرمی سے بولی۔
''سمعان کو تم نے صرف یونیورسٹی کے احاطے میں دیکھا ہے۔ شرارتیں کرتے ہوئے' گنگناتے ہوئے' کبھی تم اسے ہماری حویلی آ کر دیکھو۔ اس کا امیج یکسر ہی تبدیل ہو جائے گا تمہاری آنکھوں میں۔ افسوس مجھے یہ نہیں ہے کہ سمعان نے مجھ پر دھیان نہیں دیا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اسے اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے مشال احمد نظر آئی۔ میں نہیں۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ میں لٹریچر میں کتنی دلچسپی رکھتی ہوں۔'' کرن بولی۔
''لیکن ڈرامہ لکھنے کی بات پہلے تو خود مشال نے کی تھی۔'' سجل نے تصحیح کی۔
''پر سمعان میرا نام تو لے سکتا تھا۔ مجھے پوائنٹ آؤٹ تو کر سکتا تھا۔ اس نے نہ صرف میرے ٹیلنٹ کی نفی کی بلکہ میری ذات کو بھی نظر انداز کیا۔ صرف اس لیے کہ میں اس کی حویلی میں پلی بڑھی اور ان سید زادوں کے لیے اپنے گھروں کی عورتیں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔'' کرن ابھی تک اسی انتشار میں الجھی ہوئی تھی۔
''کرن! زندگی کی ہر چیز کو پازیٹو لو۔ تم دیکھنا تم زندگی کو بدلا ہوا پاؤ گی۔ یقین کرو میرا۔ زندگی اس قدر سفاک نہیں ہے۔ کتنے ہی خوب صورت احساسات سے سجی بنی ہے یہ زندگی۔ اس کو اتنی ہی خوب صورتی سے دیکھو۔'' سجل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانا چاہا۔

☆

''وہ بہت ہی الگ قسم کی لڑکی ہے۔ پہلے دن سے جب سے اس پر پہلی نظر پڑی ہے۔ میں نے اس کے لیے اپنے اندر بہت الگ قسم کی فیلنگز محسوس کی ہیں۔ ایسی فیلنگز کہ جس کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ہاں' ہاں اب میں سمجھنے لگا ہوں کہ مجھے' مجھے اس سے محبت ہے۔ ہاں سعد مجھے اس سے محبت ہے۔''

سمعان اپنے روم میٹ اور ہمراز سعد کے ساتھ باتیں شیئر کرتے ہوئے بولا۔

''اور پھر وہ ہے ہی ایسی کہ آپ ہی آپ دل کرتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے وہ اس کا دلکش سراپا اس کی وہ گہرائی لیے سیاہ آنکھیں اور اس کی سفید کشادہ پیشانی پر لہراتی اس کی پریشان زلفوں کی وہ لٹیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نانگا پربت کی سفید مغرور چوٹی کے اوپر سرمئی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں۔ اس کی باتیں' ایک کشادہ روشن ذہن رکھنے والی سچ۔ ایک بہت ہی اچھی اپروچ' جو کہ پریکٹیکل نہ ہوتے ہوئے بھی بے حد بھلی لگتی ہے۔ اس کا وہ تصوراتی ذہن' ہر وقت کسی نہ کسی تصور کی تصویر بنانے میں جتا رہتا ہے اور اس کے ذہن کی آئینہ دار اس کی آنکھیں بہت روشن' بہت خوب صورت بالکل اس کے نام کی طرح۔ مشال' مشعل روشنی سے مزین۔ کرنوں سے آراستہ۔''سمعان کے لفظ اس کی آنکھوں سے بھی چھلک رہے تھے اور سعد اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''میاں مجنوں' اس عشق کی بھنک لیلیٰ کو بھی پڑی کہ...... یکطرفہ تیرے پیار کی گلیوں میں رلے دل۔'' سعد نے اسے چھیڑا۔

''ابھی تک تو اسے اقرار کی لذت سے آشنا نہیں کروایا لیکن یار میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کہ دل کے بھید تاعمر دل ہی میں سمیٹ کے رکھیں اور محبوب کے فراق میں تاعمر تڑپتے رہیں۔ ایک دن ضرور...... ضرور اسے میں اپنی زبان سے بتاؤں گا اس کے آگے گھٹنے ٹکا کے یہ اقرار کروں گا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔''

سمعان شاہ کی آنکھوں میں یقین کی ان گنت پرچھائیاں تھیں۔ وفا کے کتنے ہی پراعتماد جگنو تھے۔ خواہشوں کی ہزاروں رنگ برنگی تتلیاں تھیں۔

''تو پھر دیر کا ہے کی ہے۔ روز تو ملتے ہو اس سے۔ اقرار کرنے میں کس موقعے کی تلاش ہے تم کو۔ کل ہی اسے کینٹین لے جا کر اچھی سی کافی پلا۔ خوب صورت سی نظم سنا کے اپنے دل کا حال بیان کر دے۔''

''نہیں ایسے نہیں' کسی خاص انداز میں کہوں گا اسے دل کے سب حال۔ کچھ اس طرح کہ وہ انکار ہی نہ کر پائے اور اپنا سب کچھ مجھ سے وابستہ کر لے۔ اپنی آنکھوں میں' خوابوں میں اور دل میں مجھے ہی بسا لے۔''سمعان اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے ڈرامائی انداز میں بولا۔

''میاں مجنوں' ہو تم صحیح فیوڈل۔ ملکیت سمجھ کر چاہتے ہو ہر چیز کو اور اس کے حصول کو مقصد بنا لیتے ہو اپنی زندگی کا۔'' سعد نے نیا سگریٹ نکال کے اسے سلگایا اور مسکرا کے کہنے لگا۔

☆

''یار ندا تم مصروف تو نہیں ہو۔ مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔'' مشال اپنی فائل اور قلم اٹھائے اس کی جانب آئی اور وہ جو بستر پر لیٹی کانوں میں واک مین لگائے ابرار الحق کو سننے میں مشغول تھی مسکرا کے

بولی۔

''یوں تو اس فضول کام کو بھی مصروفیت کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن تم بتاؤ کیا پوچھنا ہے؟'' ندا نے ایئر فون کو نکال کر دراز میں رکھا۔

''یہاں تمہاری روم میٹس ڈسٹرب ہوں گی۔ چلو کاریڈور میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' مشال کے بلانے پر وہ اپنے مخصوص انداز میں جمپ لگا کے بیڈ سے اتری اور مشال کے ہمراہ کاریڈور میں آ گئی۔ وہیں کچھ چھاؤں اور تنہائی ڈھونڈ کر وہ دونوں بیٹھ گئیں۔

''اب بتا کیا بات ہے؟'' ندا آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

''کچھ خاص نہیں۔ ڈائیلاگز لکھ رہی تھی ناں۔ جہاں پہ ہیروئن کی ماں کو ڈائیلاگ کہنے تھے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح کے ڈائیلاگ لکھوں۔ سچویشن یہ ہے کہ لڑکی کو ایک فیوڈل لارڈ لڑکے سے محبت ہو جاتی ہے جس کے ماں باپ اس کی شادی لڑکی سے کروانے کے لیے کئی شرطیں رکھتے ہیں جو کہ لڑکی کی ماں کو منظور نہیں' جب کہ لڑکی کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتی ہے لڑکے کے لیے' تو ماں کس طرح کے ڈائیلاگز بولے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' مشال اسے سچویشن سمجھاتے ہوئے بولی۔

''تو اس میں کیا پرابلم ہے۔ ہر ماں شادی کے نکتہ اعتراض کے طور پر ایک ہی طرح کے ڈائیلاگ بولتی ہے۔ یہ شادی کبھی کسی صورت نہیں ہو سکتی میں۔ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی مگر تیری شادی اس گھر میں کبھی نہیں کروں گی' وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ آسانی کے لیے اپنی مدر کو فون کر کے پوچھ لے ناں کہ وہ اس سچویشن پر کیسے ری ایکٹ کریں گی۔'' ندا نے حل بتایا۔

''میری مدر کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ میرے پاپا نے دوسری شادی کر لی ہے اور ان کے تین بچے بھی ہیں۔'' مشال کے لہجے میں آپ ہی آپ افسردگی در آئی۔

''اوہ مجھے علم نہ تھا۔ تو ٹھیک ہے میں اپنی مما سے پوچھ کے بتا دوں گی تمہیں۔ ویسے وہ ڈاکٹر ہیں انہیں یہی کہنا ہے کہ شادی کرو تو کسی ڈاکٹر سے۔ بھاڑ میں جائیں یہ فیوڈل لارڈز۔'' ندا نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔

''تم سمعان یا کرن سے کیوں نہیں مدد لیتی ہو۔ ان کا تو تجربہ ہے جاگیرداروں کے بیچ پلنے بڑھنے کا۔''

''ناں یار کرن سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر وقت مجھ سے خفا ہو ہر بات کا جواب کرختگی سے دیتی ہے۔ ہاں البتہ سمعان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ کل ہی مجھے یہ فائنل کر کے دے دینا ہے اور کل سے ریہرسل بھی شروع کرنی ہے۔'' ابھی وہ باتوں میں ہی مصروف تھیں کہ چپراسی ایک لفافہ اٹھائے مشال تک آیا۔

”مشال بی بی آپ کے لیے یہ ڈاک آئی ہے۔“

مشال نے وہ لفافہ اس سے لے لیا جس کے اوپر اسی کا نام اور کمرہ نمبر ہاسٹل کے پتے کے ساتھ لکھا تھا جب کہ بھیجنے والے کا کوئی نام نہ تھا۔

”کس کا ہے۔“ ندا نے پوچھا۔“اس نے کندھے اچکا کر لفافے کو کھولنا شروع کیا۔ اندر ایک خوب صورت گلاب کی تصویر سے سجا کارڈ تھا جس کے اندر انجانی تحریر میں نظم لکھی تھی۔

تو میرا نام نہ پوچھا کر
میں تیری ذات کا حصہ ہوں
میں تیری سوچ میں شامل ہوں
میں تیری نیند کا قصہ ہوں
میں تیرے خواب کا حاصل ہوں
میں تیری یاد کا محور ہوں
میں تیری سانس کا جھونکا ہوں
تو منظر میں پس منظر ہوں
میں لمحہ ہوں میں جذبہ ہوں
جذبے کا کوئی نام نہیں
تو میرا نام نہ پوچھا کر

نظم کے علاوہ اور کچھ بھی لکھا نہ تھا۔ نہ کسی کا نام نہ پتا' مشال حیران ہی تو ہوئی تھی۔

”کون ہوسکتا ہے یہ بے نام' ویسے ہے بڑا رومینٹک' میرا اعمر تو اس طرح کا کام کر ہی نہیں سکتا۔ بونگا ہے بالکل وہ تو۔“ ندا کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”لیکن یار یہ تو پریشان کر دینے والی بات ہوئی ناں۔ کس کی حرکت ہوسکتی ہے یہ۔“ مشال نے پریشانی سے کہا۔

”مشال! تم جیسی بولڈ لڑکی اگر اتنی معمولی سی بات پر پریشان ہو جائے تو ہمارا کیا ہوگا۔ کم آن یار۔ ٹیک اٹ ایزی' ہوگا کوئی اپنی ہی یونیورسٹی کا یا پھر اپنی ہی کلاس کا اور ویسے بھی تم پہ تو لڑکیاں عاشق ہو جائیں چہرہ ہی ایسا ہے تمہارا۔ لڑکوں کا کوئی قصور تو نہیں۔“ ندا کے یہ کہنے پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔

☆

اسٹیج پر سمعان شاہ اور اس کے گروپ کے لوگوں کا نام پکارا گیا۔ اسٹیج کا پردہ آہستہ آہستہ سرکنے لگا۔

وہ لوگ اسٹیج پر پہلے ہی سے تیار کھڑے تھے۔ باری باری جس جس کے سین آنے تھے اس نے اداکاری کرنی تھی۔

پہلا سین شاہ زیب اور سعد کا تھا جو کہ فیوڈل لارڈز کا کردار ادا کر رہے تھے جن میں سے ایک ہیرو کا باپ تھا اور دوسرا اس کا چچا اور ان دونوں کو اپنے بیٹے اور بھتیجے کی شہری محبت پر اعتراض تھا۔ پہلا ڈائیلاگ سعد کا تھا جو کہ لڑکے کا والد تھا۔

”عشق لڑایا اور وہ بھی شہری مینا سے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن اب اس کو پانے کی ضد۔ اس لڑکے کی رگوں میں ہمارا خون ہے' ہماری ہی طرح معاشقے کرنا' بلبلیں پھنسانا لیکن کسی بھی بلبل کو اپنی حویلی کے پنجروں میں جکڑنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔“

”ادا سائیں! اگر آپ اجازت دیں تو اس لڑکی کو اغوا کروا کے قتل کروا دوں جس کی وجہ سے ہمارا خون اپنی منگ لینے سے انکار کر رہا ہے۔“ شاہ زیب نے ڈائیلاگ ادا کیے۔

”نہیں دلاور خان نہیں' ہوگا تو وہی جو ہم چاہیں گے۔ بس ہم اپنے وارث کے دل کو ٹھیس پہنچانا بھی نہیں چاہتے۔ اپنے ارادوں کی ناکامی ہم نے کبھی سوچی ہی نہیں اور نہ ہی ہم ناکام ہونا جانتے ہیں۔“ سعد کسی فیوڈل لارڈ کی طرح دہاڑا۔ اس کی اس کمال ایکٹنگ پہ سبھی دیکھنے والے سراہ رہے تھے۔

”تو ادا سائیں! آپ نے کیا کرنے کا ارادہ کیا ہے؟“

”ارادہ...... ارادہ تو ہمارا بہت کچھ کرنے کا ہے اور ہم وہ سب کریں گے جو ہمارے ارادے ہیں۔ بس ہمیں صحیح وقت کا انتظار ہے' دلاور خان۔“ سعد چیخا اور تبھی ندا نے انٹری دی جو کہ ہیرو کی ماں یعنی فردوس خان کی بیوی کا رول ادا کر رہی تھی۔

”تم نے سنا ہوگا اپنے فرزند کی فرمائش کے بارے میں۔“ اب سعد ندا سے مخاطب تھا اور شاہ زیب بیک اسٹیج جا چکا تھا۔

”جی سائیں! سنا بھی اور اسے سمجھایا بھی...... لیکن وہ ہے کہ ایک ہی ضد پر اڑا ہے کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے اور وہ لڑکی ٹی وی پر کام کرتی ہے۔ طلاق یافتہ ماں کی بیٹی ہے لیکن منصور خان کے دل میں وہ نہ جانے کہاں سے آ بسی ہے۔“ ندا نے بڑی روانی اور مہارت سے ڈائیلاگ ادا کیے۔

”وہ نہیں سمجھے گا اور نہ باز آئے گا۔ اگر لڑکی ہوتی تو بندوق کی ایک گولی اس کے جسم میں جاتی اور ہمیں اس کی موت پر افسوس تک نہ ہوتا لیکن ہم کتنے مجبور ہو گئے ہیں اپنی اکلوتی اولاد کے پیچھے' لیکن کوئی بات نہیں ہم تم سے جو کہیں گے وہ تم اس لڑکی سے جا کے کہو گی اور پھر منصور خان کی شادی اسی لڑکی سے کرواؤ گی اور بعد میں کیا کرنا ہے وہ ہم خود سوچیں گے۔“ اپنا آخری فیصلہ سناتا ہوا لڑکے کا والد تیز قدموں سے بیک اسٹیج چلا گیا۔

اسٹیج کا پردہ گرایا گیا اور پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ہر طرف داد و تحسین تھی۔

پردہ ایک بار پھر اٹھا۔ اس بار منظر میں سمعان منصور خان اور مشال لیلیٰ بنی کھڑی تھی۔ تماشائیوں میں ڈرامہ دیکھتی کرن کے خون کی شریانوں میں پل بھر کو اشتعال اٹھا۔

''میری اماں تم سے ملنا چاہتی ہیں لیلیٰ اور مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے بعد ہماری شادی کے لیے رضامند ہو جائیں گی۔'' سمعان انتہائی اعتماد سے بولا۔

''اور اگر تمہاری اماں نے انکار کر دیا تو؟'' مشال بولی۔ ''اگر تمہارا رتبہ' تمہاری شان' تمہاری جاگیردارانہ اونچائی ہماری محبت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تو...... اگر ہماری معصوم محبت کو اونچی دیواروں نے روند دیا تو؟''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا لیلیٰ اور اگر ایسا ہوا...... تو اکھاڑ کے پھینک دوں گا میں ان دیواروں کو...... کہ جن کے درمیان ہماری محبت سانس نہ لے سکے۔ پاؤں سے روند دوں گا میں اس اونچائی کو کہ جو ہماری جیت کی راہ میں آئے۔ مجھے اس رتبے اس شان اس بڑائی کا گلا گھونٹنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی کہ جو مجھے تم سے جدا کرے۔'' سمعان نے کہا۔

''لیکن اگر کسی شرط کسی رکاوٹ نے تمہاری محبت کو بدل دیا تو؟'' لڑکی کے دل کا خدشہ بول اٹھا۔

''کیوں کر...... کیوں کر لیلیٰ! بدل پائے گی کوئی شرط میری محبت کو۔ تم سے میری محبت لمحوں یا پلوں پر نہیں صدیوں پر محیط ہے۔ میں اپنی جائیداد' مان' رتبے ہر چیز کو ٹھکرانے کو تیار ہوں۔ ہر چیز کو چھوڑنے پر رضامند ہوں۔ بس ایک تمہارے پیار کی طلب اور تمہارے ساتھ کی تمنا ہے مجھے اور کچھ نہیں۔'' سمعان کی آنکھوں سے چھلکتی شدت اور اس کے چہرے پر بکھرے عکس پل بھر کو مشال کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے وہ اسٹیج پر کھڑا کوئی کردار نہیں ادا کر رہا بلکہ واقعی میں مشال کا ہاتھ تھامے اسے اپنی سچائیاں سونپ رہا ہے۔ اس کے اندر اپنی محبت تحلیل کر رہا ہے۔ اس کا دل پل بھر کے لیے ایک الگ زاویئے سے دھڑکا۔ وہ چونکی۔ اسے لگا کہ وہ اپنے سارے ڈائیلاگ فراموش کر دے گی۔ اس لڑکے کی آنکھوں کی سچائیوں کا سامنا کر پانا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

تماشائیوں میں بیٹھی کرن شاہ کی آنکھیں پل بھر میں نم ہو گئیں۔ اسے یوں لگا کہ جیسے سمعان شاہ اداکاری نہیں کر رہا۔ وہ اپنے دل کی چاہت اپنے محبوب کے دل تک منتقل کر رہا ہے۔ اسے سونپ رہا ہے اور کرن کے اندر موجود سمعان کی محبت نے ایک درد بھری ٹیس سے کروٹ لی۔ فضا میں پھر سمعان کی محبت کی پکار اٹھی۔

فراموش کر دیا ہے میں نے دنیا کو تمہاری چاہت میں......

بھول گیا ہوں میں سب کچھ تمہاری آس میں......

اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا ہے میں نے۔ اب اگر تم نے بھی میری وفا کو تسلیم نہ کیا تو کہاں جاؤں گا میں۔ کس کو یقین دلاؤں گا اپنی شدتوں کا' اپنی چاہتوں کا' زمانے بھر سے زیادہ محبت کی ہے میں نے تم سے۔ نہیں جی پاؤں گا میں تمہارے بنا۔ نہیں تصور کر پاؤں گا زندگی کا تمہارے بنا۔'' پل بھر میں مشال کے ساتھ ساتھ بیک اسٹیج پر کھڑی بجل بھی چونک اٹھی تھی جس کے ہاتھ میں ڈرامے کے اسکرپٹ کی فائل تھی۔ سمعان جو کچھ بھی بول رہا تھا۔ وہ اسکرپٹ کا حصہ نہ تھا۔ وہ لفظ' وہ جملے' منصور خان کے کردار کا حصہ نہ تھے۔ وہ تو سید سمعان شاہ کے اندر کے الفاظ تھے۔ وہ جذبے سمعان شاہ کے دل کی محبت پہ مبنی تھے۔ وہ استعارے' سمعان کی محبت کے استعارے تھے۔

مشال کے سامنے ایک شدت پسند لڑکا کھڑا تھا جس کی آنکھیں وفا کی لو سے جگمگا رہی تھیں اور جس کے ہونٹ اقرار کی کپکپاہٹ سے جنبش میں تھے اور یہ کپکپاہٹ یہ جنبش مشال کو منتشر کیے جا رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

''منصور! کہیں تمہاری مضبوط حصاروں والی حویلی میں ہماری وفائیں قید تو نہیں کر دی جائیں گی۔ کہیں تمہارے سخت قسم کے رواجوں کے آگے ہماری صداقتیں بے موت تو نہ ماری جائیں گی۔'' مشال نے خود کو زبردستی لیلیٰ کے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ سمعان نے ایک بار پھر اپنے بھاری ہاتھ میں اس کا نازک سا ہاتھ تھاما اور اسے یقین دلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''اگر میری چاہتوں کی شدت پہ تمہیں یقین نہ ہو تو جو سزا دینا چاہو مجھے منظور ہے۔ میری منتظر سانسیں تمہارے قدموں میں ہیں۔'' وہ گھٹنوں پر بیٹھا اس سے اظہار محبت کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ کا لمس مشال کو اس کی شدتوں کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ دونوں پل بھر کو خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک بار پھر مشال کا دل دھڑکا۔ یہ سراسر وہ الفاظ نہ تھے جو منصور خان کو کہنے تھے۔ یہ الفاظ تو سمعان کے ذہن کی پیداوار تھے اس کے دل کی پکار۔

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اسٹیج کا پردہ گرایا جا چکا تھا۔ پوری دنیا کے سامنے سمعان نے اپنے دل کا بھید مشال کو سونپ دیا تھا۔ وہ دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں ٹکائے اسی طرح کھڑے تھے۔

اور کرن شاہ اس پورے منظر کو دیکھ کر اپنا پورا وجود اشتعال میں محسوس کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اب آنسوؤں سے تربتر تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں بیٹھی ڈرامے میں نہیں حقیقی زندگی کی کہانی میں ہے اور سمعان اس کے دل کی دھڑکن کسی اور سے اپنی وفا کا اظہار کر رہا ہے۔

اور پھر یہ احساس ہی کتنا بھیانک ہوتا ہے کہ جسے آپ نے چاہا ہو وہ اپنی چاہتیں کسی اور کی جھولی میں ڈال دے جسے آپ نے مانگا ہو وہ اپنے لیے کسی اور کو مانگے جو آپ کے دل میں دھڑکے اسے کسی اور

کے دل کی دھڑکنیں اپنے اندر محسوس ہو رہی ہوں۔''

''سمعان! سین چینج ہونا ہے پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔'' مشال نے التجا کی۔

''آئی لو یو مشال!'' وہ اس کے قدرے نزدیک آ کے سرگوشی میں بولا۔

''سمعان۔'' وہ بولی۔

''میں تیری ذات کا حصہ ہوں۔ میں تیری سوچ میں شامل ہوں۔'' سمعان مسکرا کے بولا مگر اس کی آنکھیں سنجیدہ تھیں۔

''تو وہ آپ نے...... بھیجا۔'' مشال کے لفظ توڑ پھوڑ کا شکار تھے اور ذہن بھی۔

''میں تیرے خواب کا حاصل ہوں
میں تیری یاد کا محور ہوں''

وہ پھر اسی روانی اور اسی شدت سے بولا۔ اب کے مشال مسکرا دی اور زبردستی اپنا ہاتھ چھڑا کے بیک اسٹیج کی طرف دوڑی۔

آخری کلائمکس سین شروع ہو چکا تھا۔ پورا ہال خاموش تھا کہ اتنے دلچسپ ڈرامے کا اینڈ آخر کس طرح ہوگا۔ ڈرامے کی ہیروئن یعنی مشال منصور خان کی دلہن کے روپ میں کھڑی تھی اور اس کا سسر یعنی فردوس خان منصور کو سامنے کھڑا کیا چیخ رہا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے منصور خان! اپنی پسند کو۔ ملا دی ناں تمہاری اور تمہارے خاندان کی عزت مٹی میں۔ کر دیا ناں تماشا ہماری عزتوں کا۔ ہماری اونچی پگڑیوں کا۔''

''نہیں بابا سائیں نہیں' میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ نہیں منصور میں بے قصور ہوں۔'' لیلیٰ کی آواز میں بے گناہی کی پکار تھی۔

''خاموش لڑکی! ہم نے خود تمہیں دیکھا ہے۔ حویلی کے ملازم کے ساتھ اور ہمیں یقین ہے کہ منصور خان اپنے بابا سائیں کی زبان پہ اعتبار کرے گا۔''

گردن جھکائے کھڑا منصور خان اک عجب اضطراب میں تھا۔

''کاری ہے یہ' اس کا وجود۔ اس نے ہماری حویلی میں ہی رہ کر ہمارے خاندان پر کاری کا داغ لگایا ہے منصور خان اور جس طرح ہر کاری کا فیصلہ ہوتا ہے اس کا بھی وہی ہوگا۔ بے عزتی کی موت۔ ذلت سے مار ڈالو اس کو منصور خان۔'' فردوس خان چیخا۔

''لیکن بابا سائیں بنا ثبوت کے تو ہمارا دین بھی......'' منصور کی زبان کپکپا رہی تھی۔

''منصور خان اپنے بابا سائیں کی بات کو جھٹلا کر تم ہمیں دین کی بات سکھا رہے ہو۔ ہم نے جو کہا ہے وہ کرو ورنہ اس کلنک کو ہم خود اپنے ہاتھوں سے سزائے موت دیں گے۔''

''بابا سائیں اگر آپ لوگ مجھے موت دینا چاہتے ہیں تو بے شک دے دیں لیکن یہ الزام سراسر جھوٹ ہے۔ میں نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔'' لیلیٰ کی آنکھیں اور لہجہ دونوں نم تھے۔

''یہ لو منصور خان اور فیصلہ کر دو اس کا۔'' فردوس خان نے اپنے بیٹے کو بندوق تھمائی۔

''بابا سائیں کوئی اور حل بھی تو ہو سکتا ہے اس مسئلے کا۔'' وہ دبی دبی آواز میں بولا۔

''تم چاہتے ہو کہ اسے سنگساری کی موت ملے۔ فردوس خان جب دوسروں کی بیٹیوں کو کاری کی سزا میں مروا دیتا ہے تو اپنی بہو بیٹیوں کو معاف کر دے کیونکر۔'' وہ دھاڑا۔ ''مجھے دو یہ بندوق۔''

فردوس خان نے بندوق اس سے چھین کے فوراً ہی اس کا ٹریگر دبا دیا اور گولی سیدھی لیلیٰ کے جسم کے اندر چلی گئی۔ ایک گولی' پھر دوسری......

''بابا سائیں۔'' اور تیسری گولی منصور خان نے آگے ہو کے اپنے سینے پر لے لی۔

''منصور خان۔'' فردوس خان نے چیخ ماری اور بندوق پھینک دی۔

''محبت کبھی کاری نہیں ہوتی بابا سائیں! محبت کبھی کاری نہیں ہو سکتی۔'' زمین پر گرتا ہوا منصور خان خون میں لت پت تھا اور لیلیٰ تو پہلے ہی سانسوں کو سمیٹ چکی تھی۔

اپنے کیے کا پھل فردوس خان کو مل چکا تھا۔ ایک فیوڈل لارڈ کے سر کا تاج اس کا اکلوتا وارث محبت پہ قربان ہو چکا تھا۔

اسٹیج کا پردہ گرا۔ ہال میں ایک شور اٹھا۔ ہر طرف ان کی اس بہترین اداکاری اور تحریر کو سراہا جا رہا تھا۔ تالیوں' سیٹیوں کا ایک شور تھا' اک گونج تھی۔

فیصلہ ہوا اور ان کے ڈرامے کو بہترین پلے کا ایوارڈ ملا اور پچاس ہزار روپے کیش بھی۔

☆

سمعان کی محبت اس کے چاروں جانب اپنی جھانجھریں بجائے ہوئے تھی۔ اس کی محبت نے مشال کے دل کے دروازے پر دو انگلیوں سے ہلکی سی دستک کیا دی تھی۔ اس نے تو دل کی نگری کے تمام دروازے اس پر کھول دیے تھے جہاں وہ پورے اختیار سے آ بیٹھا تھا۔ کچھ اس طرح کہ جیسے یہ دل مشال کا نہ ہو۔ اس کا اپنا ہو۔ اس کی ملکیت اس کی جائیداد کا ایک حصہ۔ تنہائیوں میں بھی جب مشال کو اس کی آنکھوں سے چھلکتی شدت اور ہونٹوں سے لرزتے اقرار کا خیال آتا تو وہ خوشی سے مسکرا دیتی۔ اتنی محبت کرتا تھا سمعان شاہ اس سے۔ اتنی چاہت چھپا رکھی تھی اس شدت پسند لڑکے نے اپنے اندر۔ کیا وہ اتنی خاص تھی؟ اتنی اسپیشل کہ جس کو اس طرح چاہا جائے جس کے خوابوں کو اس طرح آنکھوں کی گود میں سلایا جائے' جس کے تصور کو ستاروں کی طرح دل کے آنچل میں ٹانکا جائے سچ یہ محبت انسان کو کتنا الگ کتنا مختلف بنا دیتی ہے۔ کتنے میٹھے تصور وابستہ کر دیتی ہے انسان کے دل سے۔

رات بھر وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے ماحول کی خنکی میں سمعان کے لیے اپنی محبت کو محسوس کرتی رہی۔ صبح یونیورسٹی گئی تو سب سے پہلے اس کا سامنا بھی اسی ظالم سے ہوا کہ جس نے چڑیا سے دل کو اپنی دسترس سمجھ کر اسے قید کر لیا تھا۔

آنکھوں کے ایک موہوم سے تبادلے کے بعد وہ اس کے ہمراہ چلتی لائبریری کے پاس بنے پارک میں آ گئی۔ پارک میں پھولوں کی کیاریوں کو شاید نیا نیا ہی اگایا گیا تھا۔ سوندھی خوشبو گیلی زمین سے اٹھ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے کچھ آوارہ ٹکڑے اڑ رہے تھے اور دھوپ کی تمازت میں کمی کا باعث بن رہے تھے۔ وہ دونوں کونے میں لگی بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہ تو خاموش تھی ہی لیکن سمعان کو بھی الفاظ ڈھونڈنے سے نہیں مل رہے تھے۔ وہ جو لفظوں کا جادوگر اور نظموں کا سوداگر کہلاتا تھا آج اس طرح چپ تھا۔

''جانتی ہو مشال تم بہت ہی اسپیشل لڑکی ہو۔ بہت خاص بہت الگ۔ تمہیں دیکھا تو پتا ہی نہ چلا کہ کب تم مجھے پسند آئیں اور کب اس پسند نے یہ احساس دلایا کہ میں محبت ہوں...... مجھے دیکھو' مجھے جانو' مجھے سمجھو۔'' کئی لمحوں بعد سمعان نے آخر حروف جوڑ ہی لیے۔

''کئی دنوں تک میں سوچتا رہا۔ خود سے الجھتا رہا کہ نہیں سمعان' ایک بار پھر سوچ لو۔ اپنے دل کو پرکھ لو۔ اپنے ارادوں کو بھانپ لو لیکن ہر بار میرے دل نے وہی جواب دیا۔ مشال ہے تو سب ہے' مشال نہیں تو کچھ نہیں۔ میرا ساتھ دو گی مشال؟ میری وفاؤں پہ یقین کرو گی؟ میری بنو گی؟'' وہ اس کے اقرار کا منتظر تھا اور وہ اپنے ہونٹوں پر چپ کے قفل چڑھائے اپنے دوپٹے کو انگلی میں اڑسے جا رہی تھی۔

''کہو نا مشال یقین کرتی ہو مجھ پر۔ بے اعتبار میری صداقتوں پہ بولو ناں۔'' وہ بے قرار سا اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل تھیں۔

''مجھے اعتبار سا ہو گیا ہے تم پر سمعان۔ میں یقین کرنے لگی ہوں تمہاری صداقتوں پر۔'' وہ گھاس پر نظریں ٹکائے بولی اور سمعان کے لبوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

تبھی وہاں ان کے گروپ کے باقی لوگ آ گئے۔ کرن کے سینے میں ان دونوں کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ چنگاریاں سلگ اٹھیں۔

''یہ لو یہ ہیرو ہیروئن یہاں بیٹھے ہیں اور ہم آدھی یونیورسٹی چھان آئے۔'' سعد نے دور سے ہی دہائی دی۔

''کیوں ہمیں کیوں ڈھونڈ رہے تھے تم لوگ۔'' سمعان مسکرایا جس کو جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا۔

''بھئی جوڑی آف دی ایئر ہو۔ انعام جیتا ہے تم لوگوں نے۔ مشال نے اتنا اچھا ڈرامہ لکھا اور تم دونوں نے اس قدر زبردست ایکٹنگ کی۔ کوئی ٹریٹ شریٹ تو ہونی چاہیے۔'' کوہتا نے کہا۔

''صرف ٹریٹ سے کام نہیں چلتا۔ کوئی ٹرپ ہونی چاہیے۔'' شاہ زیب نے اعتراض کیا۔

''تو ٹھیک ہے کسی دن ہاکس بے چلتے ہیں۔'' سمعان نے کہا۔

''ہاکس بے نہیں کہیں باہر لے چلیں۔ اتنے سارے پیسوں سے ہم کیا کریں گے۔ گھوم پھر ہی آئیں۔'' سعد نے کہا۔

''چلو کسی ہل اسٹیشن چلتے ہیں۔'' ندا نے آئیڈیا دیا۔

''مری میں میرے پاپا کا ایک گھر ہے جو کہ اکثر بند رہتا ہے اگر وہاں چلو تو میں انتظام کرا دوں گی۔ کم از کم رہائش کا خرچہ نہیں ہوگا۔'' مشال نے کہا۔

''یار اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ بناؤ پروگرام مری جانے کا۔'' ندا کھلکھلا اٹھی۔

''کون کون چلے گا۔'' شاہ زیب ہمیشہ کی طرح ارینجمنٹ کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''سبھی چلیں گے۔ کوہتا' میں' تجل' مشال' سعد اور کرن بھی۔'' سمعان بولا۔

''نہیں مجھے نہیں جانا۔'' کرن نے منہ بسورا۔

''ارے کیسے نہیں جانا۔ تمہارے کزن صاحب تو ساتھ ہی ہوں گے تمہارے گھر والوں کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' اسے تجل نے گھر کا۔

''او کے فائنل ہم اس جمعہ کو نکل چلیں گے اور تین چار دن خوب انجوائے کریں گے۔'' شاہ زیب بولا۔

''گر تم لوگوں کو برا نہ لگے تو میں اپنے کزن عمر کو بھی وہاں بلوا لوں۔'' ندا نے اپنے دل کی بات کھول ہی دی۔ مشال مسکرا دی۔

''بلا لینا لیکن اسے کہنا اپنا خرچہ اپنے ساتھ ہی لائے۔'' سعد کی بات پر سبھی کھلکھلا کے ہنس دیے۔ اس طرح سبھی ٹرپ پہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

*

آگہی کو جب ان کہی کا بھید مل جائے تو زندگی کی سمت یکسر بدل جاتی ہے گپ چپ سے راز کو جب اقرار کی لذت نصیب ہو جائے تو فضائیں ایک نئی نئی سی خوشبو حسیات میں گھولتی ہیں اور یکطرفہ محبت جب اپنے وجود کی دبیز چادر دونوں سمتوں میں پھیلا دے تو دل پر پڑنے والی ناآشنا سے احساسات کی اوس کتنی بھلی لگتی ہے۔

سمعان کی محبت کی آگہی اور اس کی ان کہی کا بھید مشال نے قبول کر لیا تھا اور وہ دونوں فضاؤں میں محبت کی ایک نئی نئی خوشبو کو گھلتے ہوئے پھیلتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔

ان کا گروپ کوہِ مری کی خنک وادیوں میں اپنی پوری شرارتوں اور شوخیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ مشال نے اپنے پاپا سے کہلوا کر وہ گھر کھلوا دیا تھا جو کہ اس کے نام پاپا نے کیا تھا اور اسی گھر میں تو اس کی

ماما کی یادیں بسی تھیں۔ یہیں سے تو ان کی روح نے پرواز کا سفر شروع کیا تھا۔ جب ان کا مرض لاعلاج ہو گیا تو انہوں نے دنیا سے دور کسی پر سکون جگہ جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور تب ننھی سی مشال کو لے کر وہ لوگ یہاں آ گئے تھے۔ صرف چند ماہ ہی قدرت کے ان خوب صورت نظاروں میں گزارنے کے بعد اس کی ماما ان سے بچھڑ گئیں اور اس گھر کے در و دیوار میں اپنی دلفریب مہک چھوڑ گئیں۔

اور پھر اسی خوب صورت شہر کی فضاؤں میں مشال کی محبت سانس لینے لگی۔ وہ اور سمعان ایک دوسرے کو جاننے لگے۔ پہچاننے لگے۔ دلوں کے زاویے پیچ ہونے لگے اور یہ دھند بھری مہکی فضائیں کتنے ہی وعدوں سے مہکنے لگیں۔ کتنے ہی سپنوں سے بوجھل ہونے لگیں۔ شفاف دھوپ کی پہنائیوں میں کتنی ہی یادیں ترتیب پانے لگیں اور ایسے میں یہ محبت بھرے پر رونق لمحے کرن شاہ کے دل پر ان دیکھا بوجھ ڈالنے لگے۔ اس کے اندر سمعان شاہ کی محبت اور اس سے منسوب ہونے کی خواہش کلبلانے لگی۔

رائیگاں جانا وہ چاہتی نہ تھی اور اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اپنی چاہت کو یوں چھنتا ہوا دیکھ نہ پاتی تھی۔

ان دونوں کو اکیلے میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنستے دیکھ کر اس کا بدترین خدشہ سچائی کا روپ دھارنے لگتا۔ محبت کی بازی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ ہار گئی تھی۔ وہ کسی عدالت کا در کھٹکھٹانا چاہتی تھی' کسی کو آواز دینا چاہتی تھی جو اس کی محبت کو تند لہروں میں ڈوب جانے سے بچا سکے۔ وادیوں کی نرم و نازک دھوپ اس کے وجود کو جلائے جا رہی تھی۔ وہ اتنے سارے دوستوں کے بیچ بھی تنہا تھی۔ سبھی لوگ ہنستے' کھلکھلاتے' تصویریں اتارتے' مشال اور سمعان آنکھوں کے اشاروں سے کئی باتیں کرتے اور وہ ہر کسی کا چہرہ تکتی رہ جاتی...... یا ان سب کے چہروں پر شناسائی کے سائے تلاش کرتی۔

مشال اور سمعان کی بے آواز اٹھکیلیوں کے درمیان کرن کا وجود معلق تھا ایک زندہ محبت کی ماورائی کے بیچ ایک مردہ محبت کا بے کل وجود وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی کہ وہ سمعان پر اپنی محبت اپنے تئیں ظاہر تو کر دے لیکن پھر احساس تذلیل بیچ میں سینہ تانے کھڑا ہو جاتا۔

اظہار وہاں پہ آمنا صدقنا کا درجہ پاتے ہیں جہاں محبتوں کی کونپل موجود ہو...... جب مٹی میں بیج ہی نہ ہو تو آس یا امید کا شجر کیونکر کھڑا کیا جائے۔

کتنی اذیت سے اس نے یہ چار دن گزارے۔ پانچویں دن ان کی واپسی تھی لیکن ندا نے شور مچایا۔

''کیا یار کتنا مزہ آ رہا ہے۔ کم از کم ایک ہفتہ تو پورا کر لو۔'' ندا تو اپنے محبوب عمر کے ہمراہ ہزاروں نئے خواب بن رہی تھی۔ مرضی تو شاید سمعان کی بھی یہی ہوتی لیکن کرن بول پڑی۔

''کیا یار اس طرح سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جانا۔ کتنی کلاسز مس کر چکے ہیں ہم اور پھر سمسٹر ایگزام بھی سر پر ہیں۔''

''کیا کرو گی اتنی محنت کر کے کرن! ابھی تو دو ماہ ہیں ایگزام میں' انجوائے کر لو۔'' سعد مسکرایا۔

''سمعان کیا تمہیں یاد نہیں کہ نزہت آپی کی شادی کی تاریخ رکھنے بھی ہم نے اسی ماہ کے آخر میں جانا ہے۔'' وہ سمعان سے مخاطب تھی۔

''یاد ہے بابا سب یاد ہے۔ نزہت میری بہن ہے کرن۔ مجھے یاد نہ ہو گا تو پھر کسے ہو گا لیکن ابھی اس پل کو تو انجوائے کرو۔ کل کی کل سوچیں گے۔'' سمعان اسی اطمینان سے بولا۔

''او کے یارو! یعنی میں کل کی ٹکٹیں بک نہ کرواؤں۔'' شاہ زیب آخر میں بولا تھا۔ سبھی نے ہامی بھر لی اور ہمیشہ کی طرح کرن خاموش ہو گئی۔

''ویسے یار' تمہاری فیملی کا یہ سسٹم ہے بڑا آسان۔ خاندان ہی کے دولہے خاندان ہی کی دلہن۔ جانتی ہو مشال نزہت کی شادی کرن کے بڑے بھائی فراز شاہ کے ساتھ ہو رہی ہے۔'' کویتا نے انفارمیشن دی۔

''اور اسی طرح کرن کی سمعان کے ساتھ متوقع ہے۔'' شاہ زیب نے مذاق کیا سبھی ہنس دیے۔ ماسوائے سمعان اور مشال کے اور کرن کی آنکھیں سمعان کے چہرے پر بھٹک گئیں جسے یہ مذاق پسند نہ آیا تھا۔

''کوئی ضروری تو نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ سبھی نے اس بات کو بھی مذاق ہی سمجھا لیکن کرن کے دل میں ایک عجیب سے احساس نے سر اٹھایا۔ ٹھکرائے جانے کے احساس نے۔

اور پھر اگلی ہی صبح سیڑھیوں پر ایک آواز ہوئی۔ سبھی دوڑتے گئے تو پتا چلا کہ کرن سیڑھیوں سے پھسل کر گر چکی ہے اور اس کی ٹانگ میں شدید چوٹ آئی ہے ڈاکٹر کو بلا کے اس کے زخم کی پٹی کروائی گئی۔

شام کو سبھی کا بھوربن جانے کا پروگرام تھا لیکن کرن کا جانا ممکن نہ تھا اس لیے اس کی دیکھ بھال کے لیے سمعان گھر پر ہی رک گیا اور مشال باقی سب کے ساتھ چلی گئی۔

اگلے دن مجبوری جان کر سبھی کو واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا اور اس طرح ان کے اس ٹرپ کا اختتام ہوا۔

*

''جانتے ہو شاہ زیب مشال تمہیں پسند کرتی ہے۔'' کرن کے بلاسٹ کیے اس بم پر شاہ زیب کے منہ تک گئی چائے کی پیالی وہیں کی وہیں تھم گئی وہ چونک گیا۔

''پاگل تو نہیں ہو گئی ہو کرن کیا کہہ رہی ہو تم۔''

''نہیں ہوئی ہوں میں پاگل۔ روم میٹ ہے وہ میری اس نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔'' کرن نے اعتماد سے جھوٹ کو ثابت کرنا چاہا۔

''مجھے تو اس کی کسی بات سے کبھی محسوس نہیں ہوا۔'' وہ حیران ہی تو تھا۔

''اسے بھی یہی شکایت ہے تم سے کہ تم نے کبھی اسے سمجھنے کی محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ شاہ زیب لڑکیاں بہت گہری' بہت ڈیپ ہوتی ہیں اور محبتیں تو وہ کسی صورت کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ محبت انہیں خود پہچان لے خود ان کے آنچل تھام لے اور محبوب خود چل کر ان سے کہے کہ تم میری چاہت' میری محبت ہو۔'' کرن اسے آمادہ کر رہی تھی اور وہ بدستور خاموش تھا۔ کیسے اور کب جیسے سوالیہ دائروں کے گرد سفر کر رہا تھا۔ ''کیا تم اسے پسند نہیں کرتے زیب؟ اس جیسی اسپیشل لڑکی کی چاہتوں کی قدر نہیں ہے تمہیں۔''

''نہیں کرن ایسی بات نہیں ہے۔ بس مجھے پتا نہیں کیوں بے یقینی سی ہے۔ کافی عرصے سے ہم سب دوست ہیں مگر نہ اس کی باتوں اور نہ اس کی آنکھوں ہی سے پتا چلا اس کی فیلنگز کا پھر......'' شاہ زیب بولا۔

''پھر یہ کہ تم اس کے دل میں اپنی پسند کا احساس جگاؤ۔ اس کے اندر اپنی محبت کے بیج بوؤ اور ہاں اسے یہ مت بتانا کہ میں نے اس کے دل کا یہ بھید تم پر کھول دیا ہے۔ بے حد ناراض ہوگی وہ۔'' کرن نے مسکرا کے اسے یقین دلایا اور شاہ زیب مسکرا دیا۔

اس کے دل میں اس احساس نے جنم لے لیا کہ مشال جیسی لڑکی اسے چاہتی ہے اور وہ اس سے بے خبر ہے۔ چاہے جانے کا احساس یوں بھی ماورائی ہوتا ہے اور پھر وہ چاہت اگر مشال جیسی اپسرا سے منسوب ہو جائے تو پھر کائنات کو مٹھی میں بھر لینے کا سا احساس ہوتا ہے اور کچھ اسی طرح کا احساس شاہ زیب کے دل میں بھی تھا۔

کرن اپنے ایک جھوٹ سے شاہ زیب کے دل میں ایک احساس پیدا کر پائی تھی۔ اب باری تھی سمعان کے دل کی جس سے مشال کی محبت کے احساس کو جڑ سے اکھاڑنا تھا۔ اس کے بعد سمعان کا حصول کوئی اتنا مشکل بھی نہ تھا۔ گھر کا لڑکا تھا۔ دیکھا بھالا۔ بس بی جان کے کانوں تک یہ بات پہنچانی تھی کہ وہ سمعان کو چاہتی ہے اور پھر بی جان اپنے بیٹے سکندر شاہ کو راضی کر لیتیں اور سکندر شاہ کا کہا سمعان نہ ٹال سکتا۔

باقی سب کچھ تو بہت آسان تھا بس سمعان کے اندر مسکراتی مشال کی محبت سے اسے خوف آتا تھا کہ کہیں وہ محبت اپنی صداقتوں کو تھامے چوڑا سینہ کیے اس کے جھوٹ کے آڑے نہ آ جائے کہیں وہ طاقت ور شے اس کے ہر احساس کی نفی نہ کر دے......

اور پھر اگلے ہی دن ان کے گروپ کے ہر فرد کی زبان پر ایک دبی دبی کہانی تھی کہ شاہ زیب مشال سے محبت کرتا ہے اور یہ کہانی بھی کرن ہی کی زبان سے نکلی تھی۔ سجل کے علاوہ تقریباً ہر کوئی یقین کر بیٹھا اور شاید سجل بھی کر لیتی لیکن ڈرامے والی شام اس آنکھوں دیکھے اقرار کی گواہ تنہا وہی تو تھی۔

سمعان اور مشال دونوں ہی تقریباً اس بھید سے بے خبر اپنی نئی نویلی محبت کی نوک پلک سنوارنے میں مگن تھے۔ دونوں ہی اپنی زندگی کی سب سے خوب صورت فیلنگز کے گرد و نواح میں رقصاں تھے۔ لائبریری میں' کینٹین میں' لان میں کئی لمحے ایک دوسرے کی قربت میں گزارنا جیسے ان کا مشغلہ بن گیا کھٹے میٹھے خواب بننا زندگی سے اچھی اچھی امیدیں وابستہ کرنا۔ ان دونوں کے لیے کتنا رنگین' کتنا جاذب تھا۔ یہ تمام باتیں گو کہ کرن سے پوشیدہ نہ تھیں لیکن وہ خاموش تھی مصلحت کوشی کی چادر لپیٹے وہ چپ تھی۔

اور پھر انہی دنوں مشال اور سمعان کی محبت کی زندگی میں پہلی جدائی آئی کہ جب چند دنوں ہی کے لیے سہی سمعان کو کرن کو ساتھ لے کر سادات حویلی پہنچنا تھا۔ اپنی بہن نزہت کی شادی کی تاریخ رکھنے۔

اس مختصر سی جدائی نے بھی مشال کے اندر دھڑکتے ننھے سے دل میں خدشوں کے ہزار ہا دھڑکے پیدا کر دیے اور اس نے نم آنکھوں سے سمعان کو وداع کیا۔

''کیوں روتی ہو۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ نزہت آپی کی شادی ہو جائے تو بی جان سے ضرور تمہاری بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات ٹالیں گی نہیں۔'' سمعان نے اس کے قدرے قریب جا کے ایک بات کہی اور اس کے کان میں پڑا بندہ بھی شرم سے دوہرا ہو گیا۔

''جلدی آنا سمعان! میں منتظر ہوں گی اور ہاں اپنا موبائل کبھی آف مت کرنا۔'' مشال نے تاکید کی۔

''اور حکم میڈم جی۔'' سمعان نے چھیڑا۔

''اور کھانا وقت پر کھالینا' وقت پر سونا اور مجھے خوب یاد کرنا۔'' مشال کے لہجے کی شوخی سمعان کے دل میں کلیاں کھلا گئی۔

اور اس طرح سمعان اسے کراچی چھوڑ کر کرن کے ہمراہ اپنے آبائی گاؤں آ گیا جہاں پہ وہ ایک شوخ' چنچل اور رومینٹک سمعان سے پرے اک معتبر' رتبے اور قدر والا' اہلِ سادات کے پگ وار فیوڈل کا وارث' سید سمعان شاہ تھا جس کی حویلی کے اندر پوری برادری اور گاؤں کے تمام فیصلے تشکیل پاتے تھے۔ جہاں پر مرید اپنی منتیں پوری کروانے آتے تھے۔ سمعان کے دادا پیر برکت علی شاہ کے بنے مزار پر لوگ چادریں چڑھاتے اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے تھے اور منتیں پوری ہو جانے کے بعد وہیں آ کے چڑھاوے اور دیگیں بانٹتے اور بکریاں ذبح کرتے۔

خاندان کی عورتوں کا پردہ اس قدر سخت تھا کہ ان کے گھر کی کسی بھی عورت کو بے پردہ باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ گھر میں ٹی وی پر پابندی تھی۔ شادی سے قبل بناؤ سنگھار کو برا مانا جاتا تھا اور اگر خواتین باہر جاتیں تو گاڑیوں میں پردے لگائے جاتے۔

اس طرح کے گھٹن زدہ ماحول میں عورتوں کی تعلیم گویا خواب ہی تھی جسے سکندر شاہ کی چھوٹی بیٹی

نزہت اور آذر شاہ کی اکلوتی کرن نے تعبیر کا روپ دیا۔ نزہت نے پرائیویٹ ایم اے کیا اور کرن نے انتہائی ضد کر کے سمعان کے ہمراہ کراچی میں جا کر پڑھنے کی ضد کی جسے بی جان نے بڑی مشکلوں سے اپنے بیٹوں سے منوایا۔

خاندان کی زیادہ تر شادیاں بھی خاندان ہی میں طے پاتیں۔ سمعان کی دونوں بڑی بہنیں اپنی پھوپھی کی بہوئیں تھیں اور نزہت کی شادی اب کرن کے بھائی فراز شاہ سے طے ہونے جا رہی تھی۔ سبھی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے حویلی میں جمع تھے۔ ہر کوئی منتظر تھا۔ سکندر شاہ کا کہ وہ کون سی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

”ہاں سکندر شاہ بولو کیا تاریخ سوچی ہے بچی کی شادی کی۔“ یہ ان کی والدہ بی جان تھیں۔

”اماں سائیں فیصلہ تو وہی ہوگا جو آپ چاہیں لیکن ہم نے اور آذر شاہ نے مل کر پانچ ربیع الاول کی تاریخ سوچی ہے۔ چار پانچ ماہ بھی رہتے ہیں۔ شادی کی تیاری بھی ہو جائے گی۔“ سکندر شاہ نہایت ادب سے بولا۔

”لیکن سکندر شاہ! گھر ہی کی تو بات ہے۔ لڑکا بھی گھر کا اور لڑکی بھی پھر اتنی دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ذی الحج کا چاند ہوتے ہوتے رخصتی کی جائے اور اس فرض سے بھی سبکدوشی حاصل ہو جائے۔“ بی جان نے مشورے کے طور پر ہی اپنا فیصلہ سنایا۔

”تو پھر ٹھیک ہے بی جان ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیوں آذر شاہ۔“ سکندر شاہ نے کہا۔

”بے شک ادا سائیں ہم تیار ہیں۔“ آذر شاہ مسکرا دیا اور اس طرح چار ماہ بعد ہونے والی شادی اب دو ہی ماہ بعد طے پائی۔

☆

”کتنے روکھے پھیکے بال ہو گئے ہیں تیرے کرن۔ تیل ویل کیا شہر میں نہیں ملتا۔“ بی جان کرن کی لمبی سیاہ زلفیں بکھیرے اس سے مخاطب تھیں۔

”تیل تو ملتا ہے لیکن وہاں پر میری پیاری بی جان کے نرم نازک ہاتھ نہیں ملتے۔“ کرن نے بی جان کے جھریوں سے بھرے ہاتھ آگے کر کے چوم لیے۔

”چل چل رہنے دے۔ اتنا ہی پیار ہوتا تجھے اپنی بی جان سے تو شہر سے جلدی ملنے نہ آ جاتیں۔ کیوں اتنا انتظار کرواتیں۔“ بی جان انتہائی مہارت سے اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے بولیں۔

”اتنی ٹف پڑھائی ہے بی جان اور پھر شہر کوئی پڑوس میں تھوڑی ہے۔ سمعان کو تو بالکل یاد ہی نہیں رہتا یہاں آنا۔ وہ تو میں ہی اسے گھسیٹ کے لاتی ہوں۔“

”یہ سمعان بھی ناں...... ابھی تک بڑا نہیں ہوا۔ اس کے لیے بھی کسی رسی کھینچنے والی کا انتظام کرنا ہی

پڑے گا۔ تب عقل آئے گی اس کو۔“ بی جان نے کہا۔ کرن کو یہی موقع اپنے دل کی بات کہنے کے لیے موزوں محسوس ہوا۔

”ایک بات کہوں بی جان آپ برا تو نہیں مانیں گی۔“

”کہو بیٹا اگر بات صحیح ہوگی تو میں برا کیوں مناؤں گی۔“

”بی جان میں...... میں سمعان...... سمعان کو پسند کرتی ہوں۔“ وہ قدرے اٹک اٹک کر بولی۔ بے شک بی جان سے اس کی محبت دوستی نما تھی لیکن جھجک بہرحال تھی۔ بی جان کے ہاتھ اس کے بالوں میں چلتے چلتے رک گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگیں۔

”کیا ہوا بی جان، میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔“ کرن نے مڑ کے بی جان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”نہیں تم نے کچھ غلط نہیں کہا لیکن یہی بات جو سالوں سے ہمارے دل میں تھی یہ ہم کو کہنی چاہیے تھی۔ تمہارے منہ سے یہ سن کر پتا نہیں کیوں اچھا نہیں لگا۔“ بی جان سنجیدگی سے بولیں۔ ”یہ ہم نے بہت پہلے ہی سوچ رکھا تھا اور تمہارے یونیورسٹی چلے جانے کے بعد تو دل جیسے مچلنے لگا کہ ہم کو جلد از جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔ تم شہر اتنی دور اگر اپنے محرم کے ساتھ رہو تو شاید ہماری ساری فکریں دور ہو جائیں گی۔ ہم کل ہی سکندر شاہ سے بات کریں گے اور فراز شاہ کے ہمراہ تمہارا نکاح بھی پڑھوا دیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔“ بی جان کا لہجہ ٹھوس تھا۔ کرن نے مشال کے بارے میں بی جان کو بتانا مناسب نہ سمجھا اور اپنا سر چپکے سے ان کی گود میں ٹکا لیا۔

وہ لان میں کھڑی پودوں کو پانی دے رہی تھی کہ جب سمعان سفید کرتا شلوار میں ملبوس اس طرف سے گزرا۔ وہ یونیورسٹی والے سمعان سے کتنا مختلف لگتا تھا حویلی آ کر اس کی چھب کتنی بدل جاتی تھی۔

”سمعان۔“ اس نے اسے تیز رفتاری سے جاتے دیکھ کر آواز دی اور اس کے آواز دینے پر سمعان کے قدم رک گئے تھے۔ وہ مڑا اس نے کرن پر نظر ڈالی اور اس کی طرف آ گیا۔

”ہاں بولو کیا بات ہے کیوں بلایا ہے؟“

”حویلی آ کے تو تم پہچاننا بھول جاتے ہو۔ پوچھنا یہ تھا کہ واپسی کا کیا پروگرام ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”بابا سائیں کے ساتھ ابھی مجھے زمینیں دیکھنے جانا ہے۔ سوچ رہا ہوں آج شام ہی نکل جاؤں۔ تم چاہو تو رہ سکتی ہو بعد میں فراز شاہ کے ساتھ آ جانا۔“ سمعان نے عجلت میں کہا۔

”تمہیں کیا جلدی ہے سمعان۔ اگر تم بھی رک جاتے تو پڑھائی کا کوئی اتنا حرج تو نہیں ہو جاتا۔“ کرن نے ذو معنی لہجے میں کہا۔

”ہاں لیکن جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا تھا وہ تو پورا ہو ہی گیا۔“ سمعان کے چہرے پر دھوپ کی کرنیں چمک کر گلابی رنگ دوڑا جاتیں۔

''یہ کہو ناں سمعان کہ مشال کی یاد آ رہی ہے۔'' کرن کے یہ کہنے پر سمعان بے تاثر چہرہ لیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ ڈر کا اور نہ پکڑے جانے کے احساس کا۔

''ویسے جانتے ہو آج کل ہمارے گروپ میں کون سی بریکنگ نیوز چل پھر رہی ہے۔'' کرن نے پانی کے پائپ کے ساتھ ساتھ بات کا بھی رخ موڑا۔

''کون سی؟'' وہ اسی متانت سے بولا۔

''شاہ زیب اور مشال کی محبت کی۔'' کرن محبت پر زور دے کر بولی۔

''کیا۔'' اب کے سمعان کے چہرے پر ایک تاثر ابھرا۔

''ہاں چاہو تو پوچھ لینا کسی سے۔ ہر کسی میں یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ شاہ زیب مشال میں انٹرسٹڈ ہے۔ مجھے خود بتایا تھا شاہ زیب نے۔'' کرن تیقن سے میں بولی۔

''کرن میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں اور اگر ایسا کچھ ہوگا بھی تو مشال کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ ایسی فضول لڑکی نہیں ہے۔'' سمعان ٹھوس انداز میں بولا۔

''تو میں نے کب کہا کہ وہ کوئی فضول لڑکی ہے۔ میں نے تو صرف اس کے شاہ زیب سے افیئر کی......''

''شٹ اپ کرن! اپنی زبان سنبھالو۔'' سمعان اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''تمہیں میری بات پر خود بہ خود یقین آ جائے گا سمعان میں تمہیں یقین کرنے پر مجبور نہیں کر رہی۔ وقت خود تمہیں ثبوت دے دے گا۔'' کرن نے پائپ پھینک دیا اور تیز رفتاری سے حویلی کے صدر دروازے سے اندر چلی گئی۔ اپنے پیچھے مضطرب سے سمعان کو تنہا چھوڑ کر۔ جسے اپنی محبت پر اعتبار تو تھا مگر پھر بھی وہ مرد تھا اپنی محبت اور اس کے تقدس کے متعلق بہت ہی روایتی......

اس نے اپنے کرتے کی سائیڈ والی جیب سے اپنا موبائل نکالا اور ہاسٹل کے نمبرز پش کیے۔ کچھ ہی لمحوں میں وہاں سے فون اٹھایا جا چکا تھا۔

''روم نمبر ۱۴۲ سے مشال احمد کو بلا لیجیے ذرا۔'' سمعان بولا۔ کچھ دیر فون ہولڈ پر رکھا گیا اور یہ کچھ دیر سمعان پر کچھ برسوں کی طرح سخت گزرے۔ سردیوں کی کومل دھوپ اسے اپنا آپ جلاتی محسوس ہوئی۔

''مشال احمد اپنے روم میں موجود نہیں۔ آپ بعد میں فون کیجیے گا۔'' دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔

سمعان نے بے ارادہ ہی شاہ زیب کے سیل نمبرز پش کیے اور دوسری ہی بیل کے بعد شاہ زیب کی پرجوش آواز گونجی۔

''ہیلو سمعان کیسے ہو یار ہم لوگ تجھے بڑا یاد کر رہے ہیں' کب آ رہے ہو واپس؟''

''اور کون کون یاد کر رہا ہے مجھے۔'' سمعان نے یونہی کہا۔

''ہم سب ہی! میں' مشال' تجل' کویتا' ندا اور سب' ویسے اس وقت مشال میرے ساتھ ہے۔ بات کرو گے اس سے؟'' شاہ زیب نے کھلکھلا کے کہا اور سمعان کے دل میں اگی شک کی کونپل ذرا سی جنبش میں آئی اور اگلے ہی پل ایئر پیس میں مشال کی آواز گونجی۔

''کیسے ہو سمعان۔''

''تم شاہ زیب کے ساتھ کیا کر رہی ہو۔'' بے اختیار ہی پوچھا گیا۔

''ہاسٹل میں یونیورسٹی میں اکیلے رہ رہ کے بور ہو رہی تھی ناں تمہاری بھی بہت یاد آ رہی تھی' تو شاہ زیب نے کہا کہ چلو لنچ کر کے آتے ہیں۔ تو میں آ گئی۔ ویسے تمہاری غیر موجودگی میں شاہ زیب نے بہت سہارا دیا ہے۔'' مشال کھلکھلا کے بولی۔ سمعان کے دل پر ایک اور ضرب لگی۔

''تم کب سے سہارے ڈھونڈنے لگی ہو مشال؟'' ایک مضطرب سا' الجھا سا سوال۔

''کیا مطلب سمعان؟ تم کچھ ڈسٹرب لگ رہے ہو۔'' مشال کی محبت نے مزاج آشنائی کا روپ دھار لیا۔ سمعان نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ غلط خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی سعی کی۔

''میرا مطلب تم جیسی اسٹرانگ لڑکی کو کب سے سہاروں کی ضرورت پڑ گئی۔''

''سمعان! تم ہی تو کہتے ہو کہ میں باہر سے جتنی بھی بہادر بننے کی کوشش کروں' اندر سے میرا دل ایک چڑیا کی طرح ہے اور جانتے ہو یہ چڑیا تمہارے پنجرے میں قید ہو چکی ہے۔'' مشال نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ سمعان کا دل قدرے ہلکا ہو گیا۔

''اگر چڑیا میری قید میں ہے تو میری جان بھی تو اسی چڑیا میں ہے اور اگر کسی نے یہ چڑیا چھین لی تو میری سانسیں اسی وقت ختم ہو جائیں گی۔'' سمعان کے دل کی کیفیت اب بھی گومگو تھی۔

''کوئی تو پرابلم ہے سمعان۔ اس قدر الجھی بکھری باتیں کیوں کر رہے ہو اور اب کتنے دن رہنا ہے وہاں جلدی آ جاؤ ناں۔'' مزاج آشنا دل پھر دھڑکا۔ ''میں کتنی تنہا ہوں یہاں پر۔ کتنی اکیلی پلیز کم بیک سون۔'' محبت التجا کر رہی تھی۔ سمعان کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ پل بھر میں اسے تمام خدشے' تمام باتیں غلط لگنے لگیں۔

''آج رات تک پہنچ جاؤں گا۔ کل صبح یونیورسٹی میں ملاقات ہوگی۔'' فون بند ہو چکا تھا۔ سمعان کی آواز ختم ہو چکی تھی لیکن اس کا وجود اب مشال کو اپنے اردگرد محسوس ہونے لگا۔ وہ شاہ زیب کے ہمراہ ہوتے ہوئے بھی نہ تھی۔ سمعان کے وجود کے ہیولے' اس کے تصور کے ہمراہ تھی۔ اس کی محبت کی قید میں چڑیا کی طرح تھی لیکن پھر بھی خوش تھی پھر بھی مطمئن تھی۔

یونیورسٹی پہنچا تو ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر ہی اپنے گروپ کو کھلکھلاتے ہنستے دیکھ لیا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ان تک آیا۔ وہ بھی سمعان کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ سعد تو فوراً سے بھی پہلے اٹھ کر بغل گیر ہو چکا تھا۔

''کیا یار اتنے دن لگا دیئے۔ کتنا مس کیا ہم نے تم دونوں کو یہ کرن کہاں ہے؟'' کویتا نے کہا۔ ''میں تو کل رات ہی واپس آ گیا تھا البتہ کرن کی مرضی ہے جب آ جائے۔ جانتے تو ہو گے ان لڑکیوں کو تم سعد دادیوں' نانیوں' پھوپھیوں' ماسیوں' خالہ زاد' تایا زاد' چچا زاد اور بقایا دور پار کے رشتوں کے لیے کتنی پاگل ہوتی ہیں۔ ایک بار مل جائیں تو چھوڑتی نہیں۔'' سمعان کے کہنے پر لڑکیاں بول اٹھیں۔

''ہاں تو ہم آپ لڑکوں کی طرح سخت وجامد دل لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ ہماری فیلنگز بہت اچھی' بہت نرم ہوتی ہیں۔'' ندا نے احتجاج کیا۔

''اوئے صدقے جاواں۔'' سعد نے چیخ ماری۔

''یہ مشال اور شاہ زیب نہیں دکھائی دے رہے۔'' سمعان کی نظروں کو اب تک وہ گوہر دکھائی نہیں دیا تھا۔

''یار سمعان تو واقعی پیر ہے۔ وہ دیکھو شاہ زیب اور مشال اسی طرف آ رہے ہیں۔'' سعد کے یہ کہنے پر سبھی ہنس دیئے اور سمعان نے مڑ کر دیکھا۔ پرنٹڈ پنک کلر کے شیفون کے سوٹ میں بالوں کی اڑتی لٹ کو کانوں میں اڑستی مسکراتی مشال اور کتابوں کو تھامے فخر سے چلتا آ رہا شاہ زیب سمعان کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار نہ چاہتے ہوئے بڑھ گئی۔ سانسوں میں انتشار سا برپا ہونے لگا۔

''ارے سمعان کیسے ہو یار۔'' شاہ زیب نے اسے دیکھتے ہی اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا اور مشال کا تازگی سے بھرا چہرہ ایک رونق لیے جگمگا اٹھا اتنے دنوں سے جس صورت کا انتظار تھا وہ آخر نظر آ ہی گئی تھی۔

''میں تو ٹھیک ہوں۔ تم دونوں سناؤ۔ آج ایک ساتھ کیسے آ گئے۔'' اس نے اپنے اندر کے اشتعال کو دبوچنے کی کوشش کی۔

''یونیورسٹی گیٹ تک آیا تو پتا چلا کہ محترمہ مشال احمد کے نازک سے پاؤں میں جوتا ہونے کے باوجود کانٹا چبھ گیا ہے اور پاؤں میں موچ بھی آ گئی ہے اور ایسے میں ان کو اکیلا چھوڑ آنا اصول دوستی کے خلاف تھا۔ سو ان کا کانٹا نکالا' جوتا صاف کیا اور انہی کے ساتھ سست رفتاری سے آتا رہا۔'' شاہ زیب کی داستان گوئی سے سبھی کو لطف آتا تھا۔ پل بھر کو بھی مشال کے پاؤں کی طرف متوجہ ہوئے جہاں پنک پتلی سی پٹی والے جوتے کے ساتھ ساتھ کانٹا چبھنے کا نشان بھی تھا۔ قدرے سرخی مائل دھبا۔

''درد تو نہیں ہو رہا مشال۔'' سمعان نے فکرمندی سے پوچھا۔ مشال نے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

''اب سارے درد مٹ گئے ہیں۔'' دل سے اک آواز اٹھی۔

''یار تم لوگ اپنی باتوں سے فارغ ہو جاؤ پھر میں ایک بمباسٹک نیوز سناتی ہوں۔'' ندا نے ان سب کو متوجہ کیا۔

''تم نے شاہ زیب کا کام کب سے سنبھال لیا۔ نیوز ریڈر کا۔'' سعد نے ٹکڑا لگایا۔ ندا نے اسے نظر انداز کر کے بات کی۔

''فرینڈز آپ سب کو میں اس سنڈے اپنی منگنی پارٹی پر انوائٹ کرنا چاہتی ہوں۔'' ندا نے بڑی ادا سے کہا۔ سبھی حیران ہوئے آوازیں سوال اشارے سبھی کو اس واقعے کے دھماکے پر حیرت تھی۔

''انگیجمنٹ مگر کس سے۔'' کویتا نے کہا۔

''عمر سے اور کس سے۔'' ندا بے پروائی سے بولی۔

''وہی عمر جو ہمارے ساتھ ٹور پر چلا تھا؟'' شاہ زیب کے سوال پر ندا نے ہامی بھری۔

''مگر کیسے کب طے ہوا۔'' سعد نے سوال کیا۔

''دوستو! میں نے تم لوگوں سے جھوٹ کہا تھا عمر میرا کزن نہیں۔ میرا بلوڈ تھا۔ چار سال پہلے ہم دوست بنے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے پاپا کو منایا' مما تو میرے ساتھ تھیں۔ خیر ہماری منگنی طے ہو گئی ہے اس سنڈے کو۔ کوئی فارمل فنکشن نہیں۔ بس رسم ہے۔'' ندا نے تفصیل بتائی۔ سبھی خوش ہوئے۔

''یار اے کڑی وی ہتھوں گئی۔ لگتا ہے ساری عمر کنوارا ہی رہنا پڑے گا یا پھر اپنی اکنامکس پروفیسر مس شہلا سے شادی کرنی پڑے گی۔ وہ بھی بے چاری میری طرح کنواری ہے۔'' سعد نے دکھ سے دہائی دی۔

''باز آ جاؤ سعد۔'' ندا نے اسے گھورا سبھی مسکرا دیئے۔

''کس طرح منا لیا تم نے اپنے پاپا کو ندا۔ تمہیں تو بہت ڈر تھا ناں ان کا۔'' مشال کے کہنے پر ندا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھرا۔

''پتا نہیں یار کس طرح منا لیا۔ بس یہ ہے کہ ہمت نہیں ہاری اور پھر اگر حوصلہ ہو تو وہ یہ نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی بڑی ہے۔'' ندا کی آنکھوں سے اس کا حوصلہ چھلک رہا تھا۔

''کتنی خوش ہو رہی ہو گی ناں تم اپنی محبت کی تکمیل پر۔ ایک نئے رشتے کی ابتدا اپنے من چاہے ہمسفر کے ساتھ کرنے پر۔ اک آدھے ادھورے رشتے سے نجات پانے پر۔'' مشال کے لہجے کی اداسی کو ندا نے پہچان لیا۔

''آدھا ادھورا رشتہ۔ میں سمجھی نہیں۔''

''ہاں ندا' محبت دنیا کا سب سے خوب صورت رشتہ ہونے کے باوجود بھی ایک آدھا' ادھورا رشتہ ہی ہوتا ہے۔ یہ بندھن یہ ناتا ایک بے نام سا ناتا ہے۔ سمعان کرن کے ساتھ بے خوف ہو کے چل سکتا ہے لیکن میرے ساتھ نہیں چند لوگوں کی بھیڑ میں مجھ سے بات کرتے ہوئے کتراتا ہے۔ مصلحت کوشی کے پردے کے پیچھے چھپ کے۔ یہ مصلحت کوشی کیا ہے۔ یہی محبت کا آدھا ادھورا پن کوئی رشتہ بے نام نہیں ہونا چاہیے ندا۔ رشتوں کے لیے نام کی بیساکھی ہونا بے حد ضروری ہے' ورنہ وہ لولے لنگڑے ہی رہتے ہیں۔'' مشال کے کہنے پر ندا خاموش ہوگئی۔

''تو پھر بنا لو سمعان کو اپنا منگیتر یا کچھ بھی اور ختم کرو اس آدھے ادھورے پن کو۔'' ندا نے فوراً کہا۔

''کیسے کردوں ختم ندا! آج کل پتا نہیں سمعان کو کیا ہوگیا ہے جب سے اپنے گھر سے لوٹا ہے' بہت الجھا الجھا سا لگتا ہے۔ خفا خفا سا۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ پوچھوں تو بتاتا نہیں۔ مجھے بھی پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ منتشر سی باتیں کرتا ہے۔ ملنے سے کتراتا ہے۔ پتا نہیں بات کیا ہے۔'' مشال کی ذہنی کیفیت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''تم اس سے ملنا یا بات کرنا ختم مت کرو۔ اس کے زیادہ نزدیک ہونے کی کوشش کرو۔ اس کی پرابلم جانو' ہوسکتا ہے وہ کسی الجھن کا شکار ہو اسے یوں اکیلا تو نہ چھوڑو تم۔'' ندا نے اسے سمجھایا اور مشال نے قدرے ریلیکس ہو کر گردن اثبات میں ہلا دی۔

☆

ندا کی منگنی کے لیے سبھی نکلنے والے تھے۔ سمعان نے مشال کو ہاسٹل فون کیا۔

''رکشہ کی کیا ضرورت ہے۔ میں اپنی گاڑی لے کر آتا ہوں۔'' سمعان نے کہا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں سمعان لیکن کرن بازار گئی ہے۔ پتا نہیں کب تک آتی ہے اور اسے اکیلا چھوڑ کے جاؤں گی تو وہ ناراض ہو جائے گی۔ اسے ندا کے لیے گفٹ لینا تھا۔ ایسا کرو تم چلے جاؤ۔ ہم آجائیں گے۔ وہیں پر ملاقات ہوگی۔'' مشال نے اپنی بات مکمل کی۔

''چلو او کے وہیں پر ملتے ہیں۔'' سمعان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اور پھر مشال کو انتظار کرتے کرتے ایک گھنٹہ گزر گیا مگر کرن کی واپسی نہ ہوئی منگنی کا وقت ہونے والا تھا مگر کرن کا کوئی پتا نہ تھا۔ کرن خود تو نہ آئی مگر اس کا فون آگیا۔

''مشال میں ندا کے گھر سے بول رہی ہوں۔ اصل میں شاپنگ کرتے کرتے اتنی لیٹ ہوگئی ناں کہ سوچا اب سیدھا ادھر ہی آجاؤں۔ میں نے سوچا تم بھی نکل گئی ہوگی۔'' کرن نے بہانہ گھڑ لیا تھا۔

''لیکن کرن میں تو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سمعان نے گاڑی لانے کا کہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ اب میں کیسے آؤں۔'' مشال کا غصہ یقینی تھا۔

''آئی ایم سو سوری یار۔ ایسا کرو شاہ زیب کے سیل پر فون کرو۔ باقی سب تو پہنچ چکے ہیں۔ وہی نہیں آیا۔ اس کے ساتھ آجاؤ یا پھر کوئی رکشہ وغیرہ لے لو۔'' کرن کی تجویز سن کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ شاہ زیب کے موبائل نمبرز پش کر چکی تھی۔

تقریباً پندرہ ہی منٹ بعد شاہ زیب اپنی موٹر بائیک کے ہمراہ موجود تھا۔ وہ فوراً بیٹھی اور دونوں ندا کے گھر کی جانب چل دیے۔

''ارے کرن مشال کہاں ہے۔ اسے تمہارے ساتھ آنا تھا ناں۔'' سمعان نے کرن کو پارٹی میں چلتے پھرتے دیکھا تو پوچھ بیٹھا۔

''ہاں آنا تو تھا پر پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ مشال بولی کہ تم چلی جاؤ۔ میں شاہ زیب کے ساتھ آجاؤں گی۔ آتی ہی ہوگی ابھی۔'' کرن یہ کہہ کے آگے بڑھ گئی اور سمعان کا دل سراپا سوال بن گیا۔ اس کے ذہن میں مشال کے الفاظ گونجنے لگے۔

''میں کرن کو اکیلا چھوڑ کے کیسے آؤں۔ ایسا کرو تم چلے جاؤ۔'' اور یہ بازگشت اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ دوبارہ سے اسی اشتعال وانتشار میں گھر رہا تھا۔ سارے ثبوت محبت کے خلاف تھے مگر محبت پھر بھی منکر تھی اگر شاہ زیب کی موٹر بائیک اسے متوجہ نہ کرتی اس نے دیکھا تو شاہ زیب مشال کو اپنے پیچھے بٹھائے موٹر بائیک پر آرہا تھا۔ کونے میں بائیک کھڑی کر کے دونوں ہمقدم چلتے ہوئے جا رہے تھے اور سمعان شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ احساس توہین اس قدر تھا کہ سانس لینا اسے دشوار محسوس ہو رہا تھا جس چڑیا میں اس کی جان تھی وہ چڑیا اسے دور اڑتی ہوئی کھوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے محفل کی روشنیوں میں اپنی فیلنگز چھپانا کس قدر کٹھن لگ رہا تھا۔ بے وفائی کے وسوسے اس کے دل میں جاگ رہے تھے۔

وہ چراغ جاں کبھی جس کی لو نہ کسی ہوا سے نگوں ہوئی
تیری بے وفائی کے وسوسے اسے چپکے چپکے بجھا گئے

محفل میں باقی وقت یوں تو مشال اسی کے ہمراہ رہی۔ ہنستی ہوئی بولتی ہوئی لیکن وہ اس کے ہمراہ نہ تھا۔ وہ تو احساس گمشدگی کے بوجھ تلے اپنی سانسیں اور دل کی دھڑکنیں سمیٹ رہا تھا۔

''یار یہ گڑ گھو بھی اتنی پیاری گڑیا سی لڑکی لے اڑا۔'' سعد نے کہا۔

''یہ گڑ گھو اسی گڑیا کی پسند ہے۔ غور فرمانا۔'' شاہ زیب نے اسٹیج پر فخر سے بیٹھے عمر اور ندا کی طرف دیکھ کے کہا۔

''ہاں یار ایک اپنی ہی قسمت خراب ہے۔'' سعد کی ٹھنڈی آہ پر شاہ زیب نے اسے پیٹھ پر دھپ ماری۔

ساری محفل جاندار تھی بس اک سمعان ہی گویا بے جان تھا اور پھر اک خوش قسمت سے لمحے میں ندا کی محبت کی انگلی میں عمر نے ایک پیارا سا نام والا رشتہ ڈال دیا۔

☆

"تمہیں کیا ہو گیا ہے سمعان تم کیوں مجھ سے اتنے خفا رہنے لگے ہو۔" دو دن سمعان کی خفگی برداشت کرنے کے بعد آخر مشال نے پوچھ ہی لیا اور سمعان کی خاموشی اسے مزید ڈسٹرب کرنے لگی۔

"کم آن سمعان کیوں اتنا بدل گئے ہو تم؟"

"میں بدل گیا ہوں...... میں بدل گیا ہوں مشال؟ میرا تو خیال ہے کہ تم بدل گئی ہو۔ مجھے وقت نہ دینا' اگنور کرنا' میری ہر بات کا گول مول سا جواب دینا' مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری زندگی کا ایک غیر ضروری حصہ ہوں۔" مشال کی زندگی کے سب سے ضروری حصے نے انتہائی کرختگی سے کہا اور وہ گنگ سی اسے دیکھے گئی۔

"یاد رکھو مشال! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جھوٹ اور دھوکہ بازی نہیں۔ سانسوں میں آگ لگ جاتی ہے جب تم مجھ سے جھوٹ بولتی ہو۔" وہ مشتعل سا بولا۔

"کیا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے سمعان' یہی کہ میں اس دن کرن کا انتظار کر رہی تھی یا یہ کہ کرن مجھے چھوڑ کے بازار گئی تھی اور مجھے اپنا انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی۔ تمہارا فون آنے کے گھنٹے بعد مجھے کرن نے ندا کے گھر سے فون کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ میں رکشہ لے کے آ جاؤں۔" اس نے اپنے تئیں صفائی دینے کی کوشش کی۔

"تو رکشہ لے کے آ جانا تھا۔" سمعان قدرے اونچی آواز میں چلایا اور مشال کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ننھا سا دل زور سے سہما۔ اس کے سامنے وہی شخص تھا جو اس سے محبت کا' اعتبار کا دعوا کرتا تھا اور وہی شخص اس وقت کتنے اجنبی پن سے مخاطب تھا۔

"تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں گئی یا اس بات پر ہے کہ میں شاہ زیب کے ساتھ کیوں آئی؟" مشال دھیمے انداز میں ہی سہی اس کے دل کا بھید جان چکی تھی۔

"بات ایک ہی ہے مشال۔" وہ تڑپا۔

"بات ایک ہی نہیں ہے سمعان کیا تمہارے دل میں شاہ زیب کو دیکھ کر ان سیکورٹی ہے۔ ہاں بولو۔ بے اعتباری ہو گئی ہے مجھ پر ایک ٹپیکل فیوڈل لارڈ کی طرح۔ بولو سمعان۔" وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ اب وہ خاموش تھا۔

"اپنی عزت اور انا کا سرٹیفکیٹ بنا کے مجھے تجوری میں بند کر کے رکھنا چاہتے ہو۔ بڑا دعوا تھا ناں تمہیں اعتماد کا۔ یہ حد تھی تمہارے اعتبار کی۔ یہ سرحد تھی تمہارے یقین کی؟" اس کی نم آنکھیں شعلے برسا رہی

تھیں۔ آسمان پر ٹھہرے بادل ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اک گونج اٹھی گرج کی۔

"تم سے یہ امید نہ تھی مجھے سمعان شاہ' بے اعتباری بھی کی تو مجھ پر۔" وہ نم آنکھیں لیے کتنی دیر اس کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر مڑ گئی اور تیز تیز قدم اٹھا کے جانے لگی۔

"رکو مشال میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا لیکن وہ اس کی ہر بات کو نظر انداز کرتی یونیورسٹی گیٹ پھلانگ چکی تھی۔

☆

"پرسوں جانے کا پروگرام تھا لیکن حویلی سے بی جان اور بابا سائیں کے اتنے فون آئے کہ آج ہی جا رہی ہوں۔" کرن اپنا سامان پیک کر رہی تھی اور مشال اپنے بیڈ پر نیم دراز ہاتھ میں کتاب تھامے گم صم سی تھی۔

"سمعان تو پرسوں ہی آئے گا۔ شادی میں تو ابھی ایک ہفتہ ہے۔ بس بی جان چاہتی تھیں کہ میں اپنے پیارے بھائی کی شادی کی تیاری میں حصہ لوں۔ تم آؤ گی ناں مشال۔" وہ کپڑے ڈالتے ڈالتے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسی طرح غیر مرئی نقطے پر آنکھیں لگائے کچھ سوچے گئی۔ جیسے کہ وہ وہاں نہ ہو۔

"مشال کچھ پوچھا ہے تم سے۔" کرن نے چٹکی بجا کے اسے متوجہ کیا۔

"ہوں...... ہاں...... بولو۔" وہ چونکی۔

"میں پوچھ رہی ہوں آؤ گی ناں ادا فراز کی شادی پر۔ کارڈ سمعان دے دے گا۔"

"کوشش کروں گی۔" ٹالنے کی ایک کوشش تھی۔

"کوئی کوشش ووشش نہیں۔ آنا پڑے گا تمہیں۔ ندا' کویتا' سجل' سعد' شاہ زیب سبھی آئیں گے تم کیسے نہیں آؤ گی۔ آ کے ہماری حویلی کی شادی کی رونق تو دیکھنا۔" کرن نے آنکھوں میں اس رونق کا تصور لا کر کہا مشال اس کی جانب خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

اور اگلے ہی دن یونیورسٹی میں سمعان سبھی کو کارڈ دینے لگا اور آنے کی تاکید کرنے لگا۔ مشال قدرے دور بیٹھی اپنے نوٹس بنانے میں مصروف تھی کہ جب وہ اس کے پاس آیا۔ اس دن کی تلخ کلامی کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

"مشال بات نہیں کرو گی مجھ سے۔" غصے کی گرد ڈھل جانے کے بعد سمعان کو اپنا آپ ہی گناہ گار محسوس ہوا تھا۔ مشال نے اک نظر اس کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

"میں نے مانا میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ لیکن تمہاری اس قدر ناراضگی میری جان لے کے چھوڑے گی۔ میں نہیں زندہ رہ سکتا تمہارے بغیر۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور انتہائی محبت سے

بولا۔

''پلیز مشال معاف کردو مجھے پلیز'' اس کی اتنی لجاجت کے بعد مشال نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور گویا پچھلے دنوں کا سارا غم اور سارا غصہ آپ ہی آپ ختم ہونے لگا۔

''وعدہ کرو آئندہ ایسی بات نہیں کرو گے۔'' اس نے وارننگ دی۔

''پکا وعدہ آئی ایم سوری۔'' سمعان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور وہ مسکرا دی۔

''یہ لو تمہارا کارڈ ضرور آنا۔ بی جان سے ملوانا ہے تمہیں اور اس بار کم از کم بی جان کی رضامندی لے کر چھوڑنی ہے۔'' سمعان نے اسے کارڈ دیا اور وہ سمعان کی اس بات پر بلش ہی تو ہوگئی تھی۔

☆

سادات حویلی میں ایک نیا شور اٹھا تھا۔ سمعان اور کرن کے نکاح کا جو کہ جتنا اچانک طے ہوا تھا اتنی ہی اچانک ہو بھی رہا تھا اور پھر مضبوط حصاروں والی اس حویلی کے تقریباً سبھی فیصلے اسی طرح طے ہوتے تھے۔ اتنے اچانک کہ پتا ہی نہ چلتا اور اتنی آہستگی سے کہ خود حویلی کے مکینوں کو ہی خبر نہ ہوتی۔

کرن حویلی پہنچی تو حویلی کی لڑکیوں نے اس کا سواگت کیا اور اسے اس نئی خبر کے متعلق خبر دی اور وہ حیران سی ہر کسی کے چہرے کو تکتی رہی۔ دل اس اچانک ہی آئی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سے خوش تو تھا لیکن بے یقینی بہر حال تھی۔ سمعان خود اس فیصلے سے بے خبر تھا اور پھر ویسے بھی حویلی کے فیصلہ کرنے والوں کی نظر میں بچوں کی رائے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ تو خود اپنے بچوں کی تقدیریں چنتے تھے اور ان کے بچوں کو ان کی چنی ہوئی تقدیروں اور ان تقدیروں کی کھینچی ہوئی لکیروں پر تاعمر چلنا ہوتا تھا۔

اور پھر جب کرن نے بی جان سے یہ سوال کیا کہ سمعان کو خبر نہیں کہیں وہ اس فیصلے پر اختلاف نہ کرے تو بی جان گویا غصے میں آگئیں۔

''کیسے کر سکتا ہے سمعان شاہ اعتراض اس فیصلے پر۔ یہ فیصلہ میرا کیا ہوا ہے۔ اس کے والد کا کیا ہوا ہے اور ہمارے فیصلے بدلا نہیں کرتے کرن۔''

''لیکن بی جان وہ لڑکا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' کرن نے کہا۔

''ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ کرن کہ ہمارے خاندان کے لڑکے تم لڑکیوں سے زیادہ فرمانبردار ثابت ہوئے ہیں۔ بس یہ طے ہو چکا ہے کہ فراز شاہ کی رخصتی کے اگلے ہی دن تمہارا نکاح ہوگا اور عنقریب ہی رخصتی۔'' بی جان فیصلہ کن لفظوں میں جواب دے کر بات ختم کرنے کی عادی تھیں اور مجبوراً کرن کو بھی چپ ہونا پڑا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سمعان نے کوئی حرف اعتراض اٹھایا بھی تو بی جان اسے چپ کرا دیں گی لیکن پھر بھی اس کے دل کے اندر مشال کی محبت کی صداقت کا جو ایک ہلکا سا خوف تھا وہ اپنی جگہ زندہ تھا' ثابت تھا۔

سمعان جہاں شادی سے دو دن پہلے پہنچنے والا تھا وہاں طبیعت کی خرابی کے باعث شادی سے ایک ہی دن قبل اپنے گروپ کے تمام دوستوں کے ہمراہ ہی پہنچ سکا۔

یوں تو بابا سائیں' بی جان اور اس کی والدہ اس کی غیر حاضری پر بہت خفا تھیں لیکن اس کی طبیعت کی ناسازی کا سن کے ساری خفگی بھول گئیں۔

سمعان نے مشال سمیت سبھی کو بی جان اور امی جان سے ملوایا اور ان سبھی کو گھر کی لڑکیوں ہی کی طرح لیا گیا۔ ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں اتنے دنوں بعد ملی تھیں تو شرارتوں اور مسکراہٹوں کا کبھی نہ رکنے والا سلسلہ شروع تھا۔

پوری حویلی پھولوں اور روشنیوں سے سجی تھی۔ ہر طرف رنگ تھے' جگمگاہٹیں تھیں۔

مہمانوں کو علیحدہ کھانا دیا گیا۔ سمعان بھی انہی کے ساتھ ساتھ تھا۔ کھانے کے بعد تیسری منزل پر بنے پورشن والے دو کمروں میں ان کے رہنے کا انتظام بی جان نے کروایا تھا۔ ایک کمرہ سعد اور شاہ زیب کو دیا گیا تھا اور اس کے عین سامنے والا کمرہ مشال' کویتا' نجل اور ندا کو۔

سمعان کو بی جان نے طلب کیا تھا جسے وہ ایک روٹین کی طرح سمجھ کر ہی ان کے کمرے کی طرف بڑھا تھا لیکن اندر بی جان کے ہمراہ اپنے والد سکندر شاہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ سکندر شاہ اپنی والدہ کا فرمانبردار فرزند تھا۔ بی جان کی زبان سے نکلے ہر حرف کو تسلیم کرنا ان کے لیے ضروری تھا اور بی جان کی خدمت کرتے رہنا ان کے قلب کا اطمینان۔ اس وقت بھی بی جان اپنے بستر پر دراز تھیں اور سکندر شاہ جن ہاتھوں سے پورے گاؤں کے اور حویلی کے امور سنبھالتے تھے انہی ہاتھوں سے اپنی والدہ کے پاؤں دبائے جا رہے تھے۔ سمعان مسکرا کر ان کی جانب بڑھا تھا۔

''آؤ آؤ سمعان' میرے بچے میرے جگر گوشے۔'' بی جان نے اسے دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح اپنی ممتا بھرے بوڑھے بازو پھیلا دیے اور وہ چلتا ہوا ان کے بستر پر آیا اور ان کی بانہوں میں اپنا آپ دے دیا۔

''بی جان میری اچھی بی جان!'' بے اختیار ہی لب ہلے تھے۔

''کیسے ہو میرے بچے۔ شہر جا کے تو وہاں کی ہواؤں نے تمہیں بدل دیا ہے۔ ذرا برابر بھی اپنی بوڑھی بی جان کی خبر نہیں رکھتے۔ اب زندگی کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں تم لوگوں کی صورتیں نہ دیکھوں تو روح چین نہیں پاتی۔'' بی جان نے اس کی کشادہ پیشانی پر ممتا بھرے ہونٹ رکھے اور وہ بی جان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ان کے ملبوس سے اٹھنے والی مانوس مہک کو اپنے اندر اتارتا رہا۔

''آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں بی جان! آپ تو ہمارے لیے سایہ دار شجر کی طرح ہیں جس نے ہمارے اوپر ہمیشہ رہنا ہے۔'' سمعان نے کہا۔

''سایہ دار درختوں کو بھی آندھیاں' زلزلے طوفان گرا ڈالتے ہیں پھر میں تو ایک انسان ہوں۔ بیٹا اس درخت کی تم لوگ شاخیں ہو جسے میں اپنے سامنے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہوں۔'' بی جان نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''سمعان! بی جان نے تمہیں ضروری کام کے لیے بلایا ہے بیٹے!'' سکندر شاہ نے کہا۔

''جی بی جان بولیں۔'' وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

''پہلے یہ بتاؤ تمہارے مہمان آرام سے تو ہیں ناں۔ ان کی رہائش کے انتظام میں ملازموں نے کوئی کوتاہی تو نہیں برتی ناں۔'' بی جان نے پوچھا۔

''آپ کے ہوتے ہوئے کوئی کمی کیسے رہ سکتی ہے بی جان۔'' سمعان مسکرایا۔

''کل نزہت کی رخصتی کے بعد اپنے مہمانوں کو مزید دو دنوں کے لیے روک لینا۔''

''کیوں بی جان کوئی خاص وجہ؟''

''فراز شاہ کی شادی کے اگلے دن کرن کے ساتھ تمہارا نکاح ہے۔'' بی جان کی جگہ سکندر شاہ نے کہا۔

''نکاح!'' سمعان کے ہونٹوں سے اچانک ہی مسکراہٹ اڑ گئی۔ ذہن گویا ایک ہی نقطے پر اٹک گیا۔

''یہ فیصلہ میرا کیا ہوا ہے سمعان اور تمہارے بابا اور چچا نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ ہم نے تمام رشتے داروں اور برادری والوں تک یہ خبر پہنچا دی ہے۔'' بی جان انتہائی سکون سے بولیں۔

وہ برف کی سل کی طرح جامد تھا لیکن پل بھر کو اس برف کے اندر ایک چنگاری بھڑکی۔ ''لیکن بی جان!'' اس نے کچھ بولنے کی سعی کی۔

''لیکن کیا سمعان؟'' سکندر شاہ کی جہاں دیدہ آنکھوں نے اس کا ایکسرے کرنا شروع کیا۔

''آپ نے مجھ سے پوچھا تو ہوتا بی جان مجھے بتایا تو ہوتا۔'' وہ بولا۔

''سمعان! بی جان جو سوچ لیں اس کے متعلق کسی سے پوچھنا اور کسی کو بتانا ضروری نہیں ہوتا۔ تمہارے باپ نے تمہارے چچا نے ان کی تمام اولادوں نے کبھی بی جان کے کسی فیصلے پر شکوہ نہیں کیا تو تمہیں کیا شکایت ہے۔'' سکندر شاہ کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی کرختگی در آئی۔

''سمعان بیٹے ہم جانتے ہیں کہ کرن تمہارے لیے سب سے اچھا جیون ساتھی ثابت ہوگی۔ اس سے بہتر لڑکی اور کوئی نہیں ہوگی اور پھر بڑوں کے جوڑے رشتے پائیدار ہوتے ہیں۔'' بی جان نے لہجہ نرم رکھا۔ سمعان کی آنکھوں میں مشال کے خدوخال گردش کرنے لگے۔

''کرن جانتی ہے اس بارے میں۔'' وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''اسے ہمارے اس فیصلے سے کوئی اعتراض کوئی اختلاف نہیں۔ وہ بہت خوش ہے اس فیصلے سے۔''

بی جان کی اس اطلاع کے بعد وہ کمرے میں رکا نہیں اور تیزی سے کمرے کا دروازہ عبور کرتا اپنے کمرے تک جانے لگا۔

نزہت کے ہاتھوں میں سجل مہندی لگانے میں مشغول تھی اور کرن اس کے اگلے دن پہننے والے سرخ زرتار لہنگے میں ستارے لگا رہی تھی۔ مشال اور کویتا کرن کے جہیز کے کپڑوں کو شوق سے دیکھ رہی تھیں اور ندا مہندی کے ڈیزائن کو۔

''ہمارے یہاں کی شادیاں لڑکیوں کو کتنا الگ بنا دیتی ہیں ناں۔ ہمیشہ سیدھی سادی رہنے والی لڑکی اچانک ابٹن میں' خوشبو میں نہلا دی جاتی ہے۔ پھولوں میں' زیوروں میں رنگوں میں سجا دی جاتی ہے۔ گوٹے' ستارے' کناریاں' چمک دمک اور زرق برق ملبوسات۔'' مشال کپڑوں کو دیکھ کر بولی۔

''یہی چیزیں تو ہماری دلہنوں کی سہاگنوں کی شان ہوتی ہیں۔'' نزہت نے کہا۔

''آپ کل کیا پہنو گی سجل آپی۔'' نزہت نے محویت سے مہندی لگاتی سجل سے پوچھا۔

''میرا تو بھئی چوڑی دار پاجامہ ہے سبز رنگ کا۔'' سجل بولی۔

''اور میرا پشواز ہے۔'' ندا نے جھٹ سے کہا۔

''میں تو بھئی اپنا ٹریڈیشنل لباس ساڑھی باندھوں گی۔'' کویتا نے کہا۔

''اور مشال تم۔'' کرن نے مشال سے پوچھا۔

''میں شاید لہنگا چولی پہنوں یا پھر کرتا پاجامہ۔'' وہ سوچ کے بولی۔

''یہ تو کل کا طے ہوا۔ پرسوں کیا پہنیں گی آپ سب۔'' نزہت نے کہا۔

''پرسوں کیوں پرسوں بھی کوئی فنکشن ہے کیا۔ کارڈ پر تو نہیں لکھا تھا۔'' ندا حیران ہوئی۔

''کارڈ پر تو نہیں لکھا لیکن کیا آپ لوگوں کو نہیں پتا کہ پرسوں سمعان بھائی اور کرن کا نکاح ہے۔ یعنی میری نند میری بھابی بھی بن جائے گی۔'' نزہت نے کھلکھلا کے کہا۔ سجل اور ندا کی نگاہیں اچانک ہی مشال کے چہرے پر جا پڑیں اور مشال۔ اس کے ذہن میں شائیں شائیں ہونے لگا تھا۔ ذہن نزہت کے ایک جملے پر ٹھہر سا گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد بے رنگ سے دائرے رقص کرنے لگے تھے۔

''یہ کب طے ہوا۔'' ندا بے چینی سے بولی۔ وہ مشال کے اندر کی فیلنگز کو سمجھتی تھی۔

''یہاں کے فیصلے اسی طرح ہوتے ہیں ندا۔ اچانک اور ٹھوس جو بدل نہیں پاتے۔ پرسوں میں آئی تو مجھے خبر ہوئی۔'' کرن کی نگاہیں بھی مشال کی آنکھوں پر تھیں اور مشال اس کی آنکھیں ابھی چھلک پڑتیں۔ ضبط کی دیوار بھی گر پڑتی۔ برداشت کا پہاڑ ابھی ریزہ ریزہ ہو جاتا اگر وہ وہاں سے اپنے وجود کو گھسیٹتی نہ لے جاتی وہ وہاں سے اٹھی اور مرے مرے قدموں سے باہر آ گئی اور اسی کے پیچھے کرن بھی آ گئی۔

"مثال! رکو میری بات سنو۔" وہ کرن کا سامنا کرنا نہ چاہتی تھی لیکن کرن اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم سمعان کو چاہتی ہو' لیکن میرا یقین کرو سمعان اپنے بابا اور بی جان کے سامنے اس فیصلے کے خلاف نہیں بول سکتا اور بی جان اپنے اس فیصلے سے کبھی ہٹ نہیں سکتیں۔ پورے خاندان اور برادری کو پتا چل چکا ہے کہ ادا فراز کی شادی کے اگلے دن سمعان کی اور میری شادی ہے۔" کرن اس کی محبت پر اپنی محبت کا جھنڈا گاڑ رہی تھی۔

"اور یہ فیصلہ بدل نہیں سکتا۔" کرن کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"یہ کیسے فیصلے ہوتے ہیں جن کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ کیا ہوائیں بھی اس حویلی کے بھید کسی کو نہیں بتاتیں۔ یہ کیسے فیصلے ہوتے ہیں جو بول نہیں سکتے' جو بنا بتائے بنا پوچھے طے ہو جاتے ہیں' جو ہر کسی کا سر اپنے آگے جھکا دیتے ہیں۔" مثال کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

"اس حویلی کے فیصلے واقعی ایسے ہوتے ہیں مثال بہت خاموش بہت مضبوط اور بہت سفاک۔" کرن نے کہا۔

"کیا میرے سمعان کے دل میں بھی یہ فیصلہ رضا مندی بنا کے ڈال دیا گیا ہے یا وہ ابھی بھی اس سے بے خبر ہے۔ کیا اس کی محبت پر بھی یہ ضرب پڑ چکی ہے۔" مثال کے دل میں پڑی ضربیں اس کے لبوں پر آ ٹھہری تھیں۔

"وہ ایک پیدائشی جاگیردار ہے اور جاگیرداروں کے ٹھوس اور بے حس دلوں میں نہ محبتیں جنم لے سکتی ہیں اور نہ ان پر ضربیں پڑ سکتی ہیں وہ اپنی محبت کی خاطر اپنی وراثت' اپنی جائیداد نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنے بابا کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ وہ بے شک محبت تم سے کرتا ہو لیکن نکاح وہ مجھ سے کرے گا۔"

کرن کے اندر کی سفاکی اس کے لفظوں سے عیاں تھی اور مثال اس کے لفظوں کی غلام گردش میں بھٹک رہی تھی۔ اس کی معصوم محبت سنگسار ہو رہی تھی۔ وہاں رک کے مزید باتیں سننا اسے سوہانِ روح محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور راستے میں ہی شاہ زیب سے ٹکرا گئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اور اس کے چہرے کی سرخ رنگت دیکھ کر شاہ زیب کا دل ہول اٹھا۔ اس کے اندر کی محبت جاگ اٹھی۔

"کیا ہوا مثال!"

اور ایک ہمدرد سے دوست کو دیکھ کر مثال پر ضبط مشکل تھا۔ اس نے ضبط کی دیوار گرا دی اور شاہ زیب کے کندھے سے لگ کے آنسو بہانے لگی۔

مثال سے ہوئی بات چیت کے بعد کرن نیچے جا رہی تھی تو سیڑھیوں پر ہی اسے سمعان مل گیا جو شاید

اوپر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غم و یاس کی کیفیت اور کرب کے سائے دیکھ کر کرن سمجھ گئی کہ سمعان اس نئی خبر سے آشنا ہو چکا ہے۔ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے جا رہا تھا کہ کرن نے اسے روکا۔

"امید ہے تمہیں بی جان نے بتا دیا ہو گا سمعان!"

"ہاں بتا دیا ہے۔ کرم میں تم سے پوچھتا ہوں کیا تمہیں علم نہ تھا کہ میں مثال سے محبت کرتا ہوں' اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بغیر میں کسی کا تصور نہیں کر سکتا۔" سمعان اس سے سوال کرنے لگا۔

"پتا تھا تو کیا کرتی؟" وہ الٹا سوال کرنے لگی۔

"تو تم منع کر دیتیں بی جان کو۔ بتا دیتیں انہیں کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔"

"کیا تم منع کر سکے سمعان! تم بتا سکے انہیں سمعان؟ اگر تم لڑکا ہونے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے ہو تو میں کس طرح کرتی۔" کرن پھٹ پڑی۔

"میں کروں گا منع' کر دوں گا انکار۔ جہاں محبت ہی نہ ہو وہاں رشتے جوڑنے سے حاصل......" سمعان نے کہا۔

"محبت...... ہونہہ محبت۔ کس کے لیے کرو گے انکار سمعان۔ کس کی محبت کے لیے وہ جس نے تمہاری محبت کو کبھی محبت ہی نہیں سمجھا' جس نے تمہاری محبت اور اعتبار کی آڑ میں تم سے دھوکا کیا' جس نے تمہیں اپنے حسن کے جال میں پھنسا کے تمہیں بے وقوف بنایا۔ اس کے لیے تم اپنے ماں باپ کا دل دکھاؤ گے اپنی بی جان کو عمر کے اس حصے میں رلاؤ گے۔" کرن انتہائی ظالم لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا کیا کہنا چاہتی ہو تم۔" وہ مشتعل سا تھا۔

"جو میں کہنا چاہتی ہوں۔ وہ تم شاہ زیب کے کمرے میں جا کے دیکھ لو اپنی محبت کے تقدس کو کسی دوسرے کی بانہوں میں سہارا لیتے دیکھو گے تو تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔" یہ کہہ کے کرن تیز رفتاری سے سیڑھیاں اترنے لگی اور سمعان لمبے لمبے ڈگ بھرتا شاہ زیب کے کمرے میں آیا۔

دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکیلا تو ہلکی سی کوشش کے بعد وہ کھل گیا۔

زرد رنگ کے پردے کے پیچھے اسے کرسی پر بیٹھا شاہ زیب نظر آیا اور اس کے گھٹنوں میں اپنا سر رکھے بیٹھی مثال......

شاہ زیب کے ہاتھ اس کی زلفوں پر تھے اور انگلیاں زلفوں کو سہلا رہی تھیں۔ وہ اس سے آگے وہاں رکا نہیں۔ واپس مڑ آیا۔ اعتبار کی ٹوٹی کرچیاں سمیٹے۔ ریزہ ریزہ دھڑکنوں کو اکٹھا کیے۔ شاہ زیب کے ہاتھ ان زلفوں میں تھے جن کو سمعان نے اپنا کہا تھا۔ مثال کا وجود ان گھٹنوں پر تھا جو سمعان کے نہ تھے۔ وہ بے وفائی کے احساس تلے دبتا ہی چلا جا رہا تھا اور اس کی محبت لٹتی چلی جا رہی تھی۔

اور وہاں مہمان خانے کے زرد پردے کے پیچھے شاہ زیب کے گھٹنوں میں چہرہ دیئے پاگلوں کی

طرح رونے والی لڑکی منتظر تھی سمعان کی۔ اس کے محبت بھرے لمس کی اس کی دوستی کی لیکن وہ نہ آیا اور وہ اسی طرح الجھی بکھری رہی۔

اور شاہ زیب اس وقت درد کا درمان بنا اس کی اس عجیب محبت کو سنبھال رہا تھا۔ اپنی محبت دبائے چھپائے۔ اس نئی محبت کے انکشاف پر حیران بھی تھا اور اس کے انجام پر دکھی بھی۔

اس ایک سیاہ رات نے کتنی محبتوں کو سیاہی بخشی تھی۔ کتنی آنکھوں کو آنسو بخشے تھے۔

*

''رک جاؤ مشال۔ اس طرح تمہارا جانا سمعان کو برا لگ سکتا ہے۔'' میرون رنگ کی شال میں لپٹی اپنا سامان سمیٹتی مشال سے ندا مخاطب تھی۔

''کس کی ذات کا احساس دلا رہی ہوندا۔ وہ جو کل سے میرے سامنے آیا ہی نہیں۔ نہ کوئی صفائی پیش کرنے اور نہ اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ بے گناہ ہے ہی نہیں۔ وہ انجانے پن کے بہروپ میں لپٹا اپنی من مانی کر رہا ہے۔'' کرن کی باتوں کے بعد مشال کی آنکھیں اور دل رات بھر روئے تھے اسی لیے اس کا لہجہ اور آواز بھاری بھاری تھے۔

''تو تم خود سمعان سے جا کر بات کرو۔ اسے اپنی محبت کا احساس دلاؤ۔'' شاہ زیب جس نے تمام رات مشال کے درد کو قطرہ قطرہ چنا تھا بول پڑا۔

''محبتیں اس طرح نہیں ہوتیں شاہ زیب' گڑگڑا کر بھیک مانگ کر' محبت مانگنے میں محبت کی توہین ہوتی ہے۔ یہ کنپٹی پر پستول رکھ کر کسی سے کاغذ سائن کرانے ایسی نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ یقین وہ مان ہوتی ہے جو بنا بولے بنا پوچھے رکھی جاتی ہے۔ ایک ایسا بھرم جس میں گڑگڑانے کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔'' مشال کا لہجہ بار بار بھیگ جاتا۔

''پھر بھی اس طرح مت جاؤ مشال! آج کا دن رک جاؤ۔ کل چلی جانا۔'' شاہ زیب نے اسے نرمی سے مشورہ دیا۔

''رک جاؤ تم کہتے ہو میں رک جاؤں کس کے لیے رکوں میں شاہ زیب وہ شخص...... وہ شخص جو مجھ سے محبت کے وفا کے دعوے کرتا آیا ہے۔ وہ کسی اور کا دولہا بننے جا رہا ہے۔ کسی کے ساتھ نکاح کرنے جا رہا ہے۔ پکے کاغذوں والا نکاح۔ دو گواہوں والا نکاح تم کہتے ہو میں رک جاؤں۔ کیوں رک جاؤں میں اپنی محبت کا تماشا دیکھنے کے لیے۔ اپنی وفا کی پامالی کا منظر دیکھنے کے لیے۔'' مشال بولتے بولتے خود پر ضبط نہ پا سکی اور ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاہ زیب اور ندا اس کے قریب آ گئے۔

''سنبھالو خود کو مشال۔ کیسے ہو گا اس طرح۔'' ندا نے اس کے سلکی بالوں کو سہلایا۔ وہ فوراً سنبھل کر

سیدھی ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ پونچھا اپنا بیگ مکمل کر کے اس کا زپ لگایا اور خود کو سنبھالتی بیگ اٹھا کے کمرے سے باہر آ گئی۔

تیسری منزل سے اتر کے ابھی نیچے آئی ہی تھی کہ کاریڈور نما برآمدے کے ایک کونے میں کھڑا سمعان اسے نظر آ گیا۔ وہ بے وفا اتنا منتشر سا کیوں تھا۔ وہ ہرجائی خود اتنا ٹوٹا ٹوٹا سا کیوں تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب آئی اور اس کے قریب آ کر رک گئی۔

''مبارک ہو سید سمعان شاہ۔ نکاح کرنے اور جیون ساتھی کے پانے کی۔'' سمعان کچھ کہنا چاہتا تھا مگر چپ رہا۔

''اور تو کوئی نہیں بس صرف ایک افسوس رہے گا سمعان کہ میں نے اپنی وفائیں تم جیسے ظالم شخص کو سونپیں اور اپنی خواہشیں تم جیسے سفاک وجود سے منسلک کیں۔'' مشال کے لہجے میں کرب تھا درد تھا یہ کہہ کے وہ رکی نہیں اور تیز تیز قدموں سے کاریڈور پھلانگتی جانے لگی وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔ اسے پکارنا چاہتا تھا لیکن آشنائی تو گویا پل بھر میں اجنبیت کا روپ دھار چکی تھی۔ سمعان کی نظر میں وہ بے وفا تھی لیکن اسے بے وفا کہہ کے چلی گئی تھی۔ وہ سفاک تھی مگر اسے سفاک ٹھہرا کر جا چکی تھی۔ سمعان کے دل سے آواز آئی۔ ''اسے روک لو۔ اس کے سامنے صرف ایک بار صفائی پیش کرو۔ اپنی بے گناہی کی گواہی دو۔ اپنی وفا کا بھرم رکھ کے اسے اپنی مجبوری بتا دو اور پھر اسی کی طرح اس سے بے وفائی کا گلہ کرو۔ اس کے دھوکہ دینے کا شکوہ کرو۔''

وہ اپنے قدم آگے بڑھا لیتا لیکن سیڑھیوں سے اترتے شاہ زیب نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ بھی اپنا بیگ اٹھائے اتر رہا تھا۔ سمعان کو دیکھ کے اس کی طرف آیا۔

''سوری یار سمعان میں شادی اٹینڈ نہیں کر پاؤں گا۔ میں اس وقت مشال کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' یہ کہہ کے شاہ زیب بھی مشال کے تعاقب میں آگے بڑھ گیا اور سمعان سگریٹ کی راکھ جھاڑتا دیر تک کاریڈور میں چلتا رہا۔

*

''تم اس کی شادی میں جاؤ گے شاہ زیب تمہیں جانا پڑے گا۔'' وہ کتنی دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک ہی بولی تھی اور شاہ زیب جو سوچوں کی گہری فضاؤں میں کہیں بھٹک رہا تھا۔ اسے لگا کہ جیسے مشال کی آواز دور کسی گہری کھائی سے آئی ہو۔

''بولو ناں شاہ زیب جاؤ گے ناں اس کی شادی میں۔'' وہ تصدیق چاہتی تھی۔ رات بھر روتے رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

''آج ہی تو تمہارے ساتھ پہنچا ہوں کراچی اور کل پھر اس کی شادی اٹینڈ کرنے چلا جاؤں۔'' شاہ

زیب نے کچھ بولنے کی سعی کی۔

''دوست' دوست کی رٹ لگاتے پھرتے ہو اور دوست کی خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ گے ناں۔'' وہ گویا منتظر تھی۔

''تمہیں اکیلا چھوڑ کے کس طرح چلا جاؤں مشال۔ تم جس ذہنی حالت سے گزر رہی ہو۔ کیا میرا جانا مناسب ہے؟'' شاہ زیب بولا۔

''بہانے مت بناؤ شاہ زیب میں کوئی ننھی بچی نہیں کہ کھلونا ٹوٹ جانے پر رونے بیٹھ جاؤں اور نہ ہی اتنی بہادر لڑکی ہوں کہ زہر کھا کر خودکشی کر لوں۔ مجھے خودکشی سے ڈر لگتا ہے شاہ زیب۔'' اس کی اندر دھنسی آنکھوں میں آنسو چمکے۔

''کل سادات حویلی روشنیوں سے جگمگائے گی۔ سمعان دولہا بن کر نکلے گا اور کرن دلہن کے لباس میں کتنی پیاری لگے گی ناں۔ شرمائی' لجائی' سمعان کے ساتھ پہ نازاں اور پھر...... اور پھر انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو جائے گی۔

تم دیکھنا شاہ زیب کل وہ شادی میں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھیں گے۔ میٹھے میٹھے اشارے کریں گے اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں گے۔'' وہ خود اذیتی کا ذائقہ چکھ رہی تھی۔

''اوہ کم آن مشال' کوئی محبت اس طرح نہیں ہوتی۔ وہ مجبوری کے تحت کرن سے شادی کر رہا ہے۔ محبت وہ تم سے کرتا ہے۔'' شاہ زیب نے اسے ٹوکا' آسمان پر شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اب قدرے دھیمی پڑنے لگی تھی۔

''مجبوری ہونہہ مجبوری پتا نہیں اپنی کزن سے شادی کرنا اس کی مجبوری تھی یا مجھ سے محبت کرنا۔ یونیورسٹی کے سفید پھولوں والی سڑک پر چلتے چلتے مجھ سے وعدے کرنا اس کی مجبوری تھی یا اپنی بی جان کا فرمان ماننا۔ زیب ابھی تو میں خود کو اس کے وعدوں کی سہانی گلیوں سے بھی نہ آزاد کرا پائی تھی۔ ابھی تو میں نے اس کے خوابوں کے بغیر نیند کی بانہوں میں سونا بھی نہ سیکھا تھا۔ ابھی تو...... ابھی تو زیب ابھی تو سب شروع ہوا تھا۔'' وہ بے تحاشا رونے لگی تھی۔

''تم بہت پاگل ہو مشال۔'' اس عجیب لڑکی کی عجیب داستان محبت شاہ زیب کو اداس کیے ہوئے تھی۔

''تم وہ سب چھوڑو تم بس وعدہ کرو کہ تم جاؤ گے اور دیکھو گے کہ سمعان دولہا بن کر خوش تھا یا اس کے چہرے پر کوئی رنج' کوئی ملال' کوئی افسردگی تو تھی ناں یا پھر وہ سب احساس بھول بیٹھا ہے اور اپنی زندگی کے نئے ساتھی کے ساتھ زندگی انجوائے کر رہا ہے مسکرا رہا ہے۔ تم دیکھنا زیب آج صبح سادات حویلی کے برآمدے میں جو شخص منتشر سا کھڑا تھا دیکھنا کہ وہ اپنے وعدوں کا کتنا سچا تھا اور اپنے قول و قرار کا کتنا پکا

تھا۔ تم دیکھنا۔'' مشال کی آواز درد کی ان گنت لذتوں سے مزین تھی اور شاہ زیب اس ان کہے درد کی کیفیت سے خوب آشنا تھا۔

☆

سادات حویلی رنگ برنگے قمقموں سے جھلملا رہی تھی۔ نور ہی نور اور رنگ ہی رنگ تھے۔ اس سال کی اس رت نے اہل حویلی کو دو دو خوشیاں دی تھیں' بڑے عرصے بعد بی جان کے دونوں بیٹوں کے گھر ایک ساتھ بہار اتری تھی' ہوا کا نرم جھونکا جو ہر سو اپنی ٹھنڈک سے آشنا کیے جا رہا تھا۔

حویلی کے وسیع و عریض ہال میں سمعان اور کرن کا نکاح ہونا تھا۔ قریب دور کے سبھی رشتہ دار' دوست موجود تھے۔ ایک طرف فراز شاہ اور نزہت ایک دن کے دولہا دلہن بیٹھے لوگوں سے مبارک بادیں سمیٹ رہے تھے تو دوسری طرف ان کے والدین اپنی اولاد کی فرمانبرداری کا اطمینان اپنے دلوں میں بسائے مسکراہٹیں سمیٹ رہے تھے۔ تبھی سامنے کی سیڑھیوں سے دلہن کی آمد ہونے لگی۔ سب کے ساتھ شاہ زیب کی نگاہیں بھی آپ ہی آپ اس جانب اٹھ گئی تھیں۔

گلابی رنگ کے کامدار غرارے کو اپنے مہندی لگے ہاتھوں سے تھامے' اپنے شفاف چہرے کے ساتھ ساتھ زیوروں کی جگمگاہٹیں دور دور تک بکھیرتی ہوئی وہ کرن تھی۔ کرن شاہ جسے آج تک یونیورسٹی کے احاطے میں سیاہ اسکارف اور عبا میں لپٹا دیکھا تھا۔ کتنا روپ چڑھا تھا اس پر کتنا حسن ٹھہرا تھا اس کے رخ پر۔ اس کے رخساروں کی سرخی سے یہ تو ظاہر نہ تھا کہ یہ رشتہ زبردستی کا ہے یا پھر اس میں کرن کی منشا نہیں۔ کیا تھا یہ سب؟ چہرے سے ٹپکتی ایک روشنی کا جھرمٹ یا جیت کی مسرت سے سرشار خال و خد۔ فتح کا احساس لیے جگمگاتا انگ انگ۔ اپنی جیت کا علم بلند کرنے کے بعد کے احساس۔ یقیناً کرن کے چہرے پر سجا یہ نور اس کا احساس فتح تھا اور پھر اس نے کام بھی تو ایسا کیا تھا شبنم کے قطروں کو سمیٹ کے اس نے ان سے اپنے لیے ایک تاج بنا لیا تھا جسے وہ سجائے بیٹھی تھی۔ مشال کی محبت کی شدتیں بھی کرن کو ہرا نہ پائیں۔ مشال اور سمعان کے بیچ کے وعدے' وفائیں' خواہشیں کچھ بھی اسے شکست نہ دے سکا۔

ابھی محفل کرن کے حسن سے پوری طرح جگمگا بھی نہ سکی تھی کہ سمعان سراپا حسن یوسف بنا آن پہنچا۔ فان کلر کی شیروانی کے اوپر سرخ رنگ کی چادر گلے میں لٹکائے۔ اسے کرن کے برابر جگہ دے دی گئی۔

شاہ زیب نے اسے غور سے دیکھا۔ پہلی بار وہ مسکرا رہا تھا۔ ہولے ہولے سے لیکن یقیناً وہ مسکراہٹ سچی نہ تھی۔ وہ تو ایک کھوکھلا سا خول تھی جو سمعان نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا۔ شاہ زیب نے دل سے اعتراف کیا۔ یقیناً سمعان کو بھی مشال سے محبت ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مشال کی محبت سے ذرا سی کم ہو لیکن اس کا وجود پھر بھی ہے۔ وہ آج بھی وہیں ہے۔ شکست کھانے کے بعد بھی' ہار جانے کملا جانے کے باوجود بھی اس کا موہوم سا وجود تھا۔

نکاح کی رسم شروع ہونے والی تھی۔ قاضی جو کہ شاید خاندان ہی میں سے تھا اپنی نشست سنبھال چکا تھا۔ تبھی شاہ زیب کے سیل پر بپ ہوئی۔ اس نے یس کا بٹن پش کر کے فون سنا۔

''نکاح کی رسم ہو رہی ہے ناں شاہ زیب۔'' دوسری طرف مشال کی آواز تھی۔ شاہ زیب صرف ہوں ہی کہہ پایا۔

''کرن کو سمعان کے ساتھ بٹھا دیا گیا ہے ناں؟ وہ یقیناً ساتھ بیٹھے بہت اچھے لگ رہے ہوں گے۔ کرن نے آج وہ پالیا ہے جو میری قسمت میں نہ تھا۔'' شاہ زیب کان سے فون لگائے اس دیوانی لڑکی کی شدت کو سن رہا تھا لیکن خاموش تھا۔

''شاہ زیب تم سمعان کی آنکھوں میں چھپا کرب کا ایک ہلکا سا احساس دیکھ رہے ہو۔ یہ احساس میں ہوں۔ یہ احساس میری محبت کا ہے زیب۔'' وہ شاید رو رہی تھی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''مشال میں فون رکھ رہا ہوں۔'' شاہ زیب کے گلے میں بھی گولا اٹک رہا تھا۔

''مت رکھو زیب' پلیز مجھے نکاح میں موجود رہنے دو۔ مجھے اس احساس کو جاننے دو کہ اپنی پسندیدہ چیز کو کسی کو سونپنا کیسا ہوتا ہے۔ مجھے یہ درد محسوس کرنے دو۔'' وہ بولی شاہ زیب خاموش ہی رہا۔

نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ کرن سے پوچھا گیا اور اس نے بڑے اطمینان سے ہامی بھر لی۔ پیپرز سائن کیے پھر سمعان سے پوچھا گیا۔

''سید سمعان شاہ ولد سید سکندر علی شاہ کیا آپ نے کرن شاہ کو بہ طور شریک حیات قبول کر لیا۔''

پھر دوہرایا گیا۔ سمعان وہاں ہونے کے باوجود بھی وہاں نہ تھا اور پھر تیسری بار کہنے کے بعد اس نے باآواز بلند قبول کر لیا اور نکاح نامے پر دستخط بھی کیے۔ ہر طرف مبارک باد کا ایک شور اٹھا اور اسی وقت مشال نے فون ڈسکنکٹ کر دیا۔ شاہ زیب یقیناً پریشان ہو گیا تھا۔

وہ سمعان اور کرن کو مبارک باد دے کر کھانا کھانے سے پہلے ہی کراچی کے لیے نکل پڑا لیکن فاصلہ منٹوں پر نہیں گھنٹوں پر محیط تھا اور پھر جب چار گھنٹے کا سفر طے کر کے وہ سیدھا مشال کے ہاسٹل پہنچا تو ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ وارڈن نے اسے اطلاع دی۔

''آج شام ایم اے جناح روڈ پر ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہوا۔ ایک تیز رفتار گاڑی نے سڑک کراس کرتی ہوئی لڑکی کو ٹکر مار دی اور وہ لڑکی مشال احمد تھی۔ اسے اسپتال پہنچا کے یہاں فون کیا گیا۔ اب تک شاید اس کے والدین بھی اسلام آباد سے آچکے ہوں۔''

اور یہ سن کر شاہ زیب دوڑا دوڑا اسپتال کے لیے نکلا۔ اسے یقین تھا کہ وہ گاڑی مشال سے ٹکرائی نہیں بلکہ مشال جان بوجھ کر اس کے آگے آئی ہے اور یہ سب نکاح کے بعد ہی ہوا ہے کہ جب مشال نے اچانک فون بند کر دیا تھا۔

اسپتال میں واقعی مشال کے والد اور اس کی آپا فرزانہ بوا پہلے سے موجود تھے۔ شاہ زیب ان سے ملا اور اپنا تعارف اس کے دوست کی حیثیت سے کروایا۔ ان سے ہی اسے پتا چلا کہ گاڑی والا تو فرار ہو گیا اور مشال کو کچھ لوگوں نے اسپتال پہنچایا اس کے سر میں گہری چوٹ آئی ہے اور ایک ٹانگ میں فریکچر ہے جو کہ میجر ہے اور فوراً اس کا آپریشن کرنا پڑے گا جس کے لیے اس کے والد اسے اچھے اسپتال شفٹ کرا رہے تھے۔

اور اگلے ہی دن اس کا آپریشن ہوا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں اسٹیل کی راڈ ڈالی گئی لیکن پھر بھی ڈاکٹرز نے کوئی خاص امید ظاہر نہ کی تھی اس کے پہلے کی طرح چلنے کی۔ آپریشن بہرحال کامیاب ہوا اور وہ خطرے سے باہر آگئی تھی۔

اگلے دن وہ صبح وزیٹنگ آورز میں اسپتال پہنچا تو کویتا' تجل' ندا اور سعد کو پہلے سے موجود پایا۔ وہ فلورسٹ سے تازہ ٹیوب روز کا بکے بنوا کے لایا تھا۔ ان چاروں کے درمیان بیڈ پر ایک کملایا سا وجود پڑا تھا۔ سر پر سفید پٹی اور اسی پٹی کے ہمرنگ چہرے کا عکس۔ یوں لگتا تھا جیسے اس چہرے سے ساری سرخی نچوڑ دی گئی ہو۔ پہلے سے اندر دھنسی آنکھیں مزید سیاہی کا شکار تھیں۔ ہونٹ پپڑیوں سے بوجھل تھے۔ یہ وہ لڑکی تو نہ لگتی تھی جس کی صرف ایک ادا کسی کو بھی پاگل بنا سکتی تھی۔ یہ تو اس کا سایہ تھی۔ اس مشال کا وہ روپ' وہ حسن وہ معصومیت وہ رکھ رکھاؤ کہیں بھی تو نہ تھا۔

سفاک عشق نے اس پریوں سے وجود کی ساری رمق چھین لی تھی۔ پل بھر کو شاہ زیب کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ آخر وہ بھی تو محبت کرتا تھا مشال سے۔

سمعان کی اور اس کی محبت میں کیا فرق تھا پھر کیا وہ سمعان کی جگہ نہیں لے سکتا؟ کیا مشال اسے اپنا نہیں سکتی؟

وہ اسے دیکھ کے مسکرائی تھی بوسیدہ ہونٹوں پر ایک کرن پھوٹی تھی۔

''تم آگئے۔ تمہاری کمی فیل ہو رہی تھی۔ سبھی تھے۔ ایک تم نہ تھے۔'' نحیف سی آواز ڈھیر ساری اداسی کے ہمراہ نکلی۔ وہ چپ ہی رہا۔ خفا تھا اس سے کتنے گلے کتنے شکوے تھے اس کے دل میں' مگر وہ چپ چاپ سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا اور پھول اس نے ٹیبل پر سجا دیئے۔

کچھ ہی دیر بعد سبھی رخصت ہونے لگے اور کمرے میں صرف وہی رہ گیا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا مشال کیوں؟'' وہ الفاظ ترتیب دینے کی ناممکن کوشش میں تھا۔

''میں نے کیا کیا ہے زیب کیا تو اس نے ہے۔ سمعان نے' وعدہ خلافی' فریب' چھل میں نے تو میں نے..... تو صرف اپنی سانسوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی سعی کی تھی اور پھر جو وجود سمعان کے لائق نہیں اسے زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔'' اس کی گہری سیاہ آنکھیں چمکیں۔

"کون کہتا ہے کہ تم سمعان کے لائق نہیں۔ ارے پگلی وہ تمہارے لائق نہ تھا۔ جس نے تمہاری وفاؤں کی قدر نہ کی۔ اس کے لیے تم مرنے چلی تھیں۔ کیا فائدہ ملتا اس سے سمعان کو۔" وہ برس پڑا تھا۔

"تم بھی ناراض ہو مجھ سے ہر کسی کی طرح تم تو میرے چارہ گر، میرے درماں ہوناں زیب، دوست ہوناں میرے، تم تو بے گانہ نہ بنو۔" اس کی آس سے بھری وہ آنکھیں شاہ زیب کو پگھلانے لگیں۔ شاہ زیب کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"مت کرو ایسا مشال، مت ہرٹ کرو خود کو اتنا۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے تمہیں اس حال میں دیکھ کر۔ مت سزا دو خود کو اس جرم کی جو تم نے کیا ہی نہیں۔" وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے بولا۔

"کرن دلہن بن کر بہت پیاری لگ رہی تھی ناں۔ اس کا صبیح چہرہ سج کے کتنا نکھر رہا تھا اور اس کے گال کا وہ تل جب سمعان حجلہ عروسی میں اسے دیکھ رہا ہو گا تو اس نے اس تل کی ضرور تعریف کی ہو گی اور پھر اپنی وفائیں اس کے نام کی ہوں گی۔ اپنا نام اسے سونپا ہو گا۔ خوش تھا ناں وہ کل۔" مشال کی آنکھیں تصور کے کھنڈروں میں بھٹک رہی تھیں۔

"کیوں دیتی ہو اتنی اذیت خود کو۔ کیا ملتا ہے تمہیں مشال جو شخص تمہارا نہیں ہو سکا اس کے لیے اللہ کی پوری کائنات کو آگ لگا دو گی کیا؟ زندگی کے نئے زاویئے، نئے راستے تلاش کرو۔ دنیا کو دکھا دو کہ تم کمزور نہیں ہو۔ لڑ سکتی ہو زمانے سے۔ زمانے کی آندھیوں سے۔" شاہ زیب کا لہجہ دوستانہ تھا۔

"کس کس کو ڈھارس دوں زیب، زمانے کو یا خود کو۔ کہاں تک بہلاؤں اپنے دل کو۔ میرا دل کوئی بچہ تو نہیں جو کھلونوں سے سنبھل جائے۔ میں اتنی بہادر نہیں زیب، میں بہت عام سی لڑکی ہوں۔ مجھے قدم قدم پر سہارے کی ضرورت ہے اور دیکھو ناں اب تو میں بغیر سہارے کے چل بھی نہیں سکتی۔" وہ طنز سے مسکرائی تھی اور شاید یہی لمحہ تھا شاہ زیب کی بھٹکتی محبت کے اقرار کا۔

"تمہیں میں سہارا دوں گا مشال تمہیں میں خاص بناؤں گا۔" وہ بہت سچائی سے بولا تھا۔ "شادی کر لو مجھ سے مشال۔" کچھ دیر مشال خاموش رہی۔ پھر اک آہ بھر کے بولی۔

"تم سے بے وفائی کروں میں زیب جھوٹ بولتی رہوں تا عمر تم سے۔ جس طرح سمعان بولے گا کرن سے تا عمر دل کوئی سرائے تو نہیں ہوتی۔ جب جو مسافر آیا ٹھہر گیا دل تو اک گھر ہوتا ہے۔ اک آشیاں، مکیں بدلنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔" اس کے اس صاف انکار سے شاہ زیب کو ٹھیس ہی پہنچی تھی۔ وہ کچھ دیر مزید ٹھہر کے وہاں سے چلا آیا۔ دل میں یہ پکا عہد کر کے کہ وہ مشال سے محبت کی بھیک کبھی نہیں مانگے گا۔ کبھی بھی نہیں۔

✱

اور پھر اک دن شاہ زیب کو ایک کال موصول ہوئی۔

"زیب! میں جا رہی ہوں۔ یہ شہر چھوڑ کے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔" وہ مشال تھی۔

"کیا..... کیا مطلب ہے تمہارا۔ کہاں جا رہی ہو تم؟" وہ حیران ہی تو ہوا تھا۔

"میں پاپا کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہوں اور یہ بات صرف ندا اور تمہیں ہی معلوم ہو گی اور تم دونوں کسی کو بھی نہیں بتاؤ گے۔" وہ سختی سے کہنے لگی۔

"لیکن مشال اس طرح اچانک سب کچھ ادھورا چھوڑ کے، تم کم از کم اپنا آنرز تو پورا کر لو۔" شاہ زیب اسے روکنا چاہتا تھا۔

"جب باقی ساری چیزیں ادھوری رہ گئی ہیں تو تعلیم کو مکمل کر کے کیا کروں گی اور ویسے بھی اب مجھے پڑھی لکھی عورتوں سے نفرت ہونے لگی ہے۔ کم بخت بلا کی جھوٹی ہوتی ہیں۔" وہ شاید ہنسی تھی۔ وہ کتنی دیر خلا میں دیکھتا اس دیوانی لڑکی کے کرب کو محسوس کرتا رہا۔

"مت جاؤ مشال پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"میں رک کے کروں گی بھی کیا زیب، سمعان اور کرن کے بندھن کو محسوس کر کے ہی جینے کی آس ختم ہو گئی ہے تو کیا ان دونوں کو ایک ساتھ آتے جاتے، ہنستے بولتے دیکھوں گی تو جی سکوں گی۔"

"کیا تم سمعان کو بھلا نہیں سکتیں، مشال؟" ایک امید پھر بے دار ہوئی تھی اور لائن کی دوسری طرف مشال نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"اسی لیے تو جا رہی ہوں۔ شاید میری زندگی میں کوئی ایسا لمحہ آ جائے کہ جو سمعان کے ساتھ کا متلاشی نہ ہو۔" وہ منتشر سی بولی تھی۔ یقیناً اس کی آنکھ سے شفاف لڑیاں گری ہوں گی۔

"ندا کے پاس پاپا کے گھر کا ایڈریس ہے۔ مجھے خط لکھتے رہنا اور مجھے بھلانا نہیں۔ اگر غلطی سے کبھی سمعان پوچھ بھی لے تو اسے مت بتانا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔" اس شدت پسند لڑکی کے اندر کے احساس شاہ زیب کے دل کو لرزا رہے تھے۔ اس کی آواز، اس کے احساس اور وہ اچانک ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ شاہ زیب کی آنکھ کے کونے اس کے لیے ایک بار پھر سے نم ہو گئے تھے اور پھر بچھڑنے کا لمحہ تو یوں بھی اذیت ناک ہوتا ہے اور بچھڑنا بھی وہ کہ جس میں پھر ملنے کی کوئی امید ہی نہ ہو۔

✱

مشال نے اس شہر سے ناتا تو توڑ دیا لیکن وہ اپنے پاپا کے ہمراہ اسلام آباد نہیں آئی بلکہ اپنی آپا کے ساتھ مری کے اسی گھر میں آ گئی جہاں سمعان اور اس کی ماما کی اچھی یادیں بسی تھیں اور اسے یہاں آئے چار سال ہو گئے تھے۔ ایک انجانی سی قید تنہائی میں جیتے ہوئے چار برس گزر چکی تھی وہ۔ مہینے میں ایک دو بار جب بھی اس کے پاپا آتے تو اس کے لیے آئے ہوئے خط لاتے۔ ندا اور شاہ زیب کے خط۔ ندا کے خطوط میں اس کے لیے فکر مندی ہوتی۔

اور شاہ زیب کے خط انتظار میں ڈوبے ہوتے۔ انتظار اس کے لوٹ آنے کا۔ اس کے کسی خط کے جواب آنے کا۔

وہ ندا کے خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیتی تھی لیکن اس نے شاہ زیب کو آج تک کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اس کے انتظار کو کسی امید کا ساتھ نہ بخشا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ہر ماہ خط لکھتا تھا۔ بلاناغہ ایمانداری سے۔ مان سے۔

ان چار برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔ ندا اور عمر کی شادی ہو چکی تھی اور ایک بیٹا بھی تھا۔ سعد ہائر اسٹڈیز کے لیے آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ نجل نے بھی شادی کر لی تھی اور کرن اور سمعان حویلی شفٹ ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق شاہ زیب کے کسی خط میں کوئی بات نہ تھی۔ شاید وہ جان بوجھ کے ایسا کرتا تھا۔ مشال کے دل کی حالت اب بہت حد تک بدل چکی تھی۔ سمعان کی بے وفائی کا غم اب کم تھا لیکن اب تنہائی اس کی دوست بن چکی تھی۔

اب اسے لوگوں سے خوف آتا تھا۔ لوگوں کے وجود' باتیں' اس کو انجان لگتی تھیں۔ اب اس کی زندگی کا محور صرف فرزانہ بوا' یادیں اور ندا' شاہ زیب کے خط تھے اور کچھ نہیں۔

*

''مشال بیٹی! یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ آؤ آ کے میرے ساتھ بیٹھو سارا دن اکیلے بیٹھے بیٹھے بور نہیں ہوتی ہو'' اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس اسے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر فرزانہ بوا نے ٹوکا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح مسکرائی تھی۔ وہ اٹھی اور باہر لاؤنج میں آ گئی۔ فرزانہ بوا چھوٹی سی ٹیرس میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔ اس نے اپنی بانہیں پیچھے سے بوا کے گلے میں ڈال دیں۔

''میری پیاری بوا'' وہ پیار سے بولی تھی۔

''کہنا مجھے یہ تھا کہ کل تمہارے ابا کا فون آیا تھا کہہ رہے تھے تمہارے لیے کوئی رشتہ آیا ہے اور لڑکا ہے بھی ہر طرح سے لائق۔ ان کے کسی جاننے والا کا لڑکا ہے اگر تم کہو تو ہاں کر دیں۔''

فرزانہ بوا نے بے حد صاف اور واضح انداز میں کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔

''لگ گئی ناں تمہیں چپ! ارے کب تک یونہی بیٹھی رہو گی۔ بنا سہارے بنا آسرے کے۔ صبح کو شام کا اور شام کو صبح کا انتظار کرتی ہوئی۔ اب میرے بوڑھے کندھے کب تک تجھے سنبھالیں گے۔ مان لے ہماری بات۔'' بوا خفا ہی تو ہوئی تھیں۔

''مان لوں گی آپ کی کہی ہر بات مان لوں گی سوائے اس کے۔'' وہ منہ بسور کے بولی۔

''ہمیں سوائے اس کے تجھ سے کوئی بات منوانی بھی نہیں ہے۔ مشال بیٹی اگر کوئی لڑکا تجھے پسند ہے تو بتا دے۔ ہمیں کوئی انکار نہیں ہوگا۔ جو بات بھی تیرے دل میں ہے کہہ دے بیٹی۔ کہنے سے دلوں کے بوجھ چھٹ جاتے ہیں۔ یوں اس طرح پچھلے چار برس سے دنیا سے چھپ کے' سب چھوڑ چھاڑ کے بیٹھی

ہو۔ نہ کوئی تمہارا دوست ہے اور نہ کوئی ہمراز۔ اتنی تنہائی سے تو خود موت بھی گھبرا جائے۔'' بوا کی باتوں میں اس کے لیے صرف فکر مندی تھی۔

''میں دنیا سے چھپ کے اس لیے بیٹھی ہوں بوا کہ صرف یہ تنہائی ہی ایسی ہے جو میرا مذاق نہیں اڑائے گی ورنہ ایک اپاہج انسان کا دوست کون ہوتا ہے۔ کون کرے گا مجھ سے شادی بوا۔ ایک لنگڑی' بے بس لڑکی کے وجود کو تاعمر گھسیٹنے کی خواہش کون سا نارمل شخص کرے گا۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ مردوں کو اپنے لیے بیویاں نہیں کٹھ پتلیاں چاہیے ہوتی ہیں۔ ان کے آگے دوڑتی بھاگتی۔ ان کے کام کرتی ہوئی' بوا میرے پاس وہ کچھ نہیں جو کسی بھی لڑکے کی خواہش ہو سکے۔'' وہ بڑی نرمی سے بوا کو سمجھانے لگی۔

''لیکن مشال بیٹی زندگی کس طرح گزرے گی۔'' بوا کی سوچ ابھی بھی اسی محور پر تھی۔

''گزر جائے گی بوا زندگی گزرنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ پلک جھپکنے کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ کب سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے اور پھر ہم جتنے کم لوگوں کو جانیں گے' سمجھیں گے اتنا ہی کم درد اٹھائیں گے۔'' وہ کہتے کہتے کھوسی گئی تھی۔

''اچھا بوا میں ذرا بک شاپ پر ہو آتی ہوں مال روڈ پر۔ اس سے میں نے ایک کتاب منگوائی تھی۔ وہ لے آؤں۔'' وہ بات ٹالتی ہوئی اٹھنے لگی۔

''پھر اس دن کی طرح شام کر کے آنا جب میں انتظار میں پاگل ہونے لگوں۔'' بوا ناراض سی بولیں۔

''ارے آج تو آپ آلو مٹر پکا رہی ہیں۔ ابھی سے بھوک لگ رہی ہے لیکن آنے جانے میں کچھ وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔'' وہ مسکرا کے بولی تھی اور بوا اس کی باتوں پر ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی تھیں۔

وہ کوئی بیس منٹ کے بعد بک شاپ پر پہنچ گئی تھی۔ وادی میں ٹھنڈی ٹھنڈی شام کے سائے اتر رہے تھے۔ راستے میں اسے کئی ٹورسٹ ہنی مون کپل ایک دوسرے کے ساتھ بے فکری سے قہقہے لگاتے' گنگناتے نظر آئے تھے اور وہ ان کی زندگیوں پر رشک کرتی ہی رہ گئی تھی۔

''میں نے آپ سے فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا لانے کو کہا تھا۔ منگوالی آپ نے؟'' وہ دکاندار سے بولی۔

''جی میڈم! آپ کی مطلوبہ کتاب میں نے منگوالی ہے لیکن ابھی جو وہ کسٹمر آئے ہیں تو انہوں نے اٹھالی ہے۔ میں ابھی ان سے کہتا ہوں کہ وہ کوئی اور کتاب خرید لیں۔'' دکاندار نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ مشال نے اس طرف دیکھا تو ایک لمبا چوڑا مرد' آف وائٹ اور میرون رنگ کے سوئیٹر میں ملبوس دوسری طرف چہرہ کیے ریک پر سے کتابیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا قد' اس کا کھڑا ہونے کا انداز سمعان سے کتنا ملتا جلتا تھا۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ مشال نے منہ پھیر لیا اور دکان کے شیشے کے باہر چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اسے عقب سے دکاندار نے پکارا۔

"میڈم! یہ صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ دکاندار کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا۔ وہ سمعان تھا۔ سید سمعان شاہ۔ وہی چہرہ' وہی خال وخد' وہی وجاہت اور وہی چھب۔

پل بھر کو مشال کی دھڑکنوں کا نظام منتشر سا ہوا تھا۔ بیساکھیوں کا توازن اسے بگڑتا سا محسوس ہوا اور سمعان کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔

اس طرح اتنے سالوں بعد اس سے ملنا اسے دیکھنا وہ کیسے یقین کرتا اپنی بصارتوں پر۔ اتنے برسوں تک دل کے اندر کلبلانے والی محبت' اتنی شدت سے غل مچانے والی ادھوری خواہش اس کے سامنے تھی' لیکن اس حال میں۔ سمعان کی آنکھیں اس کے چہرے کے بعد فوراً ہی اس کی بیساکھیوں پر اٹھ گئی تھیں اور ہزاروں سوال دل میں اُمڈ آئے تھے۔

"مم...... مم...... مشال......" وہ خود کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگا اور خاموشی سے ساکت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کتنے عرصے بعد سماعت نے یہ آواز سنی تھی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"کیسی ہو......؟" وہ پھر بولا۔

"میں اچھی ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ اور یہاں کیسے؟" وہ نارمل لگنے کی کوشش کرنے لگی۔

"فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر ہوں۔ پچھلے سال بحرین ٹرانسفر ہوا اور اب یہاں۔ تم یہاں رہتی ہو مشال!" وہ گہری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے مشال......! یہ بیساکھیاں......؟"

"زندگی میں کچھ حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق لاشعور سے بھی نہیں ہوتا۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔

"چلو کسی جگہ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" سمعان نے کتاب کاؤنٹر پر رکھی اور اسے ہمراہ آنے کا کہا اور وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی رہی۔ چلتے چلتے وہ ایک ریسٹورنٹ کے باہر لگے بینچ تک آ گئے۔ درمیان میں خاموشی تھی۔ جھجک تھی مگر پھر بھی آشنائی تھی۔

"تم تو اچانک غائب ہی ہو گئیں۔ نہ کوئی خبر' نہ کوئی ملاقات۔ تم نے تو سب رشتے ہی توڑ دیئے۔" وہ دبی دبی شکایت کر رہا تھا اور وہ اس کے انداز پر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی کہ جس نے سب رشتے توڑے وہی شکایت کر رہا ہے۔

"کرن کیسی ہے؟ کہاں ہے وہ آج کل۔ تمہارے بچے بھی ہوں گے سمعان۔" وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

"ہاں ایک بیٹی ہے۔ اس کا نام کرن نے مشال رکھا ہے۔ تین سال کی ہے۔ جانتی ہو اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ غیر معمولی طور پر تمہاری طرح ہے اور کرن...... وہ بے چاری اپنی زندگی کے بقیہ دن کاٹ رہی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا تھا۔

"کیوں......؟" وہ ٹھٹکی ہی تو تھی۔

"اس کی کڈنی فیل ہو گئی ہے۔ ٹرانسپلانٹ ہو تو سکتا ہے لیکن ابھی تک کسی کی کڈنی اس سے میچ نہیں ہوئی ہے۔" وہ بڑے تاسف سے بولا تھا اور مشال کے دل میں ایک گونج اٹھی تھی کہ خدا ہے کہیں نہ کہیں۔ دیکھنے والا' سمجھنے والا۔ زیادتیوں کے بدلے گن گن کے لینے والا' غرور کو کچل کے رکھ دینے والا' روندنے والا۔

"تم سناؤ اپنے بارے میں' کیسے ہوا تمہارے ساتھ یہ حادثہ اور شاہ زیب کیسا ہے؟ یہیں رہتا ہے وہ بھی تمہارے ساتھ۔ تم دونوں نے یونیورسٹی کیا چھوڑی ہماری تو رونقیں ہی بچھڑ گئیں۔"

"کیا......؟ شاہ زیب نے یونیورسٹی چھوڑ دی تھی؟ کیا اس نے اپنا آنرز بھی مکمل نہیں کیا۔" مشال سراپا حیرت تھی۔

"تمہیں نہیں پتا وہ تو غائب ہی ہو گیا۔ ہم سمجھے تھے کہ تم دونوں نے شادی کر لی ہے اور کہیں سیٹل ہو گئے تھے۔"

"شادی اور ہماری......؟ کیا مطلب ہے سمعان تمہارا؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا مشال......! تم اور شاہ زیب ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ تم دونوں نے شادی......" وہ یہ کہتے ہوئے خود بھی جھجکا تھا۔ وہ تیزی سے بینچ سے اٹھی تھی اور اپنی بیساکھیاں تھامی تھیں۔

"تم نے...... تم نے سمعان کس طرح یہ سوچا کہ میں کسی اور کو بھی پسند کر سکتی ہوں؟ تم نے جن وفاؤں کو ٹھکرایا تھا وہ وفائیں آج بھی زندگی کی راہوں میں بھٹک رہی ہیں۔ چھوڑا تم نے تھا سمعان' میں نے نہیں۔ وعدہ خلافی تم نے کی تھی' میں نے نہیں۔ محبت کے محل توڑ کے نئے آشیانے تم نے جوڑے تھے میں نے نہیں۔" کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئی تھیں۔ "شاہ زیب تو بہت اچھا ہے۔ ہمیشہ ایک دردمند دوست رہا' ایک چارہ گر رہا' تکلیفوں کے وقت ہمیشہ اس کا کندھا آنسوؤں کے لیے موجود تھا اور تم سمعان......! تم نے تو بنا پوچھے' بنا بتائے نئی راہیں اور نئی منزلیں ڈھونڈ لیں اور میں اپنی ہی خواہشوں کے کھنڈروں میں بے چین روح کی طرح بھٹکتی رہ گئی۔ تمہیں تو ساتھی ملا اور مجھے تنہائیاں' مایوسیاں' اندھیرے' اکیلا پن اور میرے پیچھے تم یہ سوچے بیٹھے رہے کہ میں نے شاہ زیب سے محبت کی تھی اس سے شادی کی تھی۔ تف ہے تم پر سمعان......! افسوس ہے تم پر۔" وہ نم آنکھوں سے یہ کہتی ہوئی جانے کے لیے مڑی اور پیچھے کتنی دیر تک ایک پشیمان شخص اسے پکارتا رہ گیا تھا۔

✻

صبح ناشتے کے بعد وہ چائے کا کپ تھامے ٹیرس کی طرف آئی تھی اور دور وادی کے اوپر ٹھہرے بادلوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ آس پاس لگے چیڑ اور دیودار کے پیڑ صدیوں سے اسی طرح ساکت

وجامد تھے جیسے کہ وہ کسی کے منتظر ہوں۔ وہ چائے کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتی کسی گہری سوچ میں گم تھی کہ جب ڈور بیل بجی۔ اس لیے مشال نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور چائے سے لطف اندوز ہوتی رہی' تبھی اسے عقب سے بوا نے پکارا۔

''مشال بیٹی! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' اس نے مڑ کے دیکھا۔ بوا کے پیچھے بلیک جیکٹ میں ملبوس وہ سمعان تھا۔

''انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو میں اندر لے آئی۔'' بوا نے وضاحت کی۔

''آ جائیں سمعان!'' وہ سبز رنگ کی شال درست کرتے ہوئے بولی۔

''جاؤ بیٹا! میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کے بوا چلی گئیں اور سمعان اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کتنا اداس' کتنا منتشر سا لگ رہا تھا' وہ اسے دیکھ کے مشال کو سادات حویلی کے کوریڈور میں کھڑا وہ سمعان یاد آ گیا۔

''تمہیں میرے گھر کا کیسے پتا چلا۔'' مشال نے اس کی چپ کے قفل کو توڑنا چاہا۔

''میں کیسے بھول سکتا ہوں اس پتے کو' اس گھر کو' یہیں سے تو ہماری محبت نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''تمہیں ابھی تک یاد ہیں وہ دن؟'' ذو معنی لہجے میں ہلکے سے طنز کی آمیزش تھی۔

''کبھی کبھی زندگی کے کچھ بیتے دن زندگی کا قیمتی اثاثہ بھی بن جایا کرتے ہیں۔ سچ مشال بہت آزمائشیں دیکھی ہیں تمہارے بعد میں نے۔ وجداب سمجھ میں آئی ہے کہ تمہیں سمجھنے میں غلطی کی میں نے۔ شک' محبت کا دشمن ہوتا ہے۔ بے اعتباری کی گنجائش نہیں ہوتی وفاؤں میں لیکن میں نے وہی کیا اور تمہیں آج تک گناہ گار سمجھتا رہا۔ تمہارے حال سے بے خبر رہا اور تقدیر نے مجھے سزا ہی تو دی۔ شادی کے سال بھر بعد بیٹی کی پیدائش کے بعد پتا چلا کہ کرن دوبارہ ماں نہیں بن سکے گی کیونکہ بیٹی کی پیدائش پر سیزیرین کے وقت اس کی اووریز کسی وجہ سے نکالنی پڑی تھیں۔ ابھی اس غم کو وہ بھلا ہی پائی تھی کہ اس کی کڈنی فیل ہونے کا پتا چلا اور یقین کرو مشال! تبھی سے وہ تمہیں یاد کر کر کے روتی ہے' اپنے گناہ کا اعتراف کرتی ہے' تمہاری صداقتوں کی گواہی دیتی ہے۔ وہ جی تو رہی ہے لیکن پل پل اس کا ضمیر اسے موت دے رہا ہے' اسے احساسِ جرم میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔''

ایک بے بس انسان کا اعتراف مشال کے سب دکھوں کا مداوا بن چکا تھا۔ اس کے اندر چار برس تک پنپنے اور بل کھانے والا غم قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس شخص کو بنا کسی تاثر کے دیکھ رہی تھی جس کی بے وفائی اور عشق کے بوجھ تلے وہ سانسیں لیتی آئی تھی۔ اتنی لمبی مسافت کاٹتی آئی تھی۔ وہ بنا رکے بولے جا رہا تھا۔ اس کے آگے اپنے جرم کا اعتراف کرتا جا رہا تھا۔ وہ مشال کو ہرا کے بھی جیت نہ

پایا تھا اور کرن جس نے ایک معصوم محبت کے کھنڈر پر اپنی جیت کا علم بلند کیا تھا' قدرت نے اتنی جلدی اس سے بدلہ لیا تھا۔ اتنی جلدی اسے اپنے گناہ کا احساس دلا دیا تھا۔

''میں آج تم سے صرف معافی مانگنے آیا ہوں۔ اپنے اور کرن کے گناہوں کی۔ میں نے تمہیں سمجھا نہیں اور کرن نے تمہیں سمجھنے نہیں دیا اور یہی چیز ہم دونوں کی منتشر زندگی کی وجہ بنی۔ پلیز مشال! مجھے معاف کر دو اور پلیز ایک بار زندگی کی جنگ ہارتی کرن سے ملنے چلو۔ یقیناً تم سے مل کے وہ اپنا آدھا احساسِ جرم زائل کر دے گی۔'' وہ الجھے بکھرے لہجے میں مخاطب تھا۔

''میں نے تو کبھی تمہارا برا نہیں چاہا سمعان! تمہاری شادی کے بعد میں نے ہر ہر سانس میں تمہاری اور کرن کی خوشیوں کی دعا کی ہے۔ تم دونوں کے تاعمر ساتھ کی دعا کی ہے۔ میں نے تو کبھی کسی سے شکایت بھی نہ کی۔ تم نے غلط فہمی کی آڑ میں آ کے مجھے ٹھکرا دیا میں چپ رہی۔ تم نے بنا مجھ سے بات کیے اطلاع دیئے فیصلہ کر لیا میں نے کچھ نہیں کہا۔ تم نے نئی دنیا بسا لی میں چپ چاپ تمہاری دنیا سے نکل آئی اور اب جب تم ملے ہو تو اتنے منتشر' اتنے بکھرے الجھے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میری دعاؤں میں قبولیت کا اثر ہی نہ تھا۔ میری ساری دعائیں بے کار گئیں۔ فرش اور عرش کے درمیان اپنے معبود کو تلاشتی ہوئی اور فنا ہوتی ہوئیں۔'' مشال بہت سچائی سے بولی تھی۔ ''میں کرن سے ملنے ضرور چلوں گی سمعان لیکن اس سے پہلے میں کرن کی ٹیسٹ رپورٹس دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے ایک انکل ڈاکٹر ہیں۔ میں ان سے کرن کی بیماری ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔'' مشال کی اس بات نے سمعان کے چہرے پر مسکراہٹ ہی تو دوڑا دی تھی۔

''تم واقعی چلو گی مشال! واقعی......؟ کرن کتنی خوش ہو گی ناں' میں تمہیں کل ہی اس کی ٹیسٹ رپورٹس بھجوا دوں گا مشال!'' وہ بے یقینی سے بولا۔

اور جب وہ جا رہا تھا تو مشال خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس شخص کے اعترافِ جرم نے مشال کے تمام دکھوں کو دھو دیا تھا اور زندگی میں پہلی بار جب مشال نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے جواب ملا کہ سمعان کی محبت کی بیل اب اس کے دل میں مرجھا چکی ہے۔ اب اس پر کوئی پھول' کوئی کانٹا نہیں لہراتا۔ آج وہ پہلی بار کھل کے مسکرا سکتی تھی کہ آج اس کا دل یک طرفہ محبت کے بوجھ سے خالی ہو چکا تھا۔ آج وہ عرصے بعد ایک الگ مشال تھی۔

*

''کیسے ہو زیب!'' چار برس کے طویل انتظار کے بعد ایئر پیس میں مشال کی آواز گونجی تھی۔ شاہ زیب نے تو خود کو عالمِ خواب ہی میں محسوس کیا تھا۔

''مشال! کہاں ہو......تم کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک ہوں۔ آج تمہاری شدت سے یاد آئی تو تمہیں فون کر لیا۔ اتنے سالوں تک تم نے بنا میرے کسی جواب کے مجھے خط لکھے' مجھے اپنے رابطے کے نمبرز دیئے اور میں نے تمہارے کسی رابطے کا

جواب نہ دیا لیکن اب مجھے تمہاری ضرورت ہے زیب! مجھے اپنے سب سے اچھے دوست اور چارہ گر کی شدت سے ضرورت ہے۔

میں نے ایک فیصلہ کیا ہے زیب اور مجھے اس فیصلے کی تکمیل کے لیے تمہاری ضرورت ہے۔'' وہ بہت مان سے بولی تھی۔

''کہاں ہو تم میں پہنچتا ہوں۔'' وہ مسکرا دیا تھا۔

''مری میں ہوں۔ چار برس سے اسی گھر میں جہاں ہم سب پکنک پر آئے تھے آؤ گے ناں زیب!''

''ضرور آؤں گا...... بلکہ میں کل ہی پہنچتا ہوں۔'' وہ جتنے پیار سے بولا تھا۔ اتنا ہی مشال کے دل میں اس کے لیے فخر جاگا تھا۔

اگلے دن اپنے قول کے مطابق وہ اپنے مختصر سے زادِ راہ کے ہمراہ موجود تھا۔

اتنے سالوں بعد اس نے اسے سامنے دیکھا تھا۔ پہلے سے زیادہ دبلا اور لمبا لگ رہا تھا۔ چہرے پر سجی مسکراہٹ اور اس مسکراہٹ کی اپنائیت بھی پہلے جیسی تھی۔

اور مشال وہ شاہ زیب کو بارش میں دھلے اس پودے کی طرح لگی جو دھلنے سے قبل مرجھانے والا ہو لیکن بوندوں نے اس کے انگ انگ میں اِک رمق دوڑا دی ہو۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے' کیونکہ تم ہی تو وہ ہو جس نے میرا ہر درد' ہر دکھ میں ساتھ دیا ہے اور جب میں تنہائی کی چادر اوڑھ کے دنیا سے چھپ کے بھی بیٹھی تو تم نے اپنی تحریروں کے ذریعے مجھے ڈھونڈا اور میرا سراغ لگانے کی سعی کی۔'' مشال کی آنکھوں میں چھپی خوشی شاہ زیب کو سرشار کر رہی تھی۔

''تم بلاؤ اور میں نہ آؤں' ایسا ہو سکتا ہے؟ دوستی کا پتا تو وہیں سے چلتا ہے جب دوست کو کوئی ضرورت آن پڑے۔'' اس نے اپنا بیگ بیڈ پر گرا دیا اور ایزی ہو کے بیٹھا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے خود ہی بات کی شروعات کی۔

''اب بتاؤ ایسا کیا فیصلہ کیا ہے تم نے جو تمہیں میری ضرورت پڑی؟''

''سمعان سے ملی تھی میں۔'' اس نے بات شروع کی۔ شاہ زیب کے دل میں ایک چھناکا ہوا۔

''فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ میں آفیسر ہے۔ یہاں پوسٹنگ کے سلسلے میں آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ کرن کی کڈنی فیل ہو گئی ہے اور کسی کی کڈنی ابھی تک میچ نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کرن کی رپورٹس لے کے اپنے ٹیسٹ کرائے ہیں اور جانتے ہو زیب! حیرت انگیز طور پر میری کڈنی اس سے میچ ہو گئی ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے زیب کہ میں اپنی کڈنی کرن کو دے کے اس کی زندگی بچاؤں گی۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا مشال! پاگل ہو گئی ہو تم! اپنی کڈنی دے دو گی کرن کو؟ اس کرن کو جس نے تمہاری محبت تم سے چھینی' تمہیں تمہاری تعلیم' تمہاری زندگی سے محروم کیا۔ دوستی کی آڑ میں تم سے دشمنی کی۔'' شاہ زیب چلایا۔

''اس نے جو بھی کیا اس کی سزا وہ بھگت چکی ہے زیب اور پھر معاف تو ربِ تعالیٰ کی ذات بھی کر دیتی ہے۔ زیب ہم تو صرف انسان ہیں' ہم کم ظرف ہوں گے تو اللہ کس مخلوق پر فخر کرے گا۔'' وہ شاہ زیب کو دھیمے انداز میں سمجھانے لگی۔

''لیکن مشال......!''

''زیب مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے۔ مجھے کمزور نہیں پڑنے دو گے۔'' اس کے کہنے پر زیب چپ ہی تو ہو گیا تھا۔

اور پھر اس کے اس فیصلے سے اختلاف سبھی نے کیا تھا۔ پاپا' فرزانہ بوا' لیکن اس کی ایک ہی رٹ کہ وہ ایک گردے پر زندہ رہ سکتی ہے اور اگر اس کا ایک گردہ کسی مرتی ہوئی زندگی کو بچا سکتا ہے تو اس میں غلط ہی کیا ہے اور زندگی بھی اس کی جسے اس نے کبھی دوست کہا تھا۔ تلخیاں اپنی جگہ' فاصلے اپنی جگہ لیکن دوستی تو پھر دوستی ہوتی ہے ناں۔

☆

وہ شاہ زیب کے ہمراہ حیدر آباد پہنچ چکی تھی۔ وہیں سمعان' کرن کو ہمراہ لے کر پہنچا تھا جہاں پر کڈنی ٹرانسپلانٹ ہونا تھا۔ مشال نے سمعان کو قسم دے کر منع کر رکھا تھا کہ وہ کرن کو ابھی اس کے متعلق کچھ نہ بتائے کہ اسے کڈنی دینے والی مشال ہی ہے۔

وہ سادات حویلی کے احاطے میں ایک بار پھر قدم رکھ چکی تھی جو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ سادات حویلی کے سنگ دل حصاروں نے ایک بار پھر اس کے لیے اپنے در کھول دیئے تھے۔

سیڑھیاں عبور کر کے وہ اس کمرے میں جب داخل ہوئی تو کمرے میں سمعان اور کرن کو پایا۔ کرن بیڈ پر دراز لمبی لمبی سانسیں بھر رہی تھی۔ ایک پل کو تو مشال اسے پہچان ہی نہ پائی۔ کہاں وہ شفاف رنگت' مغرور تیکھے نین نقش والی' سارے جہاں کو اپنے پاؤں تلے روندنے والی لڑکی اور کہاں یہ سیاہ رنگت' مرجھائے نین نقش' پپڑیوں والے سیاہ ہونٹ' اندر دھنسی کمزور آنکھیں۔

مشال کو دیکھتے ہی کرن کی ان بیمار آنکھوں میں کچھ اشک چمکے۔ اس نے اٹھنے کی سعی کی۔ مشال اس کے قریب آئی۔ اس کے بیڈ پر بیٹھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

دل کی دھڑکنوں میں ایک شور اٹھا۔ پرانے غم پھر سے بل کھانے لگے۔ کرن دل کھول کے اس کے شانے پر آنسو بہانے لگی۔ اپنی ندامتوں کو اس کے آگے چھلکانے لگی اور وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈالے اسے ڈھارس دینے لگی' اسے چپ کرانے لگی۔ دوستی سے بھرے نرم ہاتھ اس کے وجود پر سایہ کرنے لگے۔

''میں تمہاری گناہ گار ہوں مشال! میں نے تم سے تمہاری محبت چھینی ہے۔ تمہاری وفاؤں کو پامالی دی ہے۔'' روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"نہیں مشال! تم مجھ سے گلہ کرو، شکوہ کرو، لڑو مجھ سے...... بدلہ لو مجھ سے۔ تمہاری اسی چپ نے عرش کو ہلا ڈالا مشال! تمہاری اسی خاموشی نے مجھ کو سزا دی ہے۔ خدا کے واسطے اس چپ کو توڑو مشال!" کرن نے بے بسی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تم نے جتنی سزا جھیلنی تھی جھیل لی کرن! اب خدا نے تمہارے لیے خوشیاں چنی ہیں جن کی تم حق دار ہو۔ کل انشاء اللہ تمہارا ٹرانسپلانٹ ہوگا۔ تمہیں نئی زندگی ملے گی۔ تم اپنی زندگی کی ہر خوشی کو دیکھو گی اور جب دکھ کی کانٹوں بھری راہوں کے بعد خوشی کی من چاہی منزلیں ملتی ہیں ناں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ کرن...... ! بھول جاؤ پلیز......" مشال کے لفظ محبت میں ڈوبے تھے۔

"پاپا! یہ آنٹی کون ہیں اور ماما انہیں مشال کیوں بلا رہی ہیں؟" مشال کو عقب سے ایک معصوم سی آواز آئی۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ سمعان کی گود میں ایک ننھا سا گول گوتھنا سا وجود تھا۔ پنک فراک میں بالوں کی دو چھوٹی سی پونیاں بنائے۔

"کیونکہ بیٹا ان کا بھی نام مشال ہے...... مشال احمد خان!" سمعان نے اسے سمجھایا۔

"جس طرح میرا نام مشال سمعان شاہ ہے اسی طرح؟" وہ پھر اسی معصومیت سے بولی اور سمعان اور مشال دونوں کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔

"یہ میری بیٹی ہے مشال! تمہاری ایک جیتی جاگتی یاد جسے دیکھ کے پل پل مجھے تم یاد آئیں۔ اس نے تمہیں کبھی فراموش ہونے نہیں دیا۔" کرن نے ننھی مشال کو اپنے پاس بلا کے کہا اور مشال نے اسے پکڑ کے اپنی بانہوں میں تھام لیا۔

"آنٹی! آپ بھی مشال ہیں اور میں بھی......" وہ بہت پیار سے مسکرائی تھی

اگلے دن ٹرانسپلانٹیشن کا آپریشن تھا۔ پہلے مشال کو او ٹی میں لے جایا گیا۔ او ٹی کے باہر شاہ زیب فکرمند اور دعاگو کھڑا تھا۔ محبتوں کے امتحان کے لمحے بھی ہوتے ہیں کہ جب محبوب کے بچھڑ جانے کے خدشے اور مل جانے کی امیدیں ساتھ ساتھ ہوں۔ ڈھائی گھنٹے کے بعد ڈاکٹر او ٹی سے باہر آیا اور آپریشن کامیاب ہونے کی خوش خبری انہیں سنائی۔ مشال کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا۔

اگلے ہی دن کرن کا آپریشن کرنا تھا اور کڈنی لگانی تھی، تب تک مشال ہوش میں آ چکی تھی اور کرن کے لیے دعا گو بھی تھی۔

کرن کی باڈی نے بھی مشال کی کڈنی ایکسیپٹ کر لی تھی اور اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مشال کے جسم کا ایک ضروری پرزہ کرن کی زندگی کا باعث بن گیا تھا۔

اور کرن کو جب ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسے زندگی بخشنے والی مشال ہے تو وہ اپنی آنکھوں پر بند باندھ نہ سکی۔ احساسِ تشکر اور پشیمانی تلے اور دبی جاتی تھی۔

"معاف کرنا ہی تمہارا بہت بڑا احسان تھا۔ اس نئے احسان کے بدلے میں تمہیں کیا دوں مشال!" وہ نم آنکھوں سے بولی تھی۔

"اپنی زندگی بھر کی دوستی اور ڈھیر ساری دعائیں۔" مشال نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھاما۔

"میری ایک بات مانو گی مشال! تم سمعان سے شادی کر لو۔ سچ مانو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" کرن نے محبت سے کہا اور سمعان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ کونے میں کھڑے شاہ زیب کے دل کی دھڑکنوں میں اتھل پتھل ہونے لگی۔

"نہیں کرن! سمعان تمہارا نصیب تھا اور تمہارا ہی رہے گا۔ میں اپنی تقدیر چمکانے کے لیے کسی کے مقدر کا ستارہ چھین تو نہیں سکتی ناں۔ میں چلتی ہوں۔ زندگی نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کے وہ کرسی سے اٹھی۔ اپنی بیساکھیاں تھامیں اور جانے لگی۔

"مشال! رک جاؤ مشال! ایک بار پھر میری زندگی سے مت جاؤ مشال! کرن کی بات مان لو۔ مجھے اپنی غلطیوں کی تلافی کا صرف ایک موقع دو، میری بن جاؤ مشال! میری بن جاؤ۔" سمعان نے کہا۔ مشال کی آنکھیں پل بھر کو نم ہوئیں۔

"سمعان اگر یہ بات تم مجھے تب روک کے کہتے جب میں جا رہی تھی ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے تو شاید میں پلٹ آتی۔ دنیا بھر کو ٹھکرا کے تمہارے سائے سے لپٹ جاتی لیکن اب...... اب یہ باتیں میرے لیے نہیں ہیں سمعان! اب تمہاری محبت میرے لیے نہیں ہے۔ تمہاری زندگی میرے لیے نہیں ہے۔ اب تمہاری زندگی میں تمہاری کرن اور تمہاری مشال ہیں ان دونوں کو اپنی محبتیں دو سمعان۔ ان دونوں سے اپنی خواہشیں منسلک کرو۔ مجھے تنہا رہنے کی عادت ہو گئی ہے اور پھر دل کوئی پتھر تو نہیں ہوتا کہ جس پر کھینچی لکیر دوبارہ کبھی مٹ نہ سکے۔ عشق کا مزاج بڑا آوارہ ہوتا ہے۔ سمعان! یہ کسی کے بہلانے سے نہ بہلتا ہے اور نہ بلانے سے پلٹتا ہے۔ یہ تو بنا بلائے، بنا کہے ہوتا ہے اور پھر دلوں میں بس جاتا ہے۔ مجھے سہاروں کے بغیر زندہ رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کے وہ پلٹی اور اپنی بیساکھیوں کے سہارے جانے لگی۔ سیڑھیوں پر پہنچی ہی تھی کہ لڑکھڑا گئی اور اسے کسی کی بانہوں نے تھام لیا۔ اس نے دیکھا تو وہ شاہ زیب تھا۔

"اگر تمہیں سہاروں کی عادت نہیں ہے مشال تو مجھے تو ہے۔ میں تمہارے سہارے کے بغیر مر جاؤں گا۔ مجھے دوبارہ تنہا مت چھوڑو۔" شاہ زیب کے لہجے میں محبتوں کے دیئے روشن تھے۔

"مجھے بھی تو پل پل تمہاری ضرورت رہی ہے زیب! تم نے مجھے تب بھی چاہا جب میری چاہت کسی اور کی تھی۔ تم نے مجھے تب بھی سنبھالا جب تمہیں سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ تم میرے تب بھی بنے جب میرا بننے والا کوئی نہ تھا۔ مجھے صرف اور صرف تمہارے سہارے ہی کی ضرورت ہے۔" وہ اس کے کندھے پر اپنا وجود گرائے نم آنکھوں سے مخاطب تھی۔

"میں تمہاری ہوں زیب......! میں صرف تمہاری ہوں......"

"مجھے یقین ہے مشال! مجھے اعتبار ہے تم پر۔"

اور پھر اعتبار ہی کی تو کمی تھی مشال کی زندگی میں۔ محبتوں کو بھی تو صرف اعتبار کی بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے سہارے وہ تا عمر چل سکیں۔

"اب تمہیں ان بیساکھیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ہر قدم پر تمہارا سہارا بنوں گا مشال۔ چلو......" وہ اس کے دونوں ہاتھوں سے بیساکھیاں لے کر اسے اپنے ہاتھوں سے تھامے اس کے ہم قدم چلنے لگا۔

اسپتال کے کوریڈور میں کھڑا اسمعان شاہ آوارہ مزاج عشق کی اس عجیب تکمیل کو دیکھتا رہا۔ آنکھوں سے شاہ زیب اور مشال کے تا عمر ساتھ کی دعا کرنے لگا۔

عشق آوارہ مزاج، وہ مسافر تو گیا
نہ کوئی اس کی مہک ہے کہ جو دے اس کا پتا
نہ کوئی نقشِ کفِ پا
نہ کوئی اس کا نشاں
کوئی تلخی بھی تہِ جام نہ چھوڑی اس نے
ایک دکھتا ہوا دل
چوٹ تھی جس پہ لگی
چوٹ ویسی تو نہیں
درد باقی تو نہیں
لاکھ مانے نہ مگر
کچھ پشیمان سا دل
یوں بدل جانے پر
آپ حیران سا دل
اس کو کیا اپنا پتا
یہ ہے انساں کا دل
کوئی پتھر تو نہیں
جس پہ مٹتی نہیں پڑ جائے جو اک بار لکیر

***